رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴

قیمت سالانہ چھ روپے (عہ)

قیمت ششماہی ۳ روپے فی پرچہ ۱۰؍

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر حکیم احمد شجاع بی اے (علیگ)

ایڈیٹرز

ابوالاثر حفیظ جالندھری　　محمد اسمٰعیل نعیم

جلد ۴ | اشاعت ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۴ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

دریا بہ حباب اندر

(صفحۂ ادارت)

"حسنِ رُخ" کے عنوان سے ایک نظم فروری کے ہزار داستان میں شائع ہوئی ہے۔ جو ثاقب صاحب متوطن پٹنہ کے حسنِ تخیل کا نتیجہ ہے غلطی سے فہرست مضامین میں عنوان نظم کے مقابل سیّد ابو محمد ثاقب کانپوری کا نام درج ہو گیا ہے ہم اس فروگزاشت کیلئے ہر دو اصحاب سے عذر خواہ ہیں۔

"طبقات الشعرا پر ایک نظر" یہ قابلِ قدر مقالہ جناب سیّد محمد علی صاحب عرش مرحوم ملیح آبادی کا رہینِ قلم ہے۔ اور ہمیں مرحوم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک قلمی بیاض سے دستیاب ہوا ہے۔ جس خوبی سے شعرا کے اس تذکرہ پر مرحوم نے تبصرہ فرمایا ہے۔ امید ہے کہ قارئینِ کرام اس سے استفادہ کرینگے۔ اور مرحوم کو دعائے خیر سے یاد فرمائینگے۔

ہزار داستان کے پُرانے کرمفرما مقالہ نگار حضرات سے استدعا ہے کہ اپنے اعجاز ادب سے بزم ہزار داستان کو گرم رکھیں اور خدمتِ ادب کے فریضے کو گلدستۂ طاقِ نسیان نہ بنائیں۔ کیا ہماری صدا صدا بصحرا ثابت ہوگی؟

مخفی نہ رہے کہ جناب عبد السمیع پال صاحب اثر صہبائی بی۔ اے اور جناب اے۔ آر صہبائی جن کے افکار گرانمایہ وقتاً فوقتاً اثر اندوزِ بزم ہزار داستان ہوتے رہتے ہیں۔ بالکل دو الگ شخصیتیں ہیں۔

پچھلی اشاعتوں کا بیشتر حصّہ ڈاک کے سارقوں کی نذر ہو گیا۔ اور رسالہ بہت بڑی تعداد میں دوبارہ سہ بارہ خریداروں تک پہنچایا گیا۔ اگرچہ ہم اپنے دوسرے معاصرین کی طرح اس دستبرد سے بہت تنگ آچکے ہیں۔ مگر اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں دیکھتے۔ کہ صبر اور حوصلہ سے کام لیں۔ اور نقصان کثیر اُٹھا کر خریداروں کی شکایات کی تلافی کرتے رہیں۔ مگر خریدار حضرات کو بھی چاہیئے۔ کہ وقت پر رسالہ نہ پہنچنے کی حالت میں آٹھ دن کے اندر اندر دفتر کو مطلع کر دیا کریں۔ ورنہ عدم تعمیل معاف۔ وہ حضرات جو گزشتہ نمبروں کے لئے اصرار کر رہے ہیں۔ ہمیں معذور خیال کریں۔ کیونکہ دفتر میں وہ رسائل موجود نہیں ہیں۔

ہزار داستان جس مقصدِ وحید کو لیکر منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہوا تھا۔ وہ آجتک اس کے پیش نظر رہا ہے۔ اور ادب کی جو بری بھلی خدمت اس نے انجام دی ہے۔ وہ بھی حامیانِ اُردو سے مخفی نہیں۔ تو کیا وہ اپنے سرپرستوں کی خدمت میں یہ گزارش کرنے کے لئے حق بجانب نہیں؟ کہ اس کی توسیع اشاعت کے لئے کوششِ بلیغ سے کام لیا جائے۔ اگر ہر ایک خریدارِ ہزار داستان ایک ایک مزید خریدار بھی عنایت کرے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔

ابو الاثر حفیظ جالندھری

مدوجزر تہذیب

انسان طبعاً داستانوں اور فسانوں کو پسند کرتا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ خود اس کی داستان اس قدر دلچسپ معنی خیز اور حیرت انگیز ہے۔ کہ تخیل کی آورد اس سے لگا نہیں کھا سکتی۔ بہت کم اشخاص ہیں۔ جنہوں نے کبھی اس مضمون کی طرف توجہ کی ہو۔ کیونکہ ہر زمانے ہر عہد اور ہر دور میں یہی سمجھا جاتا ہے۔ کہ دور حاضرہ ہی ازمنہ قدیم سے زیادہ زریں زیادہ مہذب اور زیادہ متمدن ہے۔ ہم اپنی موجودہ حالت کی بلندی پر کھڑے قرون اولیٰ کی تہذیب اور شائستگی پر مضحکہ آمیز نگاہیں ڈالتے ہیں۔ اور متقدمین کی کوششوں کو ہیچ اور اُن کی لیاقتوں کو پوچ خیال کرتے ہیں۔ لیکن تاریخ اور آثار قدیمہ پر عمیق نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یہ تبختر یہ غرور اور یہ ناز خودستائی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ کیونکہ آثار ماضیہ میں ان جواہر کی چمک پائی جاتی ہے۔ جن کے دیکھنے سے ایک چکاچوند کا عالم پیدا ہو جاتا ہے۔ اور ہم حیران رہ جاتے ہیں۔ کہ جن ایجادوں اور جن اختراعوں کو ہم طرۂ امتیاز بنائے پھرتے تھے۔ وہ محض متقدمین کی پامال چیزیں نکلیں تھوڑے سے غور اور تفحص سے ہم اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ کہ انسان اپنی تخلیق ہی کے دن سے کسی مکمل ترین تہذیب کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اور جب وہ کسی منتہائے کمال پر پہنچتا ہے۔ تو سمندر کے مدوجزر کی طرح اس کی تہذیب اور تمدن بھی رجعت قہقری کی نظر ہو جاتے ہیں۔

اس زمانے کے حالات سے تاریخ نے جس کے واقعات کے انضباط کو اپنے ذمے نہیں لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے وحشیانہ تمدن میں بھی تہذیب کے لئے بیقرار تھا۔ تکالیف۔ حوصلہ شکن نقصانات۔ محیر العقول کرشمے۔ جان لیوا حیوانات۔ ہلاکت خیز طوفانوں کے ہجوم اور ایسے قرب جوار میں جو اس کی بیکسی کو نمایاں کر دیتے تھے۔ اس کی حیثیت ایک طفل نوزائیدہ سے زیادہ نہ تھی۔ اس زمانے سے لیکر جس کے حالات خفا میں پڑے ہیں۔ انسان منزل ترقی پر گامزن رہا ہے۔ اور اس دھیمی اور غیر مسلسل ترقی سے اس نے کئی ہزار بار اپنے آپ کو دنیا وما فیہا کا حاکم بنا لیا۔ اور وہ موجودات عالم کو اپنا غلام اور کارندہ سمجھنے لگا۔ مگر قدم ترقی کے راستے پر نہیں پڑتا تھا۔ بلکہ اس ترقی کیساتھ ساتھ ترقی معکوس بھی جاری رہتی تھی۔ اور تیلی کے بیل کی طرح جہاں سے چلتا تھا وہیں واپس آجاتا تھا۔ اور پھر اپنا سفر وحشی پن کی وادی سے شروع کرنا اس کا شعار ہوتا تھا۔

جب ہم ان حقائق پر غور کرتے ہیں۔ تو ہمارا قانون ہیں باریکیاں پیدا کرنا۔ نئی سے نئی ایجاد نکالنا۔ سائنس کے ذریعے دُنیا کو متحیر کرنا اور تعلیم کو عام کرنا ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ کہ ہماری حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک نقال کی ہے۔ جو محض متقدمین کی نقلیں اتارتا ہے۔ اور اس کے افعال کو جدت اور ندرت سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا بلکہ بہت سی ایسی باتیں ہیں۔ جن کی ہم نقل تک اتارنے سے عاجز ہیں۔

اپنی آنکھوں کے سامنے ذرا برِّ اعظم اطلانطس کا نقشہ جمائیے۔ جو آج صدیاں گزریں، نذرِ فنا ہو چکا ہے اسی برِّ اعظم کے متعلق افلاطون نے حکایات اور دوسرے قابلِ یقین اوراقِ پارینہ سے مجتمع کئے ہوئے حالات کی بنا پر ایک ایسا بیان تحریر کیا ہے۔ جس کے پڑھنے سے اس سرزمین اور اس زمانے کی روش اور بود و باش کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ قوم جو وہاں آباد تھی اعلےٰ درجے کی متمدن قوم تھی۔ جس امر کے شاہد اس کے آئین و قوانین ہیں۔ وہ لوگ خوشحال۔ فارغ البال۔ شائستہ اور قوی الجثہ تھے کیا وہ ملک تعجب خیز نہ تھا۔ جس میں ان باتوں کے علاوہ پرشکوہ عمارات۔ عظیم الشان جہاز۔ وسیع سلسلہ تجارت اور لاتعداد دولت تھی۔ اس ذہن سے اترے ہوئے زمانے میں ایسے حالات کا وجود بادی النظر میں ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ اور بعض افراد اسے ایک عبرت زا افسانے سے زیادہ وقعت نہ دینگے لیکن غور کرو۔ کہ یہ کیسی متحیر کن اور دلکش تصویر ہے۔ کیا اس وقت کسی کو خیال آیا ہوگا۔ کہ یہ ملک یوں آناً فاناً معدوم ہو جائے گا۔ ایک برِّ اعظم جو وسعت میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ہم پلہ تھا۔ اور بلحاظ تہذیب و تمدن اس سے بھی زیادہ۔ ایک رات میں تلاطمِ آب کی نذر ہو جاتا ہے۔ یا کسی بلا خیز طوفان کی وجہ سے سمندر کا لقمہ۔ اور ہمارے پاس اس کی گزشتہ عظمت و جبروت کی نشانی صرف ایک افسانہ رہ جاتا ہے۔ کیا وہ ایک واہمہ یا خواب تھا۔ جو اس گزشتہ زمانے کے اتنے مہیب حیوانات اور ان قوی طاقتوں کی جولانگاہ تھا۔ خوش قسمتی سے معدوم اقوام اور ان کی تہذیب کے حیرت انگیز باقیات کے شواہد کے لئے ہم صرف بے بنیاد افسانوں کے رحم پر ہی نہیں ہیں۔

زمانۂ اولیٰ کی حکمت کے موجد، اس کو معرضِ ظہور میں لانے والے۔ اس کو ترقی دینے والے کون تھے۔ کیا وہ ارشمیدس تھا جس نے اصول لیبرم (لیور) معلوم کیا تھا۔ مگر لیبرم تو اس سے ہزاروں سال پہلے عام طور پر مروج تھا۔ یہی حال تیپچ (سکرو) اور ریاضی کا ہے۔

مصری ان تمام اصولوں اور علوم و فنون کے ماہر تھے اصولِ وزن مخصوص سے بھی وہ کماحقہٗ واقف تھے۔ یہ تمام امور مخروطی میناروں کے بنا کرنے میں برتے جاتے تھے

اور اس امر کا ثبوت ناطق موجود ہے۔ کہ شاندار کارنامہ میں چھاپ سے بھی کام لیا گیا تھا۔ کیا طباعت گٹن برگ کی ایجاد تھی؟ چین میں تو ایک ایسا اخبار موجود ہے جو دو ہزار سال تک باقاعدہ شائع ہوتا رہا۔ کیا دُوربین گلیلیو کی ایجاد تھی؟ دسط امریکہ کے باشندے گلیلیو کی ولادت سے بہت پہلے دُوربین کو جانتے تھے۔ اور نظام شمسی سے بخوبی آشنا تھے۔ یہ لوگ ماہر نجومی تھے۔ اور ان کی ایک نہایت دیرینہ تصویر اس شخص کی جستجو کا حال دکھاتی ہے۔ جو رصدگاہ پر کھڑا مشاہدات نجوم میں مصروف ہے۔ کیا فولاد انیسویں صدی کی اختراع ہے لیکن فولادی اوزار چھ ہزار سال پہلے مصر کے راعی بادشاہوں کے وقت میں زیر استعمال تھے۔ کیا سیر بین گلیلیو کی معلومات کا نتیجہ ہے۔ لیکن نیرو کے پاس ایک ایسا جواہر تھا۔ جس سے وہ ان سرفروش جنگجوؤں کی لڑائی کو ملاحظہ کیا کرتا تھا۔ جو شاہی نشست سے کئی سو میل پر مصروف پیکار ہوتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ ماریشس کے پاس ایک ایسا شیشہ تھا۔ جس سے وہ سسلی کی ایک چٹان پر کھڑا ہو کر ساحل افریقہ کا صاف نظارہ کر سکتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ خوردبین مرکب ۱۵۹۰ء میں جینسن نے ایجاد کی تھی۔ لیکن یہ صرف ایک ایسی ایجاد کا احیا تھا جو سسرو کے وقت میں عالم ظہور میں آ چکی تھی۔ بلکہ اس زبردست مقرر کے وقت سے ہزاروں سال پہلے اچھی طرح سے سمجھی جاتی تھی۔ سسرو کا بیان ہے کہ اس نے الیڈ کو جو ہومر کی ایک زندہ جاوید نظم ہے۔ ایک ایسے چمڑے کے ٹکڑے پر لکھا دیکھا ہے۔ جس کو لپیٹ کر اخروٹ کے ایک چھلکے کے اندر رکھا جا سکتا تھا۔ کیا ایسا کرشمہ خوردبین کی مدد کے بغیر ظہور میں آ سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے۔ کہ اس نظم کا اختصار اتنی محدود جگہ میں فوٹو انگریونگ کے ذریعہ کیا گیا ہو۔ ایسے اختصار اب روزمرہ ہماری نظروں سے گزرتے ہیں خوردبین کے اس سے بھی پہلے مستعمل ہونے کے متعلق اور شواہد موجود ہیں۔ مصر کے ایک نہایت پرانے بادشاہ چی آپس کی انگوٹھی میں ایک نگینہ تھا جس پر نہایت بلند پایہ دستکاری کی گئی تھی۔ لیکن جس کو چشم ظاہر دیکھنے سے عاجز تھی۔ جب اس کو ایک محدب شیشے میں سے دیکھا گیا۔ تو ایک ایسی مکمل دستکاری کا انکشاف ہوا۔ جس کا چربہ اتارنا موجودہ وقت کے چابکدستوں کے لئے محال ہے۔ روم کے ویٹیکن میں اب بھی ہزاروں ایسے جواہرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ جن کے نقوش محدب شیشوں کی مدد کے بغیر آنکھوں سے پنہاں رہتے ہیں۔

وہ حیرت انگیز منقش جواہر جو ولادت مسیح سے صدیوں پہلے عام تھے آج بڑے سے بڑے صناع سے نہیں بن سکتے۔

ویندل فلپس کا بیان ہے۔ کہ اس کے ایک

دوست کی انگوٹھی پر جو قطر میں ۳/۴ انچ ہوگی۔ ہرقل کی برہنہ تصویر تھی۔ محدب شیشیوں کی مدد سے اُبھے ہوئے پٹھوں کی تمیز ہوسکتی تھی۔ اور پلکوں کا ایک ایک بال گنا جاسکتا تھا۔ قیاساً یہ انگوٹھی تین ہزار سال قبل کی صنعت کاری کا نمونہ ہے۔

لیبرڈ اپنی معلومات نینوا کے ضمن میں بیان کرتا ہے کہ پتھروں پر کھدے ہوئے نقوش اس قدر باریک تھے۔ کہ انہیں صرف اچھے طاقتور شیشوں کی مدد سے پڑھا جاسکتا تھا۔

تین ہزار سال کا عرصہ گذرا سلطنت شام نابود ہوچکی ہے۔ اور اتنی بڑی قوم کی ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ کی حالت تاریخ میں ناپید ہے۔ اس کے معدوم ہوجانے کے ایک ہزار سال بعد تک اس کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا یہ اشیائے عالم کے فنا کا کیسا حیرت انگیز مرقع ہے۔ اور یہ حقیقت تہذیب حاضرہ کی خودستائیوں کے لئے کیسا زبردست تازیانہ ہے۔

فولاد کے انکشاف سے بجائے خود تاریخ کا ایک قرن شروع ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ پیشتر بیان کیا جاچکا ہے۔ یہ دریافت صرف ایک دیرینہ اور گم گشتہ فن کا احیا تھی۔ دمشق کی تلواروں کے پھل ایسے اعلیٰ قسم کے فولاد سے بنائے جاتے تھے۔ کہ نوک کو قبضے سے ملایا جاسکتا تھا۔ اور پھل پھر اپنی اصلی حالت پر عود کر آتا تھا۔

سلطان صلاح الدین (محاربات صلیبیہ کا نامور ہیرو) کے پاس ایک ایسی تلوار تھی جو ہوا میں اُڑتے ہوئے نرم نرم پروں کو کاٹ کر دو حصے کر دیتی تھی۔ ہندوستان میں بھی آج سے دو ہزار سال پہلے اسی صنّاعی کی شمشیریں دستیاب ہوسکتی تھیں۔ اب ان کو نہیں بنایا جاسکتا یہ ایک گم گشتہ فن ہے۔

فن مصوری اسقدر پُرانا ہے کہ اسکی تاریخ کا پتہ چلانا ناممکن ہے۔ اس سے بھی عجیب ترامر یہ ہے کہ وہ رنگ[۵۱] جو آج سے تین یا چار ہزار سال پہلے مستعمل تھے اتنے چمکیلے اور دیرپا تھے کہ آج کوئی رنگساز ویسے رنگ نہیں بنا سکتا۔

نہر سویز کی تعمیر نے ڈی لیپس کا نام بہت روشن کیا۔ لیکن یہ شاندار کام ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ جب ہم اسکا مقابلہ ان انہار سے کرتے ہیں۔ جو فراعنہ مصر کے وقت میں بحیرہ روم اور بحیرہ قلزم کو قائم زاویے پر ایک دوسرے سے ملحق کرتی تھیں۔ تاکہ وہ تلاطم سے محفوظ رہیں۔ پیرو کی بڑی بڑی سڑکیں اور ٹنل۔ بولیویا۔ وینزویلا اور وسطی امریکہ کے مندر۔ نہریں۔ پکے کوچے اور خود ساختہ جھیلیں اس محیر العقول صناعی اور علم ریاضیات کے امثال ہیں۔ جن کے مقابلہ کی دورِ حاضرہ کے موجد اور معمار تاب نہیں رکھتے۔

فضل

۵۱ ناظرین پڑھتے وقت طوطن ہامان کے مزار کو یاد رکھیں۔ جو حال ہی میں دریافت ہوا ہے۔

جلوۂ گاہِ خواب

عجیب کیفیتوں سے پر تھا کل آخرِ شب جو خواب دیکھا
یہ مَیں نے دیکھا کہ سمتِ مشرق ہے خوشنما ایک قصرِ زرّیں
مَیں کیا بتاؤں، بصد خموشی ہر اِک ادائے لطیف اُس کی
صباحتیں حسنِ بے محابا پہ ہو رہی ہیں نثار پیہم
ترانۂ بے صدا کی اُس کے سحرطرازی کا ذکر کیا ہو
نہ چھپ سکا نور کی ردا میں جمالِ عالم فروز اس کا

ابھی تک اُس کا اثر ہے باقی وُہی گھڑی یاد آ رہی ہے
اور اِک دوشیزہ حسین عورت وہاں کھڑی مُسکرا رہی ہے
نظر کو مسحور کر رہی ہے، سرور دِل میں بڑھا رہی ہے
ہزار انداز کیف ساماں سے دل کو میرے لُبھا رہی ہے
ہے محو موسیقیت میں اپنی، خموش نغمے سُنا رہی ہے
خزینۂ حسنِ جانستاں کی جہاں میں دولت لُٹا رہی ہے

کھُلی یکایک جو آنکھ میری تو راز مجھ پر کھُلا یہ افسر
کہ یہ دوشیزہ ہے "صبحِ صادق" جو شرق میں مُسکرا رہی ہے

حامد اللہ افسر

رعنائیِ تخیّل

تقدیر ہُوئی یاور، تدبیر کی بن آئی
ہوتی ہی نہیں میرے سجدوں کی پذیرائی
آوارۂ اُلفت کی اللہ رے رسوائی!
تو اپنی تجلّی کا ہے آپ ہی شیدائی؟
آئینہ کی حیرانی، تنویر کی تابانی
وہ حسن جہاں آرا زینت ہے تخیّل کی
تادیب وفا کوشی، تاثیر جنوں کیشی

وہ آئے ہیں خود کرنے اب عذرِ مسیحائی
ناکامیِ پیشانی! تقدیرِ جبیں سائی!!
پہلے وہ تمنّا تھا اب خود ہے تمنّائی
اچھّا رے تماشائی! یہ شانِ خود آرائی!
اِک نظم خود آرائی، اِک نازشِ یکتائی
زیبا ہے خیالوں کو اب نازشِ رعنائی
بربادی سی بربادی! رسوائی سی رسوائی!

وہ اُن کی ستم کیشی، یہ میری وفا کوشی
ہے نازشِ برنائی، ہے شانِ تمنّائی

گھبرا کے چلے آئے وہ شامِ شبِ فرقت
کچھ خوفِ خدا آیا، کچھ یاد مری آئی

ممنونِ محبت تھی آوارگیِ اُلفت
تھی لازمۂ وحشت اک بادیہ پیمائی

صیّاد کا شکوہ کیا، قسمت کا گلہ کیسا
تاثیرِ نوا سنجی پیغامِ قفس لائی

وحشت ہو یوں دل کو، حیرت ہو کیوں مجھ کو
اللہ یہ ویرانہ! تقدیر کہاں لائی!

وہ چاہتے ہیں سُننا رودادِ شبِ فرقت
اے کاش! پلٹ آئے پھر طاقتِ گویائی

نکلی تھی دُعا دل سے، تقدیر کو کیا کہیے
تا عرش پہنچ کر بھی محرومِ اثر آئی

جینے کی توقع میں کرنی تھی وفا کر لی
پردہ میں محبت کے آئی تھی قضا، آئی

وہ جوش نہیں دل میں، وہ کیف نہیں سر میں
اب یادِ خُدا آئی اے رازؔ تو کیا آئی

سیّد رازؔ

مار ڈالا

بتوں نے یا خُدا نے مار ڈالا
محبّت کے بہانے مار ڈالا

مسیحا کو نہ آنا تھا نہ آئے
قضا آئی قضا نے مار ڈالا

رہے ان کے بہانے ہی بہانے
بہانے ہی بہانے مار ڈالا

محبت کو مرض سمجھے ہوئے تھے
طبیبوں کی دوا نے مار ڈالا

ارے یہ ظلم! ارے یہ سرد مہری!!
"زمانے! او زمانے"!! مار ڈالا!!!

بُتوں کا نام کیوں لیتی ہے دُنیا
مجھے میرے خُدا نے مار ڈالا

کہا یہ۔ سُن کے ذکرِ مرگِ دُشمن
کسی کی بد دُعا نے مار ڈالا

ابو الاثر حفیظ

احساسِ آوارگی

(۱)

شام ہی سے آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے
جوں جوں وقت گذرتا گیا بازار کے چراغ ایک ایک کرکے
خاموش ہوتے گئے۔ خوانچے والے۔ تمباکو فروش۔ تنبولی۔
نصف شب تک لہرا لہرا کر " گرما گرم چائے کی صدا لگانے
والے " آج دس بجے ہی اپنے بچے کھچے سودے سمیٹ سمٹا
گھروں کو جا چکے تھے۔ اکا دکا مسافر۔ بہکے ہوئے شرابی
آوارہ مزاج سیلانی تماش بینوں کے گردہ طوفان کی آمد
دیکھ کر اپنے اڈوں کی خیر منا رہے تھے۔

میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ کہ
آج معمول سے پیشتر اپنی ویران کوٹھڑی کی "خیال آفریں"
تنہائی میں چلا جاؤں۔

سرائے جس میں بارہ بجے شب تک خاصی
چہل پہل رہا کرتی تھی۔ آج سنسان نظر آتی تھی۔ مسافروں
کی کوٹھڑیاں بند ہو چکی تھیں۔ بھٹیاریاں اپنی لڑائی دوسرے
دن پر ملتوی کرکے قبل از وقت نیند کے آغوش میں خراٹے
لے رہی تھیں۔ درختوں کی سائیں سائیں اور کتوں کی
چیخ پکار کے سوا کسی جاندار کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

میں اپنی کوٹھڑی کی "ملول تاریکی" میں چپ چاپ
کھڑا تھا۔ باد و باراں کی آمد آمد میری روح پر ایک بار
بن رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ میرا تخیل بھی طوفان کی
چیرہ دستیوں سے پریشان ہو کر آج فضا میں مصروف
نہ ہو سکتا تھا۔ اور تنگ و تاریک کوٹھڑی اور میرے مضمحل
دماغ میں محدود رہنے پر مجبور تھا۔ میرے روئیں روئیں
پر افسردگی ایک بوجھ کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ میرے سینے
سے ایک "لرزاں غبار" اٹھنا چاہتا تھا۔ مگر نہ اٹھ سکتا
تھا۔ میں رونا چاہتا تھا۔ مگر میری آنکھوں میں آنسو نہ تھے

میں نے دیا سلائی کی ڈبیہ سے جس میں دن بھر
کی سگرٹ نوشی کی وجہ سے متعدد دیا سلائیاں باقی تھیں
ایک دیا سلائی جلائی اور موم بتی کا ٹکڑا جو چارپائی کے
داہنے پائے پر چسپاں تھا۔ روشن کر دیا۔ اور ایک پھیلتی ہوئی
نگاہ اپنی کوٹھڑی اور اس کے سامان پر ڈالی۔

ایک فرسودہ چارپائی تھی جس پر نامکمل بستر تھا۔
دو کمل ایک تکیہ تھا۔ چند پرانے ادبی رسالے جو کباڑی
کی دکان سے خرید کئے گئے تھے۔ [illegible]
چارپائی کے دونوں طرف سینکڑوں سگرٹوں کے

جلے ہوئے ٹکڑے، سوختہ دیاسلائیاں سگرٹ کے خالی بکس، دو تین ملے دلے کاغذ جن پر میرے تازہ نتائجِ ابیات یعنی وہ اشعار درج تھے جو نیند کو بلانے کے لئے مجھے ہر شب موزوں کرنے پڑتے تھے۔

تنگ کوٹھڑی کی دیواریں چونے گچ کی تھیں۔ ان پر جابجا گرد سے اٹے ہوئے طاقچے۔ دیواروں کا رنگ کبھی پر بیشتر شاید کسی خاص نام سے موسوم ہو سکتا ہو لیکن اب پان کی پیک کے دھبوں، چراغ کے دھوئیں۔ بہے ہوئے تیل۔ اکھڑے ہوئے پلستر نے ملکر ان کی رنگت کو بیشمار رنگوں کا ایک موثر مجموعہ بنا دیا تھا۔

ایک کونے میں میرا سفری ٹین کا لوٹا دھرا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک لکڑی کی کھونٹی پر میری گرم پتلون لٹک رہی تھی۔ جس کا رنگ کثرتِ استعمال سے خاکستری ہو چلا تھا۔ اور جو ایک مہینے سے استری کی گرم جوشی سے محروم تھی۔

کوٹھڑی کا فرش پختہ مگر اکثر جگہ سے اینٹیں اکھڑی ہوئیں جس پر مدت سے جھاڑو نے عنایت نہ فرمائی تھی۔ اور اس لئے خاک کے چھوٹے چھوٹے تودے کوڑا کرکٹ۔ مونگ پھلی کے چھلکے اور دوسری ایسی ہی چیزوں کا فرش ہو رہا تھا۔

(۳)

"ہونہہ" کی ایک گلوگیر صدا میرے سینے سے نکلی۔ جو شرمندہ لب نہ تھی۔ اور میرے چہرے پر زہرخندہ آ گیا۔ میں نے اپنا اوور کوٹ دونوں ہاتھوں سے اتارتے ہوئے اپنے کمرے اور اس کے سامانِ آرائش سے بے توجہی سی اختیار کر لی۔ اور کواڑ بند کر کے لباس کھونٹی کے سپرد کر دیا۔

"فل بوٹ" کو جو صبح سات بجے سے اس وقت تک میری آوارہ گردی کا معاون رہا تھا۔ چند گھنٹوں کے لئے رخصتِ آرام ملی اور میں ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے خول میں گھس گیا۔ "خول" اس لئے کہ پانچ راتوں سے بستر کو تہ کرنے یا از سرِ نو بچھانے کی تکلیف گوارا نہ کی گئی تھی جس طرح صبح کو اس سے رخصت ہوتا رات کو پھر اس میں داخل ہو جاتا۔

موم بتی کی مدھم اور کانپتی ہوئی روشنی میں کمرے کی ہر ایک چیز بھیانک اور اداس نظر آتی تھی۔ میں نے ایک پرانا رسالہ اٹھایا اور روشنی کے رخ کروٹ لے کر لیٹے لیٹے کچھ دیر ورق گردانی کرتا رہا۔ میرا غیر دلچسپ مطالعہ نیند کے غیر معین وقت سے بیشتر کی گھڑیوں کو دلچسپ بنانے کا معمولی حیلہ تھا۔

کوئی عنوان کوئی مضمون ایسا نہ تھا جو لکد کوبی نگاہ سے بچ سکے۔ مگر موم بتی کا ٹکڑا میرے عنوانِ مطالعہ کی تاب نہ لا سکا اور اس کی روشنی اپنی بساط کا آخری سنبھالا لیکر خاموش ہو گئی۔

میری آنکھیں کتاب کے صفحۂ تاریک پر کچھ دیر تک جمی رہیں۔ بالآخر احساسِ ظلمت سے مغلوب ہو کر میں نے تکیہ کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ مگر مجھے یاد آ گیا۔ کہ اکثر بار ارادہ کرنے کے باوجود میں اپنی فطری سہل انگاری کے سبب نئی موم بتیاں خریدنے سے آج بھی قاصر رہا تھا۔

میں نے ایک روکھی ہنسی ہنس کر کتاب کو ہاتھ سے رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ کمبلوں کے اندر کر لئے اور نیند کے دیوتا کو دھوکا دینے کی ناکام کوشش شروع کی۔ "باہر ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔ اور چھپروں کے ٹین کھڑکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میرا دماغ ایک ایسی چکی کی طرح جو آٹا پیسنے کی بجائے دانوں کو جوں کا توں گرا دیتی ہے۔ گردشِ بے سود میں مصروف تھا۔ میرے غیر مسلسل خیالات ایک شکستہ جہاز کے تختوں کی طرح ماضی و حال کے طوفانی سمندروں میں غوطے کھا رہے تھے۔ ایک غیر معلوم خوف ایک موہوم ہراس آہستہ آہستہ میرے قلب کی حرکت کو تیز کر رہا تھا۔

(۲۳)

آج مجھے گھر سے نکلے پورے اکیس دن ہو چکے تھے وہ "گھر" جس میں میں نے اپنی زندگی کے تئیس سال خوشی اور ہر طرح کی بے پروائی میں بسر کئے تھے۔ اب صرف ایک دھندلا سا خیال بنکر باقی تھا۔ سیاہ بادل اسے گھیرے ہوئے تھے۔ اور اس پر حسرت کے آنسو بہا رہے تھے

"میں نے اس کو چھوڑ دیا" یہ الفاظ میرے کانوں میں کوئی آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ میں نے لیٹے لیٹے ایک گہرا سانس لیا۔ اور کوشش کی کہ ماضی کی ناگوار یاد میرے حافظے سے محو ہو جائے۔ مگر ایک متوسط درجے کے مکان میں ایک معمر بزرگ کی مظلوم صورت بیکسانہ انداز سے مجھے گھور رہی تھی۔ اس کے آنسو اس کی سفید داڑھی کو تر کر رہے تھے۔

"آہ میرا باپ" وہ باپ جس نے اپنی زندگی کی تمام آسائش میری ترقی و بہبودی کی امیدوں کے ہاتھ فروخت کر رکھی تھی۔ جس نے مجھ پر بھروسہ کرنے میں پدرانہ شفقت کے ساتھ قدرے سادہ لوحی کا ثبوت دیا تھا۔

اس کی آنکھیں مجھے اس خاموش تاریکی میں ملامت سے گھور رہی تھیں۔ اور کالے کوسوں دور میں اپنی "ماں" کے غمناک چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ عین اسی بے بسی کی حالت میں جس طرح سے میں نے اسے چھوڑا تھا۔

"افسوس ایک خوشباش گھرانا افلاس اور نکبت کی انتہائی پستی میں گرفتار تھا۔"

شاید میرے ہی ہونٹوں سے نکلا "خداوندا! صرف میری وجہ سے"

یہ الفاظ اندھیری کوٹھڑی کی فضائے تاریک میں ایک سکوت افزا تھرتھراہٹ کے ساتھ گونجے "نہیں یہ میرا قصور نہیں۔ میں اس سے بری الذمہ ہوں۔" "دونوں وہی دونوں میرے ماں اور باپ اس کے ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے میری تربیت میں بے پروائی سے کام لیا۔ مجھے کھلے بندوں چھوڑ دیا۔"

میرا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ اس کی آواز ہوا کی چیخوں اور موسلا دھار بارش کے طوفان میں صاف سنائی دے رہی تھی۔

"تربیت میں بے پروائی" مجھے ایسا معلوم ہوا کہ سینے کے پوشیدہ نہانخانے سے کوئی جوان عورت میری اس دلیل کے بودے پن پر مسکرا رہی ہے۔

میرا دل میرے حلق میں اٹک گیا اور میں نے لیٹے لیٹے اپنا سرد اور کانپتا ہوا ہاتھ آنکھوں پر پھیرا۔ گویا میں آنے والے خیال کی ملامت آمیز اذیت سے بچنے کے لئے انتہائی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی روح میں ایک بزدلانہ لرزش محسوس کی۔ "کیا میں اپنی بیوی کے تصور سے بھی تغافل اختیار کرنا چاہتا تھا۔

ایک غمدیدہ بار الم سے دبی ہوئی نازنین کا حسن غمدیدہ میرے روبرو تھا۔ جس کی آنکھیں اس اتھاہ تاریکی میں ایک ادائے مجبورانہ سے میری طرف نگراں تھیں۔ ان میں شکایت کے بجائے معصومیت اور رضا و تسلیم کے جذبات جھلک رہے تھے۔

میں ایک مجرم قیدی کی طرح اپنی بے بس بیوی کی خیالی صورت کے سامنے کانپ گیا۔ "ہاں یہ میری بیوی تھی۔" جس پر انتہائی ظلم ہوا تھا۔ "انتہائی ظلم خدا کی پناہ" ایک گلوگیر صدا بے اختیار میرے منہ سے نکل گئی۔

تین برس پورے تین برس میں نے اس کے صبر کا بہت کڑا امتحان لیا تھا۔"

اس عالم خیال میں مجھے اپنی بیوی کی غمناک آنکھوں سے دو آنسو بہتے نظر آئے۔ میرا دل سینے کے اندر بیٹھ گیا۔ میرے دماغ کے سامنے گزشتہ واقعات متحرک تصاویر کی طرح سے گزرنے لگے۔

(۴)

میں نے دیکھا کہ میں اپنی ذمہ داریوں سے بالکل بے پروا۔ "تعیش" کے ذلیل راستے پر قدم زن ہوں۔ میرے خیالات مجھے پھر "اسی صحبت" میں لے گئے۔ جو میں نے باوجود متاہل ہونے کے اختیار کر رکھی تھی۔ "وہی شوق آزما مکان" جس کا دروازہ اس دولت کے لئے ہمیشہ کھلا تھا۔ جو میں نے اپنے باپ

سے حاصل کی تھی۔" وہی عورت" جس کو مجھ سے زیادہ میری دولت سے عشق تھا مصنوعی بناؤ سنگار کئے میرے لئے چشم براہ تھی۔ اس کے ہاتھوں اس کے کانوں اس کے سینے پر میری "بیوی" کے زیورات چمک رہے تھے۔ وہ زیورات جو میرے باپ نے میری شادی پر قرض لے کر بنوائے تھے۔" آہ"—

مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ میری چارپائی زلزلے سے کانپ رہی ہے۔ کیونکہ میرے سامنے بھی بیوفا عورت ایک دوسرے "دولتمند" مرد" کے لئے بیتاب محبت نظر آرہی تھی۔ اس لئے کہ اب میرے باپ کا کل اثاثہ "میرے ہاتھوں" اس کی بے پناہ خواہش زر کی نذر ہو چکا تھا۔

مَیں سر جھکائے ہارے ہُوئے قمار باز کی طرح اس کے مکان سے نکل رہا تھا۔ میرے قدم اپنے افسردہ گھر کی طرف نہیں۔ جہاں والدین اور بیوی میری "تباہ حال" واپسی کے منتظر تھے۔ بلکہ پردیس اور مسافری کی طرف میری رہنمائی کر رہے تھے۔ میری شرم میرے گھر واپس جانے میں مانع تھی۔

اس مدہوشیٔ خیال کے عالم میں واقعاتِ گزشتہ کی حقیقت بجلی کی طرح میرے تاریک دماغ میں چمکی۔ وہ جانکاہ حقیقت جس نے میرے بوڑھے والدین اور جوان بیوی کے لئے دُنیا کی راحتوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔

"مَیں نے کیا کیا" میرے دل میں افسوس اور ندامت کے حسّیات اُبھرے۔

"کیا مجھے گھر واپس جانا چاہیئے۔ نہیں مجھ میں ایسی جرأت ہی کہاں! موقع گزر گیا۔ مجھے بھول جانا چاہیے کہ میرا کوئی گھر تھا"

ایک بار پھر ماں باپ کے حسرتناک چہرے میرے سامنے آگئے۔ جن پر بڑھاپا اور درماندگی برس رہی تھی۔ آہ۔ جن کو مَیں مفلس اور برباد چھوڑ کر آوارہ گردی کرنے نکل آیا تھا۔ اور جو صرف میری امیدوں کے سہارے زندہ تھے۔

پھر ایک بار میری بیوی کی غمزدہ آنکھیں میری طرف بے بسی سے تک رہی تھیں۔ اس کی مسرور گھڑیاں صرف میرے دم سے وابستہ تھیں۔ اُس نے اپنی تمام جوانی میرے تغافل کی نذر کر دی تھی۔

آگ کی طرح جلتے ہُوئے آنسو میری آنکھوں سے بہ نکلے۔ مَیں رویا۔ میرا حلق خشک ہو گیا۔

میری ذلیل کوٹھڑی سے باہر سرائے کے کشادہ صحن میں ہوا اور پانی میں زور آزمائی ہو رہی تھی۔ درختوں میں ہوا چیخیں مار رہی تھی۔ بجلی تڑپ رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے طوفان نے ایک طوفانِ قیامت برپا کر رکھا تھا۔

بلکتن میری روح کا تمام بوجھ آنسو بن گیا۔ اور مَیں

پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

(۵)

صبح کو بادل چھٹ چکے تھے۔ اور سرد ہوائے لطیف جھونکے آہستہ آہستہ سرسراتے ہے تھے۔ سورج افق پر نیا نیا نظر آ رہا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا۔ کہ صبح کسی عظیم راز کا انکشاف کر رہی ہے۔ اس وقت میرا دل سبک تھا۔ اور خوشی سے دھڑک رہا تھا۔

اور جب صبح کی روشنی میری تاریک کوٹھڑی میں حیات تازہ کا پیغام لائی۔ تو میں اپنا اسباب باندھ چکا تھا۔ اور اپنے چھوٹے ٹوٹے گھر اور بچھڑے ہوئے عزیزوں کے پاس جانے کو تیار تھا۔

ابوالاثر حفیظ

آئینۂ خودداری

اُن شوخ نگاہوں کی اللہ ری عیاری
ٹوٹا ہے سرِ محفل آئینۂ خودداری

پیمانۂ غم میرا لبریز سہی لیکن
کچھ اور ہی کہتا ہے آئین وفاداری

نالے بھی موثر ہیں آہیں بھی مری لیکن
اس عشق کی دنیا میں اک چیز ہے خودداری

میرے لئے قاتل ہے، دنیا کے لئے عبرت
مجھ خستہ و غمگیں سے احباب کی بیزاری

لاعلم چمن والے اور میں بھی ہوں ناواقف
کیا جانئے کیا یارب ہے راز گرفتاری

اُس جانِ تمنّا نے خود کھول دیا چہرہ
دیکھا جو مرے دل میں کچھ جذبۂ خودداری

جلدی سے کہیں یارب پھر فصلِ بہار آئے
کاٹے نہیں کٹتا ہے یہ عالمِ بیکاری

بیمارِ محبت ہوں، مطلوب نہیں مجھ کو
اُس شوخ کی دلداری، احباب کی غمخواری

اُس حُسن کی محفل میں کیا جانئے کیا گزرے
ثابت ہے ابھی تک تو آئینۂ خودداری

کچھ فکر نہیں مجھ کو فردائے قیامت کی
ہاں جام چلے ساقی کس کام کی ہشیاری

لے تیرے تبسّم نے دل چھین لیا میرا
لے ختم ہوا ظالم افسانۂ خودداری

تم نے بھی کبھی رند کچھ غور کیا اس پر
کیوں مایۂ نازش ہے سرشار کی سرشاری

(سرشار کسمنڈوی)

چینی مہنت

ھ

معطّر لفافہ

کسی نے اوُپر کی منزل کا دروازہ کھٹکھٹایا اور گھنٹی بجائی ناکس گھبراکر اپنی میز سے اُٹھا اور سیڑھیوں کی طرف چلا۔ اُوپر کی منزل میں مائیکل ہیبرن رہتا تھا۔ اگرچہ ہیبرن کو اس مکان میں آئے ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ لیکن ناکس کو کبھی اپنے پڑوسی سے ملاقات کرنے یا اسے دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ بار بار گھنٹی ہونے سے ناکس نے خیال کیا کہ ہیبرن کہیں باہر گیا ہوگا۔ اس لیے وہ اپنا کام چھوڑ کر دروازہ کی طرف چل دیا۔

سیڑھیوں میں پہنچکر ناکس نے آواز دی۔ "کون؟ مسٹر ہیبرن باہر گئے ہوئے ہیں۔ فرمایئے کیا کام ہے؟"

اُوپر سے کھٹ کھٹ ایک ہرکارہ اُترا۔ جس نے نیچے پہنچ کر ناکس کو سلام کیا اور کہا۔ "مسٹر ہیبرن کا خط ہے کیا آپ اسے لے سکتے ہیں؟"

ناکس۔ "مجھے دیدو جب ہیبرن صاحب آئینگے میں انہیں پہنچا دونگا۔"

ہرکارہ۔ "تو آپ اس کتاب پر دستخط کر دیجیے۔"

ناکس نے سبز اوراق کی کتاب پر مائیکل ہیبرن کے نام کے سامنے اپنے دستخط کر دیے۔ اور ہرکارے سے ارغوانی رنگ کا لفافہ لے لیا۔ ہرکارہ سلام کر کے چلا گیا اور ناکس مسٹر ہیبرن کی شان میں کچھ بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرہ میں آیا۔ کیونکہ اس کی غیر حاضری ناکس کے کام میں خلل انداز ہوئی تھی۔ ناکس نے کمرہ میں پہنچکر لفافہ کو میز پر ڈال دیا اور خود پائپ سلگا کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ ابھی اس نے بیس پچیس سطریں لکھی ہونگی کہ اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ ناکس پھر گھبرا کر اٹھا اور باہر کے دروازہ کی زنجیر کھول کر بولا۔

"ڈیوڑھی میں ٹھیرو میں ابھی آتا ہوں۔"

ناکس نے یہ دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی کہ آنے والا کون ہے۔ سیدھا اپنی میز پر آیا اور لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ تین چار مزید سطریں لکھ کر اس نے اپنے مضمون کو ختم کر لیا۔ اور کاغذوں کو دھاگے سے نتھی کر کے ڈیوڑھی کی طرف چلا۔ تاکہ چپراسی کے حوالے کر دے۔ ڈیوڑھی کا پردہ ہٹا کر اس نے دیکھا کہ ایک کرسی پر اس کا دوست ہارلے بیٹھا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ قدرے جھینپ گیا اور حیرت سے ہارلے کی طرف دیکھنے لگا۔ ناکس کچھ کہنے ہی کو تھا کہ ہارلے بول اٹھا۔

ہارلے۔" ناکس! مجھے انتظار کرنا پڑا۔"

ناکس۔" اخاہ! آپ تھے۔"

ہارلے۔" میں نہ سہی فرض کرو پرنس آف ویلز تھا یا کوئی چور تھا۔ لیکن یہ کیا حرکت ہے کہ دیکھنے کے بغیر حکم دے دیا۔ 'ٹھیرو میں ابھی آتا ہوں!' شہزادہ ہوتا تو اس کے ناراض ہو جانے کا احتمال تھا۔ کوئی چور ہوتا تو یقیناً لُٹ جاتے۔"

ناکس۔ یار! معاف کرو خطا ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ چپراسی ہے۔ جو اس وقت مضمون لینے کے لئے ــــ آ! وہ آ گیا۔"

پھر گھنٹی ہوئی ناکس نے جھپٹ کر باہر کا دروازہ کھولا اور کاغذات چپراسی کے حوالے کر دئے۔ ناکس لوٹا۔ اور ہارلے کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوسرے کمرہ میں لے گیا اور کمرہ میں داخل ہو کر بولا۔

ناکس۔ کہو! مزاج کیسا ہے۔ کچھ گھبرائے سے معلوم ہوتے ہو۔ کیا پیو گے یا سوڈا۔

ہارلے میز کے قریب آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ ناکس نے بوتل کھولی اور گلاس میں شراب اُنڈیلنے لگا۔ سائیفن کی نالی کو ہاتھ میں لیکر جس کے راستے شراب گلاس میں گر رہی تھی۔ اس نے اپنے دوست کی طرف دیکھا۔ اور دل ہی دل میں خیال کرنے لگا۔ کہ ہارلے واقعی بلا کا جاسوس ہے۔ اس کا چہرہ اس بات کا شاہد ہے۔ اسی لئے تو سلطنت برطانیہ کا دفتر خارجہ اور دفتر داخلہ اس پر کامل اعتماد رکھتے ہیں۔

اتنے میں ہارلے نے ارغوانی رنگ کا لفافہ میز پر سے اُٹھا لیا۔ اور ناک کے قریب لیجا کر اسے سُونگھنے لگا۔ ناکس بولا۔" ہارلے کیا کر رہے ہو؟"

ہارلے نے لفافہ میز پر رکھ دیا۔ اور اپنے دوست کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک معنی خیز شرارت اور غیر معمولی چمک آ گئی تھی۔ اس نے ناکس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

" میں اس خط کو سونگھ رہا ہوں تم نے نہیں سونگھا؟"

ناکس۔ میں کیوں سُونگھنے لگا تھا۔ کیوں اس خط میں کیا خاص بات ہے۔

ہارلے اُٹھا اور ارغوانی لفافہ کو ناکس کی ناک کے قریب لیجا کر بولا۔" ذرا سونگھ تو کیسی خوشبو ہے؟"

ناکس۔ کیوں نہ ہو ہیبرن بڑا شوقین مزاج شخص ہے۔

ہارلے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ شوقین ہے یا نہیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ خوشبو بڑی عجیب ہے۔ ناکس! کبھی پہلے بھی ایسا عطر دیکھا ہے؟

ناکس (لفافہ کو سونگھ کر) یقیناً یہ کوئی نیا عطر ہے میں نے آجتک ایسی خوشبو نہیں سونگھی۔

ہارلے۔ لیکن تم تو ہر قسم کے پھولوں کا عطر پہچان سکتے ہو اور یورپ کے تمام بہترین عطروں سے واقف ہو۔

ناکس۔ ابھی مدح سرائی کو چھوڑو۔ کہو بات کیا ہے جو تم

اس عطر کے پیچھے پڑ گئے ہو۔

ہارلے۔ یہی کہ یہ کوئی معمولی عطر نہیں۔

ناکس۔ درست! پھر

ہارلے۔ سنو! عطر بھی شراب اور سیگار کی طرح خاص خاص اشخاص کے مذاق کا پتہ دیتے ہیں۔ اگر تم مجھے بتاؤ کہ تم نے فلاں خاص ذائقہ کی شراب پی ہے تو میں بتا سکتا ہوں کہ تم نے کس کے ہاں دعوت اُڑائی۔ جہانتک میرا خیال ہے اس عطر کو ایک شخص کے سوا یورپ بھر میں کوئی استعمال نہیں کرتا۔

ناکس۔ یعنی چہ؟

ہارلے۔ یہی کہ آج خوش قسمتی سے وہ سراغ تمہاری میز پر پڑا ہے۔ جس کے لئے میں نے لندن کے چینی محلہ کی خاک چھان ماری ہے۔

ناکس (متحیر ہوکر) لیکن ہیبرن کے اس خط کا چینی محلہ سے کیا تعلق؟

ہارلے۔ یہی تو ہمیں معلوم کرنا ہے۔

ہارلے نے اپنا کوٹ اُتار کر کرسی پر رکھ دیا۔ اور ہیٹ فرش پر پھینک دی۔ گلاس کی طرف اشارہ کرکے بولا۔" لائیے ذرا تازہ دم ہولوں"

ناکس نے دو گلاس بھر لئے تھے۔ ایک اس نے اپنے دوست کے سامنے رکھ دیا۔ جو کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اور دوسرا اپنے سامنے رکھ لیا۔ ہارلے نے خط کو لیمپ کی روشنی میں غور سے دیکھا۔ اور ناکس سے پُوچھا۔

ہارلے۔ تم اس شخص ہیبرن کی نسبت کیا جانتے ہو۔

ناکس۔ میں کچھ نہیں جانتا کوئی ڈیڑھ ماہ سے یہ اُوپر کی منزل میں مقیم ہے۔ لیکن میں نے کبھی اسے نہیں دیکھا۔ کبھی دیکھنے کا اتفاق ہی نہیں ہُوا۔ اور نہ میں یہ جانتا ہوں۔ کہ ہیبرن کیا کام کرتا ہے۔

ہارلے۔ ایسا ہے تو یہ پراسرار خط تمہیں کس طرح ملا۔

ناکس نے مختصر طور پر خط ملنے کا حال کہہ سُنایا اور پائپ سُلگا لیا۔

ہارلے۔ تو یوں کہو کہ قسمت نے یاوری کی۔ اچھا ذرا تنباکو دیجئے۔ میں پائپ بھر لوں۔ مجھے بہت کام کرنا ہے ذرا پانی کی پتیلی آگ پر رکھ آؤ۔ اور ایک روٹی لاؤ اگر تازہ مل سکے تو اچھا ہے۔

ناکس۔ پتیلی آگ پر رکھدی۔ اور روٹی لاؤں کیا معنی؟ اگر کھانا نہیں کھایا تو صاف کہو کوئی اچھی چیز تیار ہوسکتی ہے۔

ہارلے۔ نوازش! لیکن مجھے رُوح کی غذا چاہئے۔ (لفافہ اُٹھاکر) بڑی عجیب مہر ہے لیکن ہمیں اپنی طرف سے کوئی کمی نہ کرنی چاہئے۔

ناکس۔ میں سمجھا خط کھولنا چاہتے ہو، بھاپ کی اس لئے ضرورت ہے۔ لیکن روٹی کی منفعت میں نہ سمجھا ہارلے

یہ خط امانت ہے۔ اور میرے پاس امانت ہے۔

ہارلے۔ (ناکس کی طرف نظر اُٹھا کر) ناکس! مَیں نے کبھی ایسی نازیبا حرکت کی ہے؟

ناکس۔ کبھی نہیں۔

ہارلے۔ سُنو! یہ ارغوانی رُقعہ عشق و محبت کی داستان نہیں، اس پر مہر لگی ہے۔ مَیں نے آجتک ایسی مہر نہیں دیکھی۔ اس میں خوشبو لگا دی گئی ہے۔ اور مَیں جانتا ہوں کہ یہ خوشبو یورپ کیا بلکہ دُنیا بھر کی ایک خطرناک عیار عورت سے تعلق رکھتی ہے۔ تمہارا پڑوسی مائیکل ہیبرن یا تو اس کا ساتھی ہے اور یا اس کا فریب خوردہ۔ ہمارا فرض ہے کہ اسے اس عیار عورت کے پنجہ سے نجات دلائیں یا اسے بھی مجرم ثابت کریں۔

ناکس (بہت متعجب ہوکر) لیکن ہارلے ——

ہارلے۔ اس چالاک عورت اور اس کے رفقا کی برکت سے ہزارہا اشخاص قتل ہو چکے ہیں۔ اگر ان کشتگانِ جفا کو علیحدہ بھی کر دیا جائے۔ جو اس کے حسن فسوں ساز کی بھینٹ چڑھ گئے تو بھی یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس کی بدولت ایک سلطنت تباہ ہوئی۔ اور برطانیہ عظمٰے کے اسقدر فرزند اس کی عیاری کا شکار ہوئے کہ اتنے گیلی پولی کی لڑائی میں نہ مرے ہوں گے۔

ناکس۔ اوہو کیا یہ حقیقت ہے؟

ہارلے۔ حقیقت! روزِ روشن کی حقیقت۔ اس عورت کا لندن میں موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ سلطنت برطانیہ پر عظیم الشان خطرہ آنے والا ہے۔ دفتر خارجہ نے اس عورت کا سراغ لگانے میں دُنیا چھان ماری۔ ایک مدت سے مَیں بھی اس کام پر متعین ہوں۔ ہفتوں سے کسی سراغ کی تلاش میں تھا تاکہ تفتیش کر سکوں۔

ناکس۔ ہارلے! یہ عورت کون ہے؟ کس قوم سے تعلق رکھتی ہے۔

ہارلے۔ لندن، پیرس، روما اور نیویارک کے کاغذات میں اس کا نام میڈم ڈی میڈیسی لکھا جاتا ہے۔ ابھی میں تحقیق نہیں کر سکا کہ وہ کس قوم سے ہے۔ اور کون ہے۔ تم نے اس کا نام پہلے بھی سُنا؟

ناکس۔ مَیں نے آجتک نہیں سُنا۔

ہارلے۔ اب سُن لیا۔ ذرا پتیلی اور روٹی لاؤ۔ ہو سکے تو لوہے کی گرم سلاخ بھی لیتے آنا۔

پُراسرار خط کا مضمون

ناکس دوسرے کمرہ میں گیا اور گیس کا لیمپ اُٹھا لیا۔ پتیلی لیمپ پر رکھی گئی اور لیمپ جلا دیا گیا۔ ناکس نے ایک روٹی بھی لاکر میز پر رکھ دی۔ ہارلے خط کو گہری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ ناکس جب اس کے قریب پہنچا تو اُس نے کہا۔

ہارلے۔ تم نے پہلے بھی ایسی تحریر دیکھی ہے۔

ناکس۔ نہیں حروف کی شکل نہایت عجیب ہے۔

ہارلے کیسی ؟

ناکس (لفافہ کے پتہ کو غور سے دیکھ کر) لکھنے والی انگریز تو نہیں، شاید فرانسیسی ہو دیکھو سات کا ہندسہ کٹا ہوا ہے

ہارلے - بیشک لیکن یورپ کے اکثر ممالک اس ہندسہ کو اسی طرح لکھتے ہیں - اس تحریر میں خصوصیت تو یہ ہے کہ سیدھے خطوط قدرے جلی ہیں -

ناکس - درست ! شاید کسی موٹے قط والے قلم سے لکھا گیا ہو؟

ہارلے - ممکن ہے -

ہارلے نے روٹی کو توڑا اور گودا نکال کر ہاتھ میں ملنے لگا - اور ناکس کی طرف مخاطب ہو کر بولا " جب ہم نے کام شروع کر دیا تو ضرور کامیاب ہونگے - تم بھی ایسے ہی گولے بناؤ - "

ناکس اس شخص کے اس عجیب و غریب فعل پر حیران تھا لیکن ہارلے کی محیر العقول باتیں سنکر اسے جرأت نہ ہوتی تھی - کہ اس کی مخالفت کرے - چنانچہ وہ بھی ہارلے کی طرح گودے کی گولیاں بنانے میں مشغول ہو گیا - ہارلے نے چار گولیاں ایک کاغذ پر رکھ دیں - اور نگاہ اٹھا کر ان پائپوں کی طرف دیکھا - جو طشتری میں رکھے ہوئے تھے اس نے ایک پائپ اٹھایا - اور گودے کی گولی کو اس میں بھر کر دبانا شروع کیا - جب پائپ بھر گیا - تو اس نے گودے کی سطح کو ہموار کر کے اسے ایک طرف رکھ دیا - اسی طرح اس نے چاروں پائپ گودے سے بھرے اور رکھ لئے - اور مسکرا کر ناکس سے کہنے لگا -

ہارلے - " اب ہمارا تجربہ شروع ہوگا (خط کو دیکھ کر) بڑی عجیب مہر ہے - خدا جانے اس میں کیا شکل بنائی گئی ہے - ناکس ! جو کام ہم کرنے والے وہ زبردست جعلسازی ہے "

لفافہ پر سنہری لاکھ کی مہر لگی تھی - ہارلے نے لفافہ کو کتاب پر رکھا اور پائپ کے منہ کو مہر پر رکھ کر زور سے دبایا - اور اٹھا لیا - گودے کو ایک نظر دیکھ کر اس نے پائپ ایک طرف رکھ دیا - اور اسی طرح اس نے چاروں پائپوں سے گودے پر مہر کا نقشہ اتار لیا -

ہارلے ذرا تیز ہو رہا تھا لیکن اس نے نہایت متانت سے مہر کو توڑا اور ٹوٹی ہوئی لاکھ کو ایک طشتری میں رکھتا گیا - مہر کو توڑ کر اس نے خورد بین سے لفافہ کا معائنہ کیا - اور مطمئن ہو کر لفافہ کو بھاپ پر گرم کرنے لگا - جو پتیلی سے اٹھ رہی تھی - بھاپ کی گرمی سے لفافہ کی مہر نرم ہو گئی - اس نے لفافہ کو نہایت احتیاط سے کھولا اور لفافہ کے اندر دو انگلیاں ڈال کر ایک چھوٹا سا کارڈ نکالا - لفافہ میں اس کارڈ کے سوا اور کچھ نہ تھا -

ناکس ہارلے کے پاس کھڑا تھا - دونوں کی نظریں کارڈ پر پڑیں - ناکس تو اسے دیکھ کر قدرے مایوس اور متعجب سا ہو گیا لیکن ہارلے کا چہرہ صاف ظاہر کر رہا تھا کہ اسے غیر معمولی چیز

ہاتھ آگئی۔ تھوڑے توقف کے بعد ہارلے بولا۔

ہارلے۔ آہا۔ دیکھتے ہو۔ یہ کیا ہے؟

ناکس۔ دیکھتا ہوں لیکن سمجھتا نہیں۔ یہی ہے نا کہ ایک سیاہ تصویر ہے۔ جس کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہیں۔ "رات کے دو بجے"

ہارلے نے خوردبین سے اس کارڈ کا معاینہ کیا۔ اور ناکس سے کہا:۔

ہارلے۔ تم کیا جانو تم تو اس بھید سے ناواقف محض ہو۔ دیکھو مَیں اب اس خط کو بند کرتا ہوں۔ سب باتیں یاد رکھنا اتنا کہہ کر ہارلے نے کارڈ کو لفافہ میں ڈالا۔ اور گوند کو بھاپ پر نرم کر کے لفافہ بند کر دیا۔ لفافہ کے مُنہ پر لاکھ رکھی اور لوہے کی سلاخ کو جو سُرخ انگارا ہو رہی تھی۔ لاکھ پر رکھ دیا لاکھ گرمی سے پگھلی۔ اس نے جھٹ ایک پائپ کا سانچہ اس پر لگا دیا۔ اور ناکس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "مہر ثبت ہو گی یا نہیں"

ہارلے نے پائپ اُٹھا لیا۔ اور مہر کو دیکھ کر پکار اُٹھا "لیجئے مہر درست ہے یا نہیں"

ناکس نے مُہر کو دیکھا۔ اگرچہ اس کے خطوط ایسے واضح نہ تھے لیکن پھر بھی مہر لگانے میں نمایاں کامیابی ہو گئی تھی۔ ہارلے نے کہا۔ "پہلے پائپ ہی سے کام ہو گیا۔ مَیں نے احتیاطاً چار تیار کر لئے تھے"

ہارلے مہر کو خوردبین سے دیکھ رہا تھا۔ اور ناکس پائپ سے گود انکالنے میں مشغول تھا۔ اتنے میں گرجے کے گھنٹے نے بارہ بجائے۔ ہارلے کے چہرہ سے صاف ظاہر تھا۔ کہ اسے نہایت اہم سراغ چل گیا ہے۔

ناکس کرسی پر بیٹھا اپنے پڑوسی کی عجیب و غریب کیفیت اور ہارلے کی حیرت انگیز باتوں پر غور کر رہا تھا۔ کہ ہارلے نے آنکھیں بند کر کے (گویا کچھ سوچ رہا ہے) کہا۔

ہارلے۔ تم نے دیکھا کارڈ پر کیا وقت لکھا ہے۔

ناکس۔ دو بجے رات' ابھی بارہ بجے ہیں۔

ہارلے۔ ہاں بارہ بجے ہیں۔ ابھی دو گھنٹے باقی ہیں اتنے وقت میں کیا کیا کرنا ہے۔

ناکس۔ مَیں کیا جانوں

ہارلے۔ صرف دو گھنٹے میں وہ کوشش کرنی ہے جس سے دُنیا کو کسی نئے خطرہ سے نجات ملے۔ اور یہ کتنا بڑا کام ہے۔ (آنکھیں کھول کر) تم نے تصویر دیکھی تھی۔

ناکس۔ ہاں دیکھی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی پرانے زمانے کے پادری کا خاکہ ہے۔

ہارلے۔ سوچو' مَیں نے تم سے کہا تھا۔ اچھی طرح دیکھ لو۔

ناکس۔ مَیں سوچ رہا ہوں۔

ہارلے۔ تم نے تصویر کے سر پر ٹوپی کے اُوپر ایک طرہ نہیں دیکھا یہ کسی قسم کی کوئی چیز تھی

ناکس۔ ہاں مجھے یاد آ گیا ایسی ہی کوئی چیز بنی ہوئی تھی تو۔

ہارلے۔ تم نے کبھی کسی چینی مہنت کو دیکھا ہے۔

ناکس۔ چینی مہنت! ہارلے! یہ چینی مہنت کی تصویر تھی

ہارلے۔ ہاں یہ چینی مہنت کی تصویر تھی سیاہ پوش چینی مہنت کی تصویر

ناکس۔ سیاہ پوش چینی مہنت یعنی کیا؟ ہارلے! میں نہیں سمجھا۔

ہارلے۔ جانتے ہو آج کل چین میں کیا ہو رہا ہے؟

ناکس۔ جو کچھ اخبارات میں شائع ہوتا ہے مجھے معلوم ہے

ہارلے۔ تم نے کوئی خاص رائے قائم کی؟

ناکس (ذرا سوچ کر) یہی کہ ملک میں فساد اور بدامنی ہے

ہارلے۔ فساد اور بدامنی۔ ٹھیک۔ کبھی تم نے غور کیا کہ سن یت سین اور چن چانگ فریقین میں سے کونسا فریق کامیاب ہوگا۔

ناکس۔ تمہارے سوال کا جواب دینا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے

ہارلے۔ میں خود جواب دیتا ہوں۔ دونوں میں سے کوئی فریق کامیاب نہ ہوگا۔ چین میں ایک نئی تحریک جڑ پکڑ رہی ہے۔ اور اگر یہ تحریک کامیاب ہوگئی تو دنیا تباہی کے گڑھے میں دھکیل دی جائیگی۔ آجکل چین بین الاقوامی سیاست کا مرکز بن رہا ہے۔ تمام قوموں کی نظریں چین پر لگی ہوئی ہیں تمام سلطنتیں چین کے خطرہ کو محسوس کرنے لگی ہیں۔ چینی باشندوں کو یقین ہے۔ کہ زرد نسل دنیا کی حاکم ہوگی۔ آجکل چینی کی طرف امید کی نظریں لگاتے ہوتے ہیں۔ جس کا نام کبھی اخبار میں نہیں آیا۔ بلکہ پیکن کے حکام بھی اس کے نام سے آشنا نہیں۔

ناکس۔ یہ کون بزرگ ہیں؟

ہارلے۔ یہی سیاہ پوش چینی مہنت

ناکس۔ اس کا اصلی نام؟

ہارلے خوب! دنیا کی چار جلیل القدر سلطنتوں کے جاسوس برسوں سے اس سوال کا جواب دینے کی ٹوہ میں لگے ہوتے ہیں۔

ناکس۔ میرے لئے تو یہ انکشاف بہت حیرت انگیز ہے اگر ایسا ہے تو بہت بڑا خوفناک شخص ہے۔

ہارلے۔ ہاں وہ ایسا ہی خوفناک شخص ہے۔ ایسی تحریکیں عین وقت پر ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ اور دنیا سے اپنا لوہا منوالیتی ہیں۔ خیر ہمیں اتنا تو معلوم ہوگیا کہ میڈم ڈی بیڈیسی چینی مہنت کی لندنی قائمقام ہے۔

ناکس۔ اس کے علاوہ یہ کہ مائیکل ہیبرن بھی اس کا ساتھی ہے۔

ہارلے۔ دو گھنٹے تک وہ کہاں ہوگا؟ غالباً میڈم ڈی بیڈیسی کے مکان پر۔

ناکس۔ تم اس کا مکان جانتے ہو۔

ہارلے۔ ہاں جانتا ہوں۔

ناکس۔ پھر کیا کرنا چاہتے ہو۔

ہارلے۔ سب سے پہلے تو تم ذرا اُوپر جاؤ اور مائیکل ہیبرن کو خط دے آؤ۔ شاید وہ آگیا ہو۔ میں اس کی آواز سننا چاہتا

ہوں لیکن ساتھ ہی میں چاہتا ہوں۔ کہ اس کو میرے یہاں ہونے کا علم نہ ہو۔

سیاہ بُرقعے

ناکس۔ اُوپر جانا فضول ہے۔ اُوپر سے کوئی آواز نہیں آئی۔

ہارلے (مضطرب ہو کر کمرہ میں ٹہلتے ہُوئے) کیا بات ہے مائیکل ہیبرن کیوں نہیں آیا؟ چینی مہنت کے رفقاء تو حد سے زیادہ محتاط ہونے چاہئیں۔ انہوں نے چار قوموں کے جاسوسوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ پھر وجہ کیا ہے کہ ہیبرن ابھی تک غیر حاضر ہے؟

ناکس۔ شاید اسے اس دعوت نامہ کے آنے کی توقع نہ ہو۔

ہارلے۔ یہ رقعہ کس وقت آیا تھا۔

ناکس۔ گیارہ بجے سے ذرا پیشتر۔

ہارلے۔ میڈم ڈی میڈیسی نے صرف تین گھنٹہ پہلے اطلاع دی۔ صاف ظاہر ہے۔ کہ اسے ہیبرن کے مکان پر ملنے کا یقین ہوگا۔ اب کے بجے ہیں۔

ناکس۔ ایک بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔

ہارلے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اسے کچھ شبہ ہو گیا ہو؟ کیا اُس نے مجھے یہاں آتے دیکھ لیا؟ کیا اسے معلوم ہے کہ میں جاسوس ہوں؟ کیا بات ہے؟ یہ معمہ کیا ہے؟

ناکس۔ کوئی نہیں تمہارا خیال ہے کہ ہماری باتیں سُن لی گئیں

ہارلے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس کا نہ آنا غفلت یا بے پروائی کا نتیجہ ہو۔ خفیہ انجمنوں کے کارکن ایسے نہیں ہوتے وجہ دریافت کرنی چاہیے۔

ناکس۔ ممکن ہے کہ وہ وقت سے پہلے آجاتے۔

ہارلے۔ اس صورت میں اسے بہت عجلت سے کام لینا پڑیگا۔ میڈم ڈی میڈیسی کا گھر بہت دُور ہے۔

ناکس۔ شاید ملاقات کی جگہ میڈم کا گھر نہ ہو کوئی اور جگہ ہو۔

ہارلے۔ لفافہ اسی کا لکھا ہُوا تھا ـــــ کیا میں ٹیلیفون استعمال کر سکتا ہوں؟

ہارلے نے ٹیلیفون کا آلہ اُٹھایا اور آواز دی۔

"مشرق دو سو نمبر ـــــ (تھوڑے وقفہ کے بعد) ہیلو! میں ہوں پال ہارلے انسپکٹر ریکس ہیں ـــ اوہ خوب مہربانی فرماکر ان کی خدمت میں آدمی بھیج دیجئے۔ اُس گھر پر خفیہ پہرہ لگایا جاتے۔ انسپکٹر سے کہئے کہ کہیں نہ جائیں میں دو بجے سے پہلے ملونگا۔ وقت بہت کم ہے۔ ٹیلیفون پر چوکی میں کہہ دیجئے کہ لائم ہوس میں پولیس کا ایک دستہ تیار رہے میرے دفتر کے سامنے موٹر تیار رہے ـــــ شکریہ خدا حافظ"

ہارلے نے آلہ میز پر رکھ دیا۔ اور ناکس کی طرف دیکھکر مُسکرایا اور بولا۔

ہارلے۔ اب کچھ کرنا چاہیے۔ ہم مسٹر ہیبرن کو ایک اور موقع دیتے ہیں۔ آپ کو اس کا فون نمبر معلوم ہے۔

ناکس۔ نہیں ــــ ہاں معلوم ہے۔ اُوپر کی منزل میں اس کے

پہلے مارٹنڈیل سمتھ رہتے تھے۔سمتھ کے نام پر ٹیلیفون کا نمبر ہوگا۔کتاب میں دیکھ کر معلوم ہو جائیگا۔

ناکس نے کتاب کھولی اور سمتھ کے عنوان کے ماتحت "جے مارٹنڈیل کے سی ...... وسط ۲۱ ۲۴۶۲" کا نمبر پڑھا!

ہارلے - خوب! ذرا ملاؤ تو

ناکس نے ٹیلیفون کی گھنٹی بجائی اور ہمہ تن اشتیاق ہوکر کان لگا دیئے۔لیکن کوئی جواب نہ آیا۔

ہارلے اس وقت بہت پریشان ہو رہا تھا۔اتنے میں گرجا کے گھنٹہ نے ایک بجایا ہارلے نے کہا۔

ہارلے - یہی توقع تھی۔میں ذرا تمہاری خوابگاہ کی کھڑکی سے دیکھنا چاہتا ہوں بُرا نہ ماننا۔

ناکس - کیا دیکھو گے؟

ہارلے - وہاں سے ہیبرن کے کمرہ کی کوئی کھڑکی نظر آتی ہے۔

ناکس - ہاں اس کے غسل خانہ کی کھڑکی عین اُوپر ہے۔

ہارلے بہت خوب کہہ کر اُٹھا۔اور گھبرایا ہُوا۔ناکس کی خوابگاہ میں گیا۔چند لمحہ کے بعد واپس آیا۔آتے ہی اس نے پوچھا:-

ہارلے - تمہارے پاس ٹینس کھیلنے کے نرم بوٹ تو ہونگے۔

ناکس - ہیں۔

ہارلے - مجھے لا دیجئے۔

ناکس - کیا کرو گے؟

ہارلے - میں پانی کے نل پر چڑھ کر ہیبرن کے غسل خانہ میں جاؤں گا۔

ناکس - واہ اگر وہ آگیا اور اس نے تمہیں اپنے مکان میں دیکھ لیا تو۔

ہارلے - اگر وہ آگیا تو اسے خط دینے کے لئے ٹھیرا لینا۔

ناکس - لیکن میں تمہیں کس طرح خبر دُونگا۔

ہارلے - ایک لمبی ڈوری لے آؤ۔میں انتظام کر دیتا ہوں۔

ہارلے بڑی پھرتی سے کام لے رہا تھا۔اس نے جلد جلد اپنے بوٹ اُتارے اور ٹینس کھیلنے کے بُوٹ پہن لئے۔اتنے میں ناکس ڈوری لے آیا۔ہارلے نے ڈوری کا ایک سرا اپنے بٹن کے ساتھ لپیٹ لیا۔اور خوابگاہ کی کھڑکی کھول کر نل پر چڑھنے لگا۔ہیبرن کے غسل خانہ کی کھڑکی کھُلی تھی۔ہارلے نے کہا کہ میں اُوپر پہنچ کر ڈوری کو کسی ایسی چیز کے ساتھ باندھ دُونگا۔کہ ڈوری کھینچنے سے وہ چیز فرش پر گر پڑیگی۔اس سے مجھے معلوم ہو جائیگا۔کہ تم مجھے بلا رہے ہو جب وہ آئے۔تو اسے خط دینے کے لئے ٹھیرا لینا اور خوابگاہ میں آکر ڈوری کھینچ لینا۔میں نیچے اُتر آؤنگا۔

اتنا کہہ کر وہ جلدی جلدی نل پر چڑھ گیا اور غسل خانہ کی کھڑکی میں سے اندر چلا گیا۔ڈوری کو ذرا کھینچ کر اس نے تمام

انتظام درست کر لیا۔ ناکس بھاگتا ہوا ڈیوڑھی میں آیا اور زینہ کی طرف کان لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی اُسے وہاں کھڑے چند منٹ ہی گزرے تھے۔ کہ مائیکل ہیبرن کے مکان کا دروازہ پٹ سے کھلا۔ اور اُوپر سے گھبرائی ہوئی آواز میں کسی نے کہا۔

"ناکس ناکس ذرا اُوپر آؤ"

ناکس یہ غیر متوقع آواز سُنکر جو ہارلے کی تھی چونک پڑا لیکن کچھ سوچنے کے بغیر فوراً اُوپر چڑھ گیا۔ ہارلے نے کہا۔ "معلوم ہو گیا کہ ہیبرن نے ٹیلیفون کا جواب کیوں نہیں دیا اگر پہلے سے خبر ہو سکتی تو خط کھولنے اور مہر لگانے کی کاوش بھی نہ کرنی پڑتی۔"

ناکس ہارلے کے پیچھے پیچھے دوسرے کمرہ میں داخل ہوا لیکن ابھی دہلیز تک ہی پہنچا تھا کہ ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ بیساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ "ہیں یہ کیا؟"

فرش پر ایک لانبے آدمی کی لاش چت پڑی تھی۔

ہارلے بولا۔ "مائیکل ہیبرن کو کسی نے مار ڈالا۔"

ناکس (خوفزدہ ہو کر) قالین پر خون کے دھبے بھی ہیں۔

دونوں لاش کے قریب گئے۔ مقتول سادہ سوٹ پہنے تھا جس پر خون کے نشان موجود تھے۔ چہرہ کی حالت دگرگوں تھی۔ بلند اور کشادہ پیشانی سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ مقتول کوئی معزز شخص ہے۔ لاش کے قریب میز کے نیچے ایک طمنچہ پڑا تھا۔ لاش کی دونوں مٹھیاں بند تھیں۔ ناکس نے پستول کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

ناکس۔ شاید غریب نے خودکشی کر لی۔

ہارلے۔ نہیں گولی سے نہیں مرا بلکہ گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔

ہارلے ناکس کا بازو پکڑ کر اسے دوسرے کمرہ میں لیگیا اور بولا۔ "ادھر دیکھو معلوم ہو جائیگا۔"

ناکس خوفزدہ ہو رہا تھا۔ دوسرے کمرہ میں پہنچا تو اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔ وہاں کرسی پر ایک لاش پڑی تھی۔ جس کے بازو میز پر پھیلے ہوئے تھے۔ اور سر ایک کھلی ہوئی کتاب پر پڑا تھا۔ جو ٹیلیفون کی ڈائرکٹری تھی۔ سامنے میز پر ٹیلیفون کا آلہ دھرا تھا۔

چند لمحے دونوں مبہوت ہو کر اس منظر کو دیکھتے رہے آخر ناکس نے کہا۔ "دونوں میں سے ہیبرن کون ہے۔"

ہارلے۔ دوسرا چینی ہے۔

ناکس۔ کیا وہ لاش چینی کی ہے۔ نہیں - - - -

ہارلے۔ میں دیکھتے ہی تاڑ گیا تھا کہ وہ چینی کی لاش ہے۔

ناکس (میز کی لاش پر جھک کر) اس کا رنگ بھی تو زرد ہے۔ یہ بھی ——

ہارلے۔ اسے نہ چھیڑو۔ جس طرح ہے رہنے دو۔

ناکس۔ پولیس کو اطلاع کریں۔

ہارلے۔ ہمیں ایسا نہ کرنا چاہیے۔

ہارلے لاش کی طرف بڑھا اور کتاب پر جھک کر بولا۔

ہارلے۔ "شاید اتفاق کی بات ہو لیکن ڈائرکٹری کا وہ صفحہ کھلا ہے۔ جس پر میرا نام اور نمبر ہے۔"

ناکس۔ للعجب اس مکان میں کیا طلسم ہے اگر پستول چلتا تو آواز نہ آتی۔

ہارلے۔ پستول چلا۔ اور ابھی زیادہ عرصہ بھی نہیں ہوا کہ چلا۔ اس غریب کے بائیں پھیپھڑے پر گولی لگی

ناکس۔ لیکن میں شام کے وقت سے باہر نہیں گیا اور فائر کی آواز نہیں آئی۔

ہارلے۔ پستول ایسا ہے۔ جس کی آواز پیدا نہیں ہوتی یہ ایسی ملعون ایجاد ہے۔ جو چوروں اور ڈاکوؤں کے راس آتی ہے۔ ان کمروں میں بڑے بڑے اسرار ہیں ایسے اسرار کہ یورپ اور امریکہ کے جاسوس ان کے حاصل کرنے میں ناکامیاب رہے ہیں۔ مابیکل ہیبرن کا مارا جانا معمولی بات نہیں۔ یہاں وقت ضائع نہ کرنا چاہیئے۔

اتنا کہہ کر وہ ڈیوڑھی کی طرف دوڑا ناکس بھی اس کے پیچھے تھا۔ ڈیوڑھی میں کرسی پر ایک چغہ پڑا تھا۔ اور فرش پر ایک چرمی بیگ دھرا تھا ہارلے نے کہا "چغہ کی جیبیں ٹٹولو" اور خود بیگ کھولنے لگا۔ بیگ سے ایک سیاہ برقعہ برآمد ہوا۔ جس میں صرف آنکھوں کے لئے سوراخ تھے۔ ہارلے نے کہا "بیگ میں اور کچھ نہیں چغہ میں کیا ہے"

ناکس نے چغہ کی جیب سے ایک چیز نکالی اور متحیر ہو کر کہا "یہ ہے" اول تو ایسے برقعہ کا ملنا کم حیرت زا نہ تھا لیکن اس چیز سے تو ناکس کے استعجاب کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ یہ ایک ارغوانی لفافہ تھا۔ بجنسہٖ ویسا جو ناکس کی میز پر مابیکل ہیبرن کے لئے رکھا ہوا تھا۔ اس پر بھی وہی تحریر تھی۔ جسے میڈم ڈی میڈیبی سے منسوب کیا گیا تھا اسی لاکھ سے اس پر مہر لگائی گئی تھی۔ جس سے ہیبرن کا خط بند کیا گیا تھا۔ یہ لفافہ کھلا تھا۔ ہارلے نے لفافہ چھین لیا۔ اور اس پر حسب ذیل پتہ پڑھا۔

"مسٹر ڈبلیو جولین نمبر ۱۷ ویل کورٹ میڈا ویل میں دوسرے کا نام بھی معلوم ہو گیا"

ناکس۔ جس کی لاش میز پر ہے۔

ہارلے۔ بیشک دیکھو تو اس کے اندر کیا ہے؟

ہارلے نے لفافہ ناکس کو دیا۔ اور خود دوسرے کمرہ میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک اور سیاہ برقعہ لیکر آ پہنچا۔ ناکس نے لفافہ میں سے کارڈ نکال لیا تھا۔ جس پر چینی عفریت کی تصویر اور رات کے "۹ بجے" کے الفاظ درج تھے۔ ہارلے بولا۔

ہارلے۔ سمجھے جولین ہیبرن کو بلانے کے لئے آیا۔ جھگڑا ہو گیا اور ـــــ

اتنے میں گرجے کے گھنٹے نے ڈیڑھ بجایا ہارلے نے کہا

"میڈم ڈی میڈیسی کے گھر تک پہنچنے کے لئے صرف تیس منٹ باقی ہیں۔"

چینی محلہ

ہارلے اور ناکس لندن کے خاموش بازاروں میں سے گزر رہے تھے۔ موٹر پوری رفتار کے ساتھ آزادی سے اُڑا جا رہا تھا۔ وہی بازار جن میں دن کے وقت انسانی ہستی کا بحرِ ذخار موجیں مارا کرتا ہے۔ رات کے وقت سنسان اور غیر آباد تھے۔ پانچ منٹ تک تو ہارلے اور ناکس خاموش بیٹھے رہے۔ لیکن دفعتاً ہارلے نے کہا۔

ہارلے۔ مجھے بڑی حیرت ہے کہ اس خطرناک خفیہ انجمن کے کارکن اس طرح ہمارے ہاتھ لگ جاتیں۔ حالانکہ دُنیا بھر کے جاسوس ان کا لوہا مان چکے ہیں۔

ناکس۔ اتفاق کی بات ہے۔

ہارلے۔ اتفاق! مائیکل ہیبرن کا مارا جانا تو اتفاق ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا تمہارے پڑوس میں رہنا اتفاق کی بات نہیں۔

ناکس۔ مَیں تو اسے بھی اتفاق ہی کہونگا۔

ہارلے۔ نہیں بلکہ اس نے اس مکان کو محض اس لئے منتخب کیا تھا۔ تاکہ میری نقل و حرکت کو دیکھ سکے ہماری دوستی کوئی خفیہ راز نہیں۔ اکثر لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں۔ تم حیران ہوگئے کہ مَیں نے قتل کی واردات کی تفتیش نہیں کی۔

لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اس انجمن کا سراغ لگانا زیادہ اہم تھا۔ اس کام میں نہ صرف ہمارے بہترین جاسوس ناکامیاب ہو چکے ہیں۔ بلکہ دوسری سلطنتوں کے خفیہ کارکنوں نے بھی اس امر میں زک اُٹھائی ہے۔ میرے خیال میں چینی مہنت کی شخصیت امنِ عالم کے لئے خطرناک ہے۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے۔ کہ اگر یہ کانٹا نکال بھی دیا جائے تو اس انجمن کا کام رُک جائیگا۔ یا کوئی دوسرا شخص اس کی جگہ لے لیگا۔ امریکہ اس خفیہ انجمن کا سُراغ لگانے میں بہت دلچسپی لے رہا ہے۔ واشنگٹن کا بہترین جاسوس اینڈموکیب تو اس سلسلہ میں قطعی طور پر مایوس ہو چکا ہے۔ کچھ دن ہُوئے کہ چینی مہنت امریکہ میں تھا۔ اینڈموکیب کو اس کا سراغ مل گیا۔ چینی مہنت خفیہ طور پر وہاں پہنچا اور وہاں سے خفیہ طور پر نکل بھی گیا۔ اینڈ سر پیٹتا رہا۔ لیکن کچھ نہ کر سکا۔ اس خفیہ انجمن کے کارناموں کا سراغ لگانے میں تو اکثر کامیاب ہوگئے لیکن ان کی پُر اسرار شخصیتوں کا کچھ پتہ نہ چلا۔

ناکس۔ یہ انجمن بڑی حیرت انگیز ہوگی۔ اس کا طریقِ کار بڑا عجیب ہوگا!!!

ہارلے۔ دریں چہ شک۔ موکیب نے بسا اوقات اس کا سراغ لگایا مگر نتیجہ وہی رہا۔ آخر مایوسی یا خوف کی وجہ سے اس نے محکمہ جاسوسی کی خدمت ہی ترک کر دی اور پنشن لیکر علیحدہ ہوگیا۔ علیحدگی سے پیشتر اسے ایک اہم سراغ ملگیا۔

تھا۔ جو آج کے واقعات میں نمایاں طور پر ظاہر ہے۔ لیکن یہ
سراغ اسے ایسے وقت ہاتھ لگا۔ جب موقع گذر چکا تھا شاید
اسی بات نے اسے مایوس کردیا ہو۔

ناکس۔ یہ سراغ کیا تھا؟

ہارلے۔ کارڈ جس پر چینی جہنت کی تصویر تھی۔ اور وقت
لکھا تھا تصویر کے سر پر ایک طرہ

ناکس۔ یہی کارڈ جو ہمیں ملا۔

ہارلے۔ بجنسہٖ یہی اسی لئے تو میں یہ کارڈ دیکھ کر چونک
پڑا تھا۔ میڈم ڈی میڈیسی پر میری آنکھ مدت سے تھی لیکن
کسی سراغ کے بغیر میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔ مجھے اس پر اتنا
شبہ تو ہو گیا تھا کہ اس کا چین کے ساتھ ضرور کوئی تعلق ہے
اب تو ہمیں معلوم ہو گیا ہے۔ کہ وہ چینی جہنت کی قائم مقام ہے

ناکس۔ اس نے خط و کتابت میں بڑی بے احتیاطی سے
کام لیا۔

ہارلے۔ یعنی رقعہ معمولی ہرکارے کے ہاتھ بھیجا۔ اس سے
بہتر اور کیا انتظام ہو سکتا تھا محفوظ ترین ذریعہ یہی ہے۔
میں بھی تو اکثر معاملات میں معمولی ہرکاروں سے کام لیا کرتا
ہوں۔ میڈم بڑی ہوشیار عورت ہے۔ اس میں اس کا کوئی
قصور نہیں۔

ناکس۔ اب کیا کرنا چاہتے ہو کیا کروگے؟

اتنے میں موٹر کمرشل روڈ پر پہنچ گئی دن کے وقت تو
اس سڑک پر آمد و رفت کا وہ تانتا لگا رہتا ہے کہ الامان
موٹروں۔ گاڑیوں اور آنے جانے والوں کی کثرت سے
تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ لیکن رات کے وقت خاموشی
کا عالم تھا۔ اور کاروبار کی دُنیا اور اس کے کارندے گھروں
اور دکانوں کے اندر گہری نیند سو رہے تھے۔

ہارلے۔ ایک حد تک تو مجھے معلوم ہے۔ کہ کیا کرنا چاہیے
اس کے بعد جو ہو دیکھ لیا جائیگا۔

ناکس۔ آخر کیا؟ تم بُرقعے ساتھ لے آئے ہو ——

ہارلے۔ اور میں کارڈ بھی لے آیا ہوں۔

ناکس۔ کیا تم اس جلسہ میں شریک ہوگے۔ جو میڈم کے
گھر پر ہونے والا ہے۔

ہارلے (مسکرا کر) تم اسے حماقت خیال کروگے لیکن اتنا
تو معلوم ہو گیا ہے۔ کہ اس انجمن کے کارکن آپس میں ایکدوسرے
سے واقف نہیں۔

ناکس۔ یہ کس طرح؟

ہارلے۔ صاف ظاہر ہے کہ جولین اور ہیبرن ایکدوسرے
سے واقف تھے۔ لیکن اگر سارے کارکن آپس میں واقف
ہوتے تو بُرقعوں کی کیا ضرورت تھی۔

ناکس۔ یہ تو درست ہے لیکن شاید ——

ہارلے۔ شاید کسی غیر سے ملاقات کرنے کے لئے بُرقعے
بنائے گئے ہوں۔

ناکس۔ ہاں میرا یہی مطلب ہے کسی اسیر کے مقدمہ کی سماعت کے لئے۔

ہارلے۔ اسیر سے ملنے کے لئے ـــ نہیں۔ ایسا نہیں برقعے اکثر خفیہ انجمنیں استعمال کرتی رہی ہیں لیکن میرے خیال میں اس انجمن کے برقعوں کا استعمال مقدمات کی سماعت نہیں۔ کیونکہ اس انجمن میں مقدمے نہیں ہوتے

ناکس۔ ہاہا۔ گویا ممبران کی جگہ جلسہ میں تم شامل ہوگے۔

ہارلے۔ درست

ناکس۔ لیکن جلسہ میں شامل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ انسپکٹر ریمکس پولیس کا دستہ لئے تیار کھڑے ہوں گے۔ کیوں نہ حملہ کر دیا جائے۔

ہارلے۔ حملہ نہ کرنے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک تو ہمارے پاس حملہ کرنے کے لئے کافی ثبوت موجود نہیں۔ دوسرے جلسہ میں شامل ہو کر بہت سی مخفی باتوں کا انکشاف ہو سکیگا۔ فرض کرو کہ حملہ کر کے ہم نے انہیں گرفتار بھی کر لیا۔ تو کیا وہ کسی راز کا انکشاف کر دینگے۔ ہرگز نہیں۔

ناکس۔ دوسرا برقعہ جولین کی غیر حاضری شبہ کا باعث نہ ہو

ہارلے۔ ریمکس جولین بنیگا۔

ناکس۔ ریمکس کیوں بنیگا آج میں تمہارا شریک کار ہوں

ہارلے۔ لیکن ناکس تم ـــ

ناکس۔ کیا دوسرے مواقع پر میں ناکارہ ثابت ہوا ہوں جو مجھ پر اعتماد نہیں۔ علاوہ ازیں مجھے مشرق کی نسبت کچھ علم بھی ہے۔ اور ریمکس مشرق سے ناواقف محض ہے۔

ہارلے۔ اوہو! میرا یہ مطلب نہیں کہ تم پر اعتماد نہیں میرا مطلب تھا کہ ریمکس محکمہ کا آدمی ہے۔ خیر تم کار آمد ثابت ہوگے تمہیں چلنا۔

ناکس۔ بہت خوب! بڑی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ ہمیں ان کے رسوم و قواعد سے واقفیت نہیں۔

ہارلے۔ ان باتوں کو واقعات پر چھوڑو۔

اتنے میں موٹر لائم ہاؤس کے تھانہ پر ٹھیرا۔ انسپکٹر ریمکس موٹر کے قریب آیا اور بولا۔

ریمکس۔ آہا آپ آگئے۔ آج واقعی کوئی غیر معمولی بات ہے لیکن زون چاوا کے مکان پر نہیں بلکہ کودی کے گھر پر۔

ہارلے۔ کودی کا گھر کہاں ہے؟

ریمکس۔ رسّی بٹنے والوں کے میدان کے پیچھے۔

ہارلے۔ کودی کا گھر زون چاوا کے گھر سے کتنی دور ہے؟ کودی کون ہے؟

ریمکس۔ زون چاوا کا مکان کودی کے مکان کے عین پیچھے ہے کودی پنی فیلڈ میں ملازم ہے چھ سات آدمی اس گھر میں داخل ہوئے ہیں۔ چھ تو یقیناً گئے ہیں خفیہ پہرہ والوں نے اطلاع دی ہے۔

ہارلے۔ وہ اکٹھے گئے تھے یا فرداً فرداً

ریمکس۔ فرداً فرداً۔

ہارلے۔ کیسے لوگ معلوم ہوتے تھے۔

ریکس۔ " معزز۔ بعض کے ہاتھ میں بیگ بھی تھے۔

ہارلے (ناکس سے) سمجھے (ریکس سے) وہ کس طرح داخل ہوئے۔

ریکس۔ یہ معلوم نہ ہو سکا۔ اگر کوشش کی جاتی تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ پہرہ لگا ہے۔

ہارلے۔ موٹر میں آجاؤ صرف دو سنٹ باقی ہیں۔ اپنے آدمیوں سے کہہ دو کہ کولٹ سٹریٹ میں گرجے کے قریب ٹھیریں۔

ریکس نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کی اور موٹر میں ہو بیٹھا۔ موٹر چینی محلہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ریکس بہت متعجب تھا۔ ہارلے نے کہا۔

ہارلے۔ دیکھو صرف ایک واقعہ سے قتل کی واردات سے۔

ریکس۔ قتل؟

ہارلے۔ ہاں قتل کی واردات سے۔ زیادہ تشریح کا وقت نہیں۔ مجھے موقع مل گیا کہ اس جلسہ میں جا سکوں ناکس میرے ساتھ ہوگا۔ پولیس کا دستہ کہاں ہے۔

ریکس۔ تھانہ پر تیار ہے۔

ہارلے۔ جب ہم اندر چلے جائیں جائیں تو اسے قریب لے آنا۔ پستول کا فائر حملہ کرنے کا اشارہ ہوگا۔ آہا ہم پہنچ گئے۔

ریکس۔ بہت اچھا! آخر میڈم ڈی میڈیسی کا سراغ مل گیا۔

ہارلے۔ نہایت اہم سراغ ریکس! وہ چینی مہنت کی قائم مقام ہے۔

ریکس۔ ہائیں! خدا کے واسطے محتاط رہنا۔

ہارلے۔ دیکھا جائیگا۔ ہمیں گھر دکھاؤ اور دوسرے آدمیوں کو تیار رکھو۔

ریکس۔ اس گلی میں تیسرے موڑ پر ایک تنگ کوچہ ہے۔ کوچہ کے اندر ایک لیمپ جل رہا ہے۔ لیمپ کے عین سامنے کودی کے گھر کا دروازہ ہے۔

(باقی باقی)

ہزار فرسنگ

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است	زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است (سعدی)
گرفتم آنکہ مرا در دلی ولیک چہ سود	کہ درمیانِ من و دل ہزار فرسنگ است (خسرو)
ترا دو از نگہِ رہ نورد وادیِ نزع	کہ نیم گام دریں رہ ہزار فرسنگ است (گرامی)

حفیظ

داغِ آرزو

دِل میں ولولے جب تھے آہ کیا زمانہ تھا
یوں خیال ہے گویا خواب تھا فسانہ تھا

ہائے وہ تمنّائیں ہائے وہ خوشی دِل کی
شوق کی وہ بیتابی، اور وہ بیکلی دل کی

جوش تھا طبیعت میں دل میں اِک مسرت تھی
عشق کی لگاوٹ تھی حسن کی محبت تھی

نشہ تھا محبت کا دِل میں جوشِ مستی تھا
حسن کی پرستش تھی ذوق بُت پرستی تھا

کیا پسندِ خاطر تھی، بات مہ جبینوں کی
دینی تھی تڑپ دل کو، ہر ادا حسینوں کی

وہ کسی کے وعدے پر دِل کا جوش بیتابی
رات بھر کی بیچینی رات بھر کی بے خوابی

وہ کسی کی زلفوں کا جال اِک بچھا دینا
وہ کسی کا ہنس ہنس کر بجلیاں گرا دینا

وہ کسی کا رو دینا ہنستے ہنستے باتوں میں
دل کو لطف آتا تھا دلبری کی گھاتوں میں

آہ اب کہاں وہ جوش، آہ اب کہاں وہ بات
ہائے اب کہاں وہ دِن، ہائے اب کہاں وہ رات

دِل کی آرزوؤں پر یاس کا پڑا ڈاکا
مٹ گیا جو نقشہ تھا کھنچ گیا نیا خاکا

اب گلِ تمنّا میں رنگ ہے نہ بو باقی
رہ گیا کلیجے پر "داغِ آرزو" باقی

ہائے چرخ پر گھر کر بدلیاں جب آتی تھیں
بوندیاں مرے دِل میں، آگ سی لگاتی تھیں

رعد کا گرجنا وہ، برق کا چمکنا وہ
آتشِ تمنّا کا سینے میں بھڑکنا وہ

ننھی ننھی بوندوں کا دل پہ کام کر جانا
مری آرزوؤں کا شوق میں اُبھر جانا

باغ میں بہار آنا اور ہنسی وہ پھولوں کی
بُلبلوں کی بیتابی دِل لگی وہ پھولوں کی

صبح کا سُہانا وقت اور اپنی گل چینی
دلکشی وہ پھولوں کی وہ چمن کی رنگینی

اب مگر نہیں وہ جوش اور نہ دل لگی دِل کی
ہو گئی ہے پژمردہ، کِھل کے اب کلی دل کی

جوش کا کہاں پھر رنگ جب نہ ہو لہو دل میں
رہ گیا جلانے کو "داغ آرزو" دل میں

اب کہاں گئی امید اب کہاں گئے ارمان
دل ہے اب بھی پہلو میں ہاں مگر ہے افسردہ
دل میں ہے لہو کچھ کچھ رنگ ہے مگر پھیکا
یاس نے مٹا ڈالا ولولہ جوانی کا
ہائے کیا ہوتے وہ دن جوش جبکہ دل میں تھا
ہائے کیا ہوتے وہ دن جب سرور تھا دل میں
ہر گھڑی مسرت کا اک سماں نظر میں تھا
بات جو میسر تھی اب نہیں رہی باقی
اب نہ وہ امنگیں ہیں، اب نہ وہ تمنا ہے

یاس کی حکومت ہے، دل میں ہیں غم و حرمان
دل میں آرزوئیں ہیں ہاں مگر ہیں پژمردہ
درد ہے کلیجے میں حال ہے بُرا جی کا
کھو دیا ستمگر نے لطف زندگانی کا
دُور تھی یہ بیہوشی ہوش جبکہ دل میں تھا
شادی و مسرت کا اک وفور تھا دل میں
لطف زیست کا ساماں ہائے اپنے گھر میں تھا
سچ یہ ہے نہیں کچھ بھی لطف زندگی باقی
یاس رہتی ہے دل میں رنج و غم کا پہرا ہے

پھر رہی ہے اے احسن یاس چارسو دل میں
رہ گیا فقط باقی "داغ آرزو" دل میں

احسن سمبھی

کشتیِ حیات

کشتیِ حیات خیالات کے اتھاہ سمندر میں تیر رہی ہے۔ آرزوؤں کی آندھیاں۔ امیدوں کے طوفان کرۂ ربادِ ہانول سے ٹکراتے ہیں۔ یاس اور ناکامی کی چٹانیں سدِ راہ ہیں۔ ہمت کے چپو کام نہیں دیتے۔ ناخدائے عشق صرف تخیل کی دوربین کے بھروسے پر مسرور ہے۔ دُور حدِ نگاہ سے پرے ایک آباد جزیرہ یقین کے دھندلکے میں ملفوف نظر آرہا ہے۔ ڈانوانڈول حوادث کے تھپیڑے کھاتی ہوئی کشتیِ حیات، ساحلِ مقصود تک پہنچتی ہے۔ مگر اس حالت میں کہ ایک تختہ بھی باقی نہیں۔

حفیظ

طبقات الشعراء پر ایک نظر

شعراء اُردو کا یہ تذکرہ بھی قدیم ہے ۱۸۴۸ء میں تالیف کیا گیا۔ اس کے مؤلف منشی قدرت اللہ صدیقی المتخلص بہ شوق ہیں۔ موضع موئی جو اُن ایام میں توابع سنبھل (مراد آباد) تھا۔ وہاں کے رہنے والے ہیں۔ جس طرح دوسرے تذکروں میں حالات و واقعات میں کوتاہ قلمی سے کام لیا گیا ہے اور نفس شاعری میں دو چار سطریں بھی نہیں ہیں۔ اُسی طرح یہ تذکرہ بھی ہے کہ شاعروں کے اصلی واقعات و حالات پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس زمانہ میں واقعات اور حالات کا ملنا آسان نہ تھا۔ تو بیشک یہ صحیح ہو سکتا ہے۔ مگر اس کا یہ جواب ہے کہ جن شاعروں سے خود صاحب تذکرہ ملے ہیں۔ اور برسوں ملاقات رکھی ہے۔ خاندانی میل جول بھی تھا وہاں کیوں حالات میں اس قدر بخل برتا گیا۔

(چنانچہ اسی تذکرہ میں صاحب طبقات الشعراء نے لکھا ہے کہ "برسوں ملاقات رہی ہے۔ اور مشاعرہ کی صحبتیں بھی رہا کی ہیں)

اگر اس کا کچھ بھی جواب ہو سکتا ہے۔ تو یہ ہے۔ کہ اس زمانہ میں چونکہ ایسے واقعات سامنے کے ہوتے تھے۔ جن کو یہ بوجہ انکسار و عجز بالکل معمولی واقعات حقیر و پوچ سمجھتے تھے۔ پھر کس طرح وہ چھوٹے بڑے واقعات لکھتے اور یہ رونا ایک زمانہ سے ہے۔

اس عجز و انکسار نے جو مسلمانوں پر جاری و ساری ہے ان کو خواہ مخواہ کاکاہل بنا دیا۔ اور اس کی وجہ سے ایک عظیم الشان تصنیف و تالیف اور بکار آمد ضروری امور کا سرمایہ عدم کا عدم ہی ہیں رہا۔ اور یہ اخلاقی عیب ابتک ہر قدیم شخص میں بطور یادگار موجود ہے کہ کر تو بہت کچھ سکتے ہیں۔ مگر موقع اور ضرورت پر یہی کہتے ہیں۔ کہ مَیں کس قابل ہوں۔ مَیں کیا چیز ہوں وغیرہ وغیرہ

کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی وجہ سے علمی سلسلہ ہی میں نہیں بلکہ دیگر معاشرتی تمدنی امور میں بھی خامی رہا کی۔

اور اس امر پر توجہ نہ کی گئی۔ کہ اپنی لیاقت اور استعداد کا نمونہ پیش کرتے۔ خواہ وہ کتنا یا کسی حیثیت کا ہوتا۔ غرضکہ یہ ایک جداگانہ عنوان سے مضمون لکھنے کے قابل ہے ہم یہاں اسی قدر لکھ کر آگے بڑھتے ہیں۔ کہ جن واقعات کا ہم تک پہنچنا ضروری تھا۔ وہ اس عجز و انکسار کی نذر ہُوا کئے اور ہو رہے ہیں۔ گو ایسے واقعات اُس زمانہ میں غیر مفید ہوں۔ لیکن آگے وہی بکار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ اور انہیں

سے عمدہ عمدہ نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

طبقات الشعرا کے مؤلف نے جو اپنے حالات میں چند سطریں لکھی ہیں۔ ہم وہ یہاں اپنے اس بیان اور تحریر کے ثبوت میں بجنسہٖ پیش کرتے ہیں۔

"متوطن موتی۔ عملہ قصبہ کابر۔ توابع سرکار سنبھل۔ ایں چند ابیات داہیات۔ از نتائج فکر ناقص ایں مؤلف است اگرچہ قابل نوشتن و درج نمودن کتاب نبود۔ فاما محض برائے خاطرداشت بعضے یاران۔ و داخل شدن در زمرۂ سخن سوران نوشتہ شد۔ امید کہ بنظر ہر صاحب سخن کہ در آید از نظر شفقت بکشاید۔ بدعاء خیر یاد نماید۔ از دوست"

ان چند سطر عبارت میں سوائے عجز و انکسار اور کیا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ خود کس خاندان سے ہیں۔ اور خاندانی لوگ کون کون مشہور گزرے ہیں۔ خود کہاں لکھا پڑھا استعداد کیسی ہے۔ شاعری میں کس کے شاگرد یا مقلد ہیں غرض کچھ تو لکھتے۔ کچھ بھی نہیں لکھا۔

بعض طبیعتیں ایسی بھی دیکھنے میں آتی ہیں کہ ساری کتاب کا ماحصل اپنی ذاتی رام کہانی سے بھرا ہوا ہے۔

لیکن زاید حصہ ایسے حضرات کا ہے۔ کہ جہاں انہوں نے اپنے ساتھ عجز و انکسار کا پہلو اختیار کیا ہے۔ وہاں دوسروں کو بھی شامل کرلیا ہے۔ اور اس وقت ہم ڈھونڈھتے ہیں۔ اور پتہ لگاتے ہیں۔ تو کتابوں کی کتابیں سادی اور کوری کی کوری نظر آتی ہیں اور اصلی فن (تاریخ) مفقود پاتے ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کی اس خاص صنف میں خصوصیت سے شہرت ہے۔ اور ان کے عربی کارنامے شاہد۔ اور ایسے ہیں جن کو دوسرے نہایت فخر و مباہات سے دیکھتے ہیں۔ مگر یہاں گنگا کا پانی پیکر سب محو کردیا۔

اس تذکرہ زیر نظر میں ابتدا سے انتہا تک یہی روش ہے۔ کہ کسی کا حال ایسا نہیں ہے جس سے تھوڑے حصہ زندگی پر روشنی پڑ سکے۔ یا ناظر تذکرہ کو تشفی ہو۔

طبقات الشعرا اس وقت ایک سو چالیس برس کی تالیف ہے۔ جس میں تقریباً ( ) شاعروں کے کلام کا نمونہ جمع ہے۔ اور ایک شعر سے اسی۔ نود۔ سو سو۔ تک انتخاب کئے گئے ہیں۔ سترہ سطری ہر صفحہ کے لحاظ سے سولہ جزو سے زاید ہے۔ اور پانچ طبقوں پر منقسم ہے۔ صرف چوتھے طبقہ میں پانچ مقالے ہیں۔ ان سب کی تفصیل بالاختصار یہ ہے۔

طبقہ اوّل۔ کل بیس شاعر ہیں۔

امیر خسروؒ۔ ولی گجراتی (معروف دکنی) سعدی (مشہور دکنی) غزلت۔ ملا نوری۔ فخری۔ میر عبداللہ تجرد۔ عنایت میرزا عطا۔ یونس۔ نظرت (مرزا معز) میر جعفر زٹلی۔ بیدل (مرزا عبدالقادر) فضلی۔ سراج دکنی۔ احمد گجراتی۔ مرزا قاسم شعوری۔ ضیائی۔ ہاتفی۔

اس طبقہ اول کے کل شعراء کے تخلص و نام لکھ دیئے ہیں لیکن ہر طبقہ کے ساتھ اگر لکھ دیئے جاتے تو ایک طویل فہرست ہوجاتی - بایں وجہ ہم تعداد شعراء اور اس طبقہ کے چند مشہور شاعروں کے تخلص پر اکتفا کرینگے - تاکہ ہر طبقہ کی ترتیب صحیح طور پر معلوم ہوجائے -

طبقہ دوم - کل اکیس شاعر ہیں - مشہور و معروف یہ ہیں -

آبرو - ناجی - مضمون - یکرنگ - احسن - سجاد - حاتم - کمترین -

طبقہ سوم - کل پچاس شاعر ہیں - منجملہ ان کے مشہور یہ ہیں :-

مظہر - آزاد - حشمت - فغاں - یقین - تاباں - خاکسار - میر تقی میر - رفیع السودا - درد - قائم - سوز - بیان - فقیر - اثر -

طبقہ چہارم - کل ۶۵ شاعر ہیں منجملہ ان کے مشہور یہ ہیں

حیران - حسرت - بقا - ترسان - حسن - نوا - مصحفی - پروانہ

طبقہ پنجم - کل دو سو تین شاعر ہیں اور مشہور یہ ہیں -

آفتاب - سلیمان شکوہ - آصف الدولہ - گنا بیگم - انشاء - تپش - سعادت یار خاں رنگین - افسوس -

اس طبقہ میں پانچ مقالہ ہیں - جن کی یوں تقسیم ہے کہ امراء - نوابان - کہنہ مشق - نو مشق اور عام لوگ علیحدہ علیحدہ تحت مقالہ بیان کئے ہیں -

غرضیکہ یہ تذکرہ باعتبار کلام اور دوسرے تذکروں سے زیادہ جامع اور بسیط ہے - صرف حالات ہی کم ہیں بعض جگہ تخلص ہی لکھ کر کلام شروع کر دیا ہے - اور نام ندارد ہے جہاں نام ہے - وہاں تخلص غائب ہے - اگر اس تذکرہ کے تین حصے کئے جائیں - تو ایک حصہ بمشکل ایسا نکلے گا جس میں تخلص - نام - سکونت - سلسلۂ شاگردی کے اشارے کے سوا اور کچھ نہ ملیگا -

اس زمانہ میں یہ بھی ان لوگوں کی نگاہ میں جو گلہری کی طرح پرانے دھرانے گودڑ سمیٹتے رہتے ہیں - یا یہ کہ ایسی قدیم چیزوں کے قدردان ہیں - بسا غنیمت ہے اور حضرت شوق کی محنت پر مغفرت کی دعا نکلتی ہے - جو کچھ کیا بہت کیا - اور اچھا کیا -

اب کیا ہو رہا ہے - دیکھو تو ؟ اُس زمانہ سے بھی بدتر - "خمخانہ جاوید" کی تدوینی شہرت سے امید تھی کہ سرمایہ بھی ہے - لیاقت بھی ہے - شوق بھی - محنتی آدمی بھی مل گئے ہیں زمانہ بھی ساتھ دے رہا ہے - مگر اس میں بھی یہی رونا ہے - جب ایسا ہے - اور یہ حالت ہے تو آنسو پُچھتے ہیں - اور حضرت شوق مرحوم کی اس محنت کی قدر ہوتی ہے جبکہ جمیع ذرائع بھی مفقود تھے -

اور لو صاحب آبحیات نے اپنے تذکرہ میں ماخذ کا کہیں پتہ نہیں دیا ہے - حالانکہ اس کی فی زمانہ سخت ضرورت تھی - تاکہ ایسے تذکروں اور کتابوں کی یادداشت رہتی -

اور دوسرے مثل میاں حسرت موہانی اپنی لگی بجھاتے۔ اور کار آمد۔ مفید۔ ضروری امور اپنے اپنے موقع سے سج سجا کر پیش کرتے۔ مگر ساری کتاب چھپان ڈالو۔ وہاں کہاں ہو۔ تو ہو۔

آب حیات میں دور پر تذکرہ منقسم کیا ہے۔ اور طبقات الشعرا میں طبقہ پر۔ اب ہم صاحب آب حیات اور صاحب طبقات الشعرا کے مقررہ دور اور طبقہ کا ذیل میں مقابلہ کرتے ہیں۔ کہ ان کے یہاں اسی دور میں کون کون مشہور شعرا ہیں۔ اور اُن کے یہاں کون کون مشہور شعرا ہیں۔ اور کیا ترتیب رکھی ہے۔

طبقات الشعرا

طبقہ اوّل

کل ۲۰ ہیں۔ مشہور یہ ہیں:۔

امیر خسرو۔ ولی۔ عزلت۔ میر جعفر۔ احمد شعوری۔ ضیائی۔ ہاتفی۔ فطرت۔ فضلی۔ یونس۔ بیدل۔ عطا عظام۔

آب حیات

دورِ اوّل

ولی۔ شاہ مبارک آبرو۔ شاکر۔ شرف الدین مضمون۔ یکرنگ کل اسی قدر۔

طبقہ دوم

کل ۲۱۔ صرف مشہور یہ ہیں:۔

آبرو۔ ناجی۔ مضمون۔ یکرنگ۔ احسن۔ سجاد۔ حاتم۔ کمترین۔

دورِ دوم

کل ۳۔ وہ یہ ہیں۔

شاہ حاتم۔ سراج الدین علیخاں آرزو۔ اشرف علیخاں فغاں۔

طبقہ سوم

کل پچاس۔ صرف مشہور یہ ہیں:۔

مظہر۔ آرزو۔ حشمت۔ فغاں۔ یقین۔ تاباں۔ خاکسار۔ بیدار۔ میر تقی۔ رفیع السودا۔ درد۔ قائم۔ سوز۔ بیان۔ فقیر۔ اثر۔

دور سوم

کل سات وہ یہ ہیں۔

مظہر۔ تاباں۔ سودا۔ ضاحک۔ میر درد۔ میر سوز۔ میر تقی میر۔

طبقہ چہارم

کل چھپن[۵۶]۔ مشہور یہ ہیں:۔

حیدر علی حیران۔ جعفر علی حسرت۔ بقاء اللہ بقا۔ بہادر علی ترساں۔ میر حسن۔ نوا۔ مصحفی۔ پروانہ۔ مرزا علی جیرت۔ اکرام اللہ محشر۔ جرأت۔ میر ضیا۔ میر قاسم رقت۔

دورِ چہارم

کل چار اور وہ یہ ہیں:-

جُراَت - میرحسن - انشاءاللہ خاں مصحفی۔

طبقۂ پنجم اور **دورِ پنجم** کا موازنہ بوجہ طوالت ہم بالعمد ترک کرتے ہیں۔ کیونکہ جسقدر رکھا گیا۔ اس سے اندازِ ترتیب ظاہر ہے۔

طبقات الشعراء اور آبِ حیات میں۔ یہ زیادہ فرق ہے اور یہی نسبت۔ دوسرے تذکروں میں بھی فرق کی ہے۔ کہ صاحب آبِ حیات نے ہر دور کے مشہور اساتذہ کو لے لیا ہے۔ اور واقعات و حالات پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ انہیں کا کام اور حصّہ تھا۔ کاش اے مادرِ ہند چند ایسے اور بھی!

آبحیات کے ابتدائی دور کے حصّہ میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ طبقات الشعرا بھی آبحیات کی تدوین کے وقت مؤلف کی نظر سے گزرا ہے۔ اگر ہر دور کے شعراء کی ایک فہرست بھی اس میں شامل کر دی جاتی۔ تو کم سے کم دوسروں کو مفید ہوتی۔ اور وہ اپنی ضرورت پر تلاش کر لیتے۔

اب ہم طبقات الشعراء پر بغرض دلچسپی عام و خاص ایک سرسری نظر اس طرح ڈالتے ہیں۔ کہ جو اشعار اس میں درج ہیں۔ اور وہ دوسروں سے بھی منسوب ہیں۔ صرف اُن کو لکھیں۔ جس سے یہ ظاہر ہو کہ حقیقت میں وہ کس کا شعر ہے۔ یا اس تذکرہ میں کسی شاعر کے تحت میں کوئی شعر درج ہے۔ اور وُہی کسی دوسرے اُستاد کے دیوان میں بھی بجنسہٖ یا بہ تغیرِ الفاظ موجود ہے یا باعتبار شاعری جو ہم کو اچھا معلوم ہوا۔ اس طرح نظر ڈالنے میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ طوالت ہوگی۔ مگر ناظرین اس التزام کے ساتھ اختصار بھی ملاحظہ فرمائیں۔

سراج از شاگردان سیّد حمزہ

تم پر فدا ہیں سارے حُسن و جمال والے
کیا خط و خال والے کیا صاف گال والے

شاہ مبارک آبرو

مشتاق عذرخواہی نہیں آبرو تو کیا ہے؟
یہ روٹھ روٹھ چلنا' چل چل کے پھر ٹھٹھکنا

دیکھو اس شعر میں کیا بات ہے۔ ؎

تمہاری لوگ کہتے ہیں کمر ہے کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے

یہ شعر بہ تغیرِ الفاظ جُراَت کی طرف بھی منسوب ہے چنانچہ جُراَت کہتے ہیں ؎

صنم سُنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

صاحب آبِ حیات نے حاشیہ میں لکھ دیا ہے کہ یہ شعر آبرو کا ہے ؎

اب دین ہوا زمانہ سازی آفاق تمام دہریا ہے
کیا خوب زمانہ سازی سے کس طرح دہریا ثابت کیا ہے۔

رزا لے بھی لگے اب مرد ہونے
چماروں نے کسب پکڑا نری کا

محمد شاکر ناجی

بلند آواز سے گھڑیال کہتا ہے کہ اے غافل
کٹی یہ بھی گھڑی تجھ عمر سے اور تو نہیں چیتتا

عام طور پر بہ تغیر الفاظ یوں مشہور ہے۔

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی

محمد اسمعیل بیتاب از شاگردانِ یکرنگ

تڑپ کر مر گئی بلبل قفس میں نہ ہو بندہ کسی بندے کے بس میں

محمد قائم - قائم

جو سوز عشق کا چرچا وہاں نہیں قائم
تو لینے جاؤنگا کیا میں بہشت میں آتش

شوخی دیکھئے یہ کیا سوز عشق ہے۔ بعض نسخوں میں لینے کی جگہ دینے ہے۔

میر محمد سوز

جان کے کیا بیاں کروں احساں یہ نہ ہوتی تو مر گیا ہوتا
شہرہ حسن سے ازبسکہ وہ محجوب ہوا
اپنے مکھڑے سے جھگڑتا تھا کہ کیوں خوب ہوا

اس شعر کی کہانتک تعریف کی جائے۔

بھلا اور تو اور یہ پوچھتا ہوں کبھی یاد کرتے تھے سو بھی بھلا یا

کسی کے جی میں ہوگا سوز مر جاتے تو بہتر ہے
الہٰی میں مروں کیونکر مجھے تو مر نہیں آتا

غالب مرحوم اپنے رنگ میں فرماتے ہیں

کس سے محرومی قسمت کی شکایت کیجئے ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہوا

دونوں شعروں میں خاص خاص لطف ہے۔

کاہے کو تو گھورتا ہے ظالم کچھ لیکے ترا مکر گئے ہم
بس بس آنکھیں نکال مت۔ واہ؟ ایسے غصہ سے ڈر گئے ہم

یہ سوز مرحوم کا خاص رنگ ہے

یہ جو کھڑا ہے سامنے کہتا ہے مجھ سے یوں
میرا جو بس چلے، اسے کچّا ہی کھائیے
تلوار سونت سونت کے دبکاوتے ہو کیا
بس قبلہ جانے دیجئے۔ غصہ نہ کھائیے

ان دونوں شعروں کے لطف کو دیکھئے

محمد اکرم رضا از مصاحبانِ نواب غازی الدین خاں

یہ داغِ دِل کسی کو دکھایا نہ جائیگا اس آبلہ کو ہاتھ لگایا نہ جائیگا

صابر سرہندی

صابر یہ بات جس نے کہی آفریں اُسے
جب مُنہ سے نکلی بات پرائی ہو جائیگی

آخر کا مصرعہ تو کسی اور کا ہے۔ اور صابر نے اس کا اظہار بھی کر دیا ہے۔ مگر عام طور پر شہرت ہے۔ اور اِسی تذکرہ میں۔

نجم الدین شاداںؔ

کہتے ہیں کہ

شاداںؔ تو راز خفتہ کے تئیں برملا نہ کر

جب منہ سے نکلی بات پرائی ہو جائیگی

شیخ عبداللہ نکہت متوطن بانس بریلی

اس تذکرہ میں کہتے ہیں کہ

ہمدم نہ پوچھ مجھ سے احوال دل کہ کیا ہے

جو بات منہ سے نکلی وہ ہو گئی پرائی

یہ شعر پہلے دونوں اشعار سے صاف ہے

شیخ محمد حاجی حشمتؔ

رباعی

اب تم سے کہوں ؟ جو کچھ ہے مرے دل میں

سب تم سے کہوں ؟ جو کچھ ہے مرے دل میں

پہلے کہہ لو۔ کہ میں یہ کہنے کا نہیں ؟

تب تم سے کہوں ؟ جو کچھ ہے مرے دل میں

یہی رباعی بہ تغیر الفاظ جو تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں ہے۔ احسن اللہ خاں بیاںؔ شاگرد حضرت مظہر کے دیوان میں موجود ہے۔ اور اس سے بہت صاف ہے۔ میرے دل میں خاص لہجہ سے پڑھا جائے۔ اور تیسرے مصرعہ کو غور سے دیکھئے۔

اب تم سے کہوں جو کچھ ہے مرے دل میں

سب تم سے کہوں جو کچھ ہے مرے دل میں

پہلے کہہ لو۔ کہ میں نہ مانوں گا برا

جب تم سے کہوں جو کچھ ہے مرے دل میں

اکرم اللہ محشرؔ بدایونی

آتا ہے کس انداز سے شمشیر کو کھینچے

اس وقت مصور تیری تصویر کو کھینچے

خاص لطف ہے۔ اس وقت مصور۔ خاص انداز چاہتا ہے

تلوار کھینچ! کس کو دکھاتے ہو بانکپن؟

بیٹھے رہو! میں ایسی اداؤں سے ڈر گیا

فضل اللہ بیگ فدویؔ

آوارہ و سرگشتہ۔ نہ دیوار نہ در کے

سایہ کی طرح ہم۔ نہ ادھر کے نہ ادھر کے

یہ شعر اور استادوں کی طرف بھی منسوب اور مشہور ہے۔

مرزا جعفر علی حسرتؔ

ہے کس کا جگر جس پہ یہ بیداد کروگے

لو ہم تمہیں دل دیتے ہیں!! کیا یاد کروگے؟

لفظ "لو" اور "ہم" خاص لہجہ میں پڑھے جائیں

تمہیں غیروں سے کم فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی

غرض اب ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

کسی اور کا یہ شعر اس طرح مشہور ہے۔

تمہیں غیروں سے کم فرصت ہم اپنے غم سے کم خالی

چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

ہوتے ہیں بُت کے بندے برہمن سے راہ کرتے ہیں

حرم کے رہنے والو تم سے عشق اللہ کرتے ہیں

نبض نہ دیکھ اے طبیب ہاتھ لگا اور موا

میری تو وہ شکل ہے آہ چھوا اور موا

آہ چھوا۔ موا خاص لہجہ چاہتا ہے

جرأت

یوں ترے کوچہ میں ہم۔ اور دلِ زار ملے

جوں دلِ افگار سے آ کے دلِ افگار ملے

حال و دل پرسش احوال کو یوں کرتے تھے

آہ۔ بیمار سے جیسے۔ کوئی بیمار ملے

پہلے مصرعہ میں لفظ ’اور‘ زور دیکر پڑھا جائے۔ دوسرے مصرعہ کو آہستگی سے پڑھئے۔ اور دیکھئے کیا بات ہے۔ آخری مصرعہ اور اُستادوں کے یہاں بھی ہے۔

یسین علی خورشید۔ استقامت تلہر

نالہ ہائے جرس کہتے ہیں غافل نہ رہو

ہم تو اے بیخبراں کر کے خبر جاتے ہیں

یہ مضمون اور شعرا کے یہاں بھی پایا جاتا ہے

احمد علی قوت

ہم نہیں واقف کہ کیا اُلفت کی رسم و راہ ہے

رحم لازم ہے کہ ظالم اپنی پہلی چاہ ہے

یہ مضمون بھی اکثر جگہ نظر سے گزرا ہے اور مشہور ہے۔

تسکین خاں خواجہ سرا

کیا خاک ہو صفائی بھلا ہم میں یار میں خط بھی لکھا جو اُس نے۔ تو خطِ غبار میں

یہ مضمون بھی اکثر جگہ دیکھا گیا ہے۔

غلام حسین دکنی۔ استقامت الہ آباد

نظر سے مت ٹپک اس کو کہ نے سنگ و نے گل ہے

ارے اے بیمروت۔ یہ کسی کمبخت کا دل ہے

خاص لطف ہے۔ اور اس مضمون کے اور اشعار بھی نظر سے گزرے ہیں

شیخ غلام کبریا۔ کامل۔ بردوانی

یہ تو وہ نہیں ہے کہ مے جس میں بھری رہتی ہے

شیشۂ دل ہے میاں اس میں پری رہتی ہے

اے میں قربان عجب تیز ہے یہ تیر نگاہ

جس میں سوفار نہ پیکاں نہ سری رہتی ہے

ان طبیبوں سے شفا خاک مجھے ہونی تھی

یہاں مسیحا کی مسیحائی دھری رہتی ہے

میر شبیر علی افسوس

شب جو دم توڑ نے میرا دلِ بیمار لگا

سر ہلانے وہیں عیسے پسِ دیوار لگا

اچھے وقت سر ہلایا۔ اس میں بھی خاص لطف ہے۔ اور کئی معنی نکلتے ہیں۔

سید محمد علی عرش ملیح آبادی مرحوم

حُسنِ بے پروا

چہرۂ گیتی شب تاریک سے تھا پردہ پوش
بے زباں شب کر چُکی تھی ساری دُنیا کو خموش

وادیٔ کہسار میں تھا اِک اکیلا نوجواں
سارے دِن کی دشت پیمائی سے تھک کر نیم جاں

دے رہی تھی اُس کی طاقت اسکو چلنے سے جواب
شب تقاضا کر رہی تھی سو کہ ہے اب وقتِ خواب

تھا چراغ اِک جلوہ آرا لیکن اس کے سامنے
کرلیا پابند اُسے اُس کی کرن کے دام نے

جا رہا تھا ہو کے وہ بے اختیار اُس کی طرف
جا رہا تھا گرچہ تھا با حالِ زار اُس کی طرف

دفعتہً آگے کھڑا آیا نظر اِک شخص اُسے
کوئی راہب تھا کہ تھا دُنیا سے مُنہ موڑے ہوئے

ہمکلام اُس سے ہُوا یوں راہب اس کو روک کر
اے مرے بچّے کدھر کا ہے تجھے عزمِ سفر

ہے یہ وادی پُرخطر آگاہ مَیں کر دوں تجھے
اب نہ چلنا چاہئے ظلمت میں تنہا یوں تجھے

شب بسر کر لے یہیں، ہے پاس ہی مسکن مرا
گر تجھے منظور ہو آ تھام لے دامن مرا

شوق سے نانِ جویں کھا پیال کے بستر پہ سو
دشتِ غربت سے کوئی نسبت نہیں آرام کو

اس نے راہب کی یہ دعوت کر ہی لی آخر قبول
ہو گیا راہب کو آخر اپنے مقصد کا حصول

اپنی کٹیا میں پُہنچ کر اُس نے بھر کر اِک نظر
غور سے مہماں کو دیکھا جب کہ تھا وہ بے خبر

نوجواں کا چہرہ غم اور فکر سے افسردہ تھا
اس کا دِل رنج و الم سے ہو چُکا پژمردہ تھا

میزباں نے لاکھ کوشش کی کہ ہو مہمان خوش
کر سکا لیکن نہ کوئی بھی اُسے سامان خوش

اُس کا گانا اور بجانا رائگاں جاتا رہا
اس کا ہنسنا اور ہنسانا رائگاں جاتا رہا

تھک کے آخر راہب ناکام نے اس سے کہا
"میرے بچّے! تیرے غم اور فکر کا باعث ہے کیا

کیا تجھے غم ہائے عیشِ رفتہ ہیں وجہ ملال
دوستوں کی بے وفائی یا ہے وجہ رنج و غم
یا مگر وجہ الم بیداد و جورِ عشق ہو ؟

گردشِ قسمت نے کر رکھا ہے یوں تجھ کو نڈھال
یعنی قصرِ مہر و اُلفت ہو چکا ہے منہدم
حسنِ بے پروا نے ٹھکرایا ہو تیرے عشق کو

دل ہدف ہو کس لئے غم ہائے عیشِ رفتہ کا؟
کس سے کہئے چرخِ ناہنجار کا یارانہ ہے؟
اے مسافر قیدِ غم سے اپنا دل آزاد کر

نقش بھی جب مٹ چکا ہو پائے عیشِ رفتہ کا
کل جو گھر عشرت کدہ تھا آج ماتم خانہ ہے
اپنے عیشِ رفتہ کو اے نوجواں مت یاد کر

دوستی کیا ہے ؟ فقط اک لفظِ بے معنی ہے یہ!
دوستداری کو نہیں دل اور جگر سے واسطہ
طالبِ مہر و وفا کس سے دلِ دیوانہ ہے

اس کے دعوے ہیں غلط اک لفظ بے معنی ہے یہ
ہاں مگر اس جنس کو ہے مال و زر سے واسطہ
اپنا بھی اپنا نہیں بیگانہ تو بیگانہ ہے

جاں ہے عاشق کی فقط ٹھٹھا اُڑانے کے لئے
تو عبث اے عشق شمعِ حسن کا پروانہ ہے
اے مرے بچے مجھے تجھ پر کمال افسوس ہے

دل ہے اس کا اک کھلونا ٹوٹ جانے کے لئے
حسن کی نظروں میں تو مجنوں ہے اور دیوانہ ہے
مرد ہو کر ہو ترا اس طرح حال افسوس ہے"

کچھ عجب راہب کی باتوں کا ہوا اس پر اثر
اس کے عارض پر دکھائیں حسن نے جو شوخیاں
کیفیت کچھ اور ہی تھی نوجواں کے چہرہ کی
مطلعِ خاور پہ جیسے صبحدم آتے ہیں رنگ
جنسِ نازک سے مگر ملتے تھے اسکے خد و خال

آ گئی سُرخی حیا سے نوجواں کے چہرہ پر
وہ زباں سے اور قلم سے ہو نہیں سکتیں بیاں
دیکھی راہب نے یہ حالت میہماں کے چہرہ کی
اُس کے چہرہ پر یونہیں آتے ہیں اور جاتے ہیں رنگ
حسن گدرایا ہوا اور اُس کی بھیریں چال ڈھال

شک ہوا راہب کو میرا میہماں عورت نہ ہو
مرد سمجھا ہے جسے وہ نوجواں، عورت نہ ہو

اس حقیقت سے نہ کچھ انکار مہماں نے کیا
اپنے عورت ہونے کا اقرار مہماں نے کیا

یوں ہوئی خاتون اپنے میزباں سے عذر خواہ
"رحم کے قابل ہوں سرزد ہو گیا مجھ سے گناہ

آپ کے خلوت کدہ میں یوں مخل ہونا مرا
ہے یہ مجھ غم خوردہ کا بے شبہ بے جا حوصلہ

ایک عورت عفو کی طالب ہوئی ہے آپ سے
بیکسی اس کی سفارش کر رہی ہے آپ سے

گردشِ قسمت پھراتی ہے مجھے یوں در بدر
کہہ نہیں سکتی کہاں آئی ہوں اور جاؤں کدھر

دل کو ہے تسکین کی خواہش وہ بر آتی نہیں
یاس و حرماں کے سوا ہمدم کوئی پاتی نہیں

پردہ بے جا ہوگا شاید ایک دینی باپ سے
آپ اجازت دیں تو اپنا حال کہہ دوں آپ سے

میرے والد وادیٔ تاتن میں تھے جاگیردار
اُن کی دولت کی کوئی حد تھی نہ تھا کوئی شمار

تھا نہ وارث کوئی میرے باپ کا میرے سوا
اور کوئی بیٹی نہ تھی اُن کی کوئی بیٹا نہ تھا

نوجواں لاکھوں مری اُلفت کا دم بھرنے لگے
مجھ سے شادی کے لئے درخواستیں کرنے لگے

اُن میں اک اڈون بھی تھا ہاں بے زباں اڈون بھی تھا
ذکرِ الفت کا نہ اُس نے مجھ سے بڑھ چڑھ کر کیا

اُس کے دل میں آتشِ مہر و وفا تھی جلوہ گر
اُس کے چہرہ پر مگر شرم و حیا تھی جلوہ گر

وہ نہ لایا کوئی تحفہ بے بہا میرے لئے
اس کا تحفہ اس کا سچا عشق تھا میرے لئے

آسماں نے گرچہ بخشا تھا نہ مال و زر اُسے
دولتِ اُلفت ملی تھی سب سے افزوں تر اُسے

اُس کا تحفہ اس کا حسنِ خُلق تھا میرے لئے
تھا یہی اک ارمغانِ بے بہا میرے لئے

صحنِ گلشن میں پھرا کرتا تھا میرے ساتھ وہ
فرطِ اُلفت سے پکڑ لیتا تھا میرا ہاتھ وہ

جب ترانے عشق کے گاتا تھا وہ گل پیرہن
اُس کا نغمہ سُن کے شرماتے تھے مرغانِ چمن

درد اُس کا کر چکا تھا میرے دل پر بھی اثر
میں نے کی اُلفت کی اُس سے پردہ داری ہائے ہائے
اُس کو ٹھکراتا رہا میرا سراپائے غرور
پھول کی پتّی سا اُس کا نازک اور بے لوث دل
نام سے دُنیا کے آخر ہو گیا بیزار وہ
اُس کے دل سے مٹ گئی حرص و ہوائے زندگی
وہ مرے غم میں گیا دُنیائے فانی سے سدھار
سوزِ غم سے جل چکا ہے دل مرا سینہ مرا
ڈال رکھا پاؤں میں ہے بسکہ چکّر عشق نے
اُس کے مرقد کو بالآخر ڈھونڈ ہی پاؤں گی میں

حال اُس کا سُن کے میں ٹھٹّھا اُڑا دیتی مگر
"درد سے اُس کے تھی مجھ کو بیقراری ہائے ہائے"
پاس داریِ محبّت کا نہ تھا مجھ کو شعور
میرے ہاتھوں سے گیا۔ کیونکر کہوں؟ مٹی میں مل
چل پڑا جنگل کو اپنا چھوڑ کر گھر بار وہ
زہر لگتی تھی اُسے آب و ہوائے زندگی
پھر مجھے کیوں اُس کی فرقت میں یہاں آئے قرار
تھا اُسی کے واسطے مرنا مرا جینا مرا
کر دیا ہے مجھ کو اپنے گھر سے بے گھر عشق نے
عالمِ باقی میں جا کر اس سے مل جاؤں گی میں

بول اُٹھا راہب خدا را کہ دو تم نے کیا کیا؟
اُس کی حرکت دیکھ کر وہ محوِ حیرت ہو گئی
ساتھ ہی اُس نے مگر راہب کو یہ کہتے سُنا
تجھ کو میری موت کی بالکل غلط پہنچی خبر

یہ کہا اور اپنے سینہ سے اُسے لپٹا لیا
طیش سے کچھ اور ہی خاتون کی حالت ہو گئی
"جانِ جاں خوش ہو کہ ہوں میں ہی تو وہ اڈون ترا
آنکھ اُٹھا اور دیکھ لے اپنی شبِ غم کی سحر

انجلینا! ڈھونڈنا ازبسکہ تھا مشکل مرا
رہنما تیرا ہُوا بے شبہ جذبِ دل مرا

حامد

کیا تم اس کیفیّت کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے۔ جو کسی حسین کو دیکھ کر مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔ کیا اس وقت میرے چہرے سے انتہائی احتیاج و افلاس کا اظہار نہیں ہوتا۔ کیا میری آنکھیں اس بھوکے فقیر کی طرح جو مدّت کے بعد کسی کریم النفس سے ملا ہو ہمہ تن سوال نہیں بن جاتیں۔

حفیظ

فردوسِ خواب

لڑکپن میں بھی کسی نے اس کو بچہ تصوّر نہیں کیا تھا۔ اور نہ ہی فطرتاً اُس کی ذہنیت میں کوئی نقص تھا۔ بلحاظِ جسم اُس کی ساخت مرغوب و مطبوع تھی۔ وہ محسن اچھی صورت نہیں رکھتا تھا بلکہ غضب کا دلکش تھا۔ اُس کی سیاہ خواب آلود آنکھوں اور اُس کے کاکُلِ پیچاں نے اسے بہت دلاویز بنا رکھا تھا ذہنی اوصاف کے لحاظ سے اُس کی نسبت لوگ یہ رائے رکھتے تھے۔ کہ وہ ایک اچھا صنّاع۔ فوق العادت ذہن اور جدّتِ موفور رکھنے والا ہونہار لڑکا ہے۔ اور وہ اسی قبیل کے اور کمالات بھی اُس کی طرف منسوب کرتے تھے لیکن اسکی کائنات سیرت میں ایک ہلکا سا "ناممکن التعریف" منفردانہ توہم بھی تھا۔ جو اُس کے ہر ملاقاتی کو مضطرب کر دیتا تھا۔

ایک دفعہ اُس کی خوابگاہ سے سگرٹ کی ڈبیہ پائی گئی۔ اور کسی نے اُس پر ملکیت کا دعوےٰ نہ کیا۔ بورڈنگ کے طلبا کو سخت سزا کی دھمکی دی گئی۔ اُس وقت اپنے رفقاء کو جبیت زدہ کرنے کے لئے موہن کھڑا ہو گیا۔

اُستاد موہن صرف تم میرے دارالمطالعہ میں آؤ۔ باقی طلبا کو اجازت ہے کہ وہ چلے جائیں۔

ضرور ہے کہ اس کا معلّم بھی اس کی نسبت کچھ شک رکھتا ہو سگرٹ نوشی کی صرف یہ سزا تھی کہ لڑکے کو فی الفور سکول سے خارج کر دیا جائے۔ اُستاد نے لڑکے پر جرح کی۔ لڑکے نے ہر سوال کا مُسکِت جواب دیا۔

"بیشک مَیں نے یہ کام کیا ہے اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں۔" اُستاد نے نہایت سختی سے بید لگائے۔ موہن نے اُستاد سے اس بے ضابطگی کے متعلق استفسار کیا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ اور کچھ جواب نہ دیا۔

جب موہن کو مکتب سے رخصت ہوئے ایک سال گزر گیا۔ تو اُستاد نے اُس کے دادا کے نام حسب ذیل خط لکھا:۔

"یہ ایک حقیقت ہے کہ موہن کو ہاتھ سے کھو کر مَیں بہت مغموم ہوں۔ ہمارے بورڈنگ میں اس سے بڑھ کر صفائی پسند اور صداقت شعار کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اگر مَیں اس کا کوئی نقص بیان کر سکتا ہوں۔ تو وہ صرف یہی ہے کہ وہ سولہ برس کی عمر میں اسقدر حیرت انگیز طور پر تخیّل پرست کیوں ہے۔ اس کی قابلیت محیّر العقول ہے۔ لیکن اُسے ایسی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے جس سے وہ حقائق حیات کا قدرشناس ہو سکے۔ اگر وہ ایک خیالی شکل ذہن میں قائم کر لے۔ تو اُس کو

کوئی چیز مطمئن نہیں کر سکتی۔ وہ اس اندیشہ تبیل کے لئے جسپر
وہ جم گیا ہو، ہزارہا موادِ عجیبہ کو اپنی انگلیوں سے نکال دیگا۔"

اُس کا زمانہ تعلیم ختم ہوگیا۔ اس کا دادا سرتا پا تجارت تھا
جب دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تجارت کا نام آجاتا تو
موہن نفرت انگیز طریق سے اپنا سر ہلا دیا کرتا۔

موہن (اپنے مخصوص مؤدبانہ اور پُرسکوت لہجے میں)
دادا جان اگر آپ یہی چاہتے ہیں۔ تو میں آپ کے ساتھ
چلنے کو تیار ہوں لیکن مجھے یہ خدشہ ہے کہ میں مفید نہیں
ثابت ہونگا۔ میرا دل تجارت میں نہیں لگتا۔ اور نہ کبھی لگیگا۔
بیشک ہندو فطرتاً تاجر ہوتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ
میں ایسا نہیں ہوں۔ حالانکہ مجھے چاہیئے کہ میں ایسا ہوں۔

دادا۔ "بیٹا اس وہم کو دُور کرو تم تجارت کر سکتے ہو۔ جب
میں تمہاری عمر میں تھا تو میں بھی گیا تھا۔

موہن۔ مجھے معلوم ہے لیکن آپ کو کامیابی ہوئی تھی میں
ناکام رہونگا۔ خیر آپ کے حکم سے میں چلنے کو تیار ہوں لیکن
میرا جانا میری مرضی سے نہیں ہوگا۔ آپ نے مجھے ہمیشہ یہی
فرمایا ہے کہ تجھے اپنی مرضی سے کوئی مشغلہ منتخب کرلینا چاہیئے

یہ بات ایک ضرب تھی جو اُس نے اپنے دادا کے کمزور
زاویہ خیال پر لگائی۔ واقعی اُس کا دادا ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ
"میں تجھے ایسے کام کے لئے مجبور نہیں کرونگا جس کیلئے
تو اپنے آپ کو رضامند نہیں پائیگا۔"

دادا تھوڑے وقفے کے بعد متین لہجہ میں بولا "بہت اچھا
اس کا تصفیہ ہو جانا چاہیئے۔ میرے خیال میں تم نوشت و خواند
کے کھیل کو بہت پسند کرتے ہو۔

موہن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس حال میں کہ اس
کے لبوں پر ہلکا سا نادر الوقوع تبسم تھا۔ "دادا جان میرے
لئے یہ شوق ناگزیر ہے۔ مجھے اس سے عشق ہے۔ اگر آپ
اجازت دیں تو میں یہ کام بخوبی کر سکتا ہوں۔"

دادا (مسکراکر) "یوں کہو کہ میں اس کی وجہ سے فاقہ کشی
کر سکتا ہوں۔"

موہن۔ ہاں کر سکتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ بہت سے
لوگوں کو ایسا کرنا پڑتا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کا
بذاتِ خود تجربہ کروں۔

دادا کی مشتاق آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی
تھیں "بیٹا میں تمہیں چند سالوں کے لئے چھاپے خانے
میں کام پر لگا دیتا ہوں۔ تاکہ تم کام سے واقف ہو جاؤ۔ تم
متواتر یہاں رہو گے۔ تمہارے گزارے کو کافی ہوگا۔ اور تم
فرصت کے وقت لکھنے کی مشق بھی کر سکو گے۔ پانچ برس کے
بعد تمہاری عمر ۲۲ سال کی ہو جائیگی۔ اگر تم ۴۰۰ روپے سالانہ
کمانے رہو گے تو میں تمہیں بقیہ عمر کے لئے خود مختار کر دونگا
پھر تم اس بات کے مجاز ہو گے۔ کہ اپنے پسندیدہ کام میں
مشغول ہو جاؤ۔ اگر تم ناکام رہو گے تو بھی بھیجدئے جاؤ گے

تاکہ وہاں جاکر کام سیکھو۔ اور تجارت پیشہ انسان بن جاؤ۔

موہن کی آنکھیں سرور و لطف سے چمک اٹھیں۔ اور بولا "کیا آپ کی یہی مرضی ہے"؟

دادا۔ بیشک میری یہی مرضی ہے۔ کیا تم میرے ساتھ متفق ہو؟

موہن (جوش و خروش سے اُچھل کر) "واقعی آپ بجا فرماتے ہیں میں دن رات محنت سے کام کرونگا۔

اس رات جب موہن بستر استراحت پر دراز ہونے لگا۔ اُس نے الماری سے ایک چھوٹی سی کتاب نکالی۔ اور اُسے مشتاقانہ تبسم کے ساتھ کھولا۔ یہ کتاب نہایت فرسودہ و بوسیدہ تھی۔ اسے کسی پرانی طرز کے کاتب نے نہایت پھیکی سیاہی سے تحریر کیا تھا۔ اس کے آدھے صفحے غائب تھے۔ لیکن پھر بھی لڑکے کو یہ کتاب ایسی گرانقدر معلوم ہوتی تھی۔ کہ اس کے نزدیک کوئی شخص بھی اس کی قیمت نہیں ادا کر سکتا تھا۔

جن دنوں وہ اپنے دادا کے بالاخانے میں بچّوں کی طرح کھیلا کرتا تھا۔ اور اس کی عمر ۱۲ برس کی تھی۔ اس نے یہ کتاب پڑھی تھی۔ اور شاید یہ بھی اس کے اس مستمر دانہ توہم کا باعث ہو جس کے متعلق اس کے اُستاد نے کئی مرتبہ تذکرہ کیا تھا۔ یہ اِسی کا اثر تھا۔ کہ کتاب کے افتتاحی فقرات اس کے لئے جاذب توجہ ہو گئے۔

"وہاں ایک باغ ہے جس کا نام "خوش منظر باغ"

ہے۔ صبح بہار کی لطیف و درخشاں ضیا باریاں محوِ نشاط و انبساط طیور کی نغمہ پیرائیاں اور فلک پروازیاں آہستہ خرام ندی کی ترنم ریزیاں، محیط و سیاہ بادلوں کی گوہر بیزیاں سلاخوں سے شعاع آفتاب کی جلوہ نمائیاں یہ تمام خوش آئند مناظر اس جلوہ کار باغ کی حسن آرائیاں ہیں۔ اس باغ میں ایک محل ہے۔ جسے "قصر مسرت" کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ "طمانیت" کی محکم و استوار بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے۔ اور اس کی سقف بندی شریفانہ خیالات سے کی گئی ہے۔ اس لئے مصیبت اور حسرت کے طوفان بے سود اس سے ٹکراتے ہیں۔ کیونکہ اس محل پر امید اور عشق کے تختے چڑھے ہوئے ہیں یہاں دو ملائم پودے ایسے ہیں۔ جو تمام سال مہکتے رہتے ہیں۔ اور ایسے شاندار ہیں۔ کہ موت بھی انہیں تباہ و برباد نہیں کر سکتی۔ شجاعانہ عزائم کا وسیع اور محصور راستہ اس محل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس راستے کے پتھر ثباتِ عزم کی ٹھوس چٹانوں سے تراشے گئے ہیں۔ اگر تم ان کے نزدیک جاکر ان کو غور و تعمق سے دیکھو گے تو وہ تمہیں کھردرے اور غیر متوازی نظر آئینگے۔ اگر تم ان کو ذرا فاصلے سے دیکھو گے تو وہ بالکل نرم اور پیوستہ دکھائی دینگے۔ اور ایسا معلوم ہوگا کہ ہر ایک اپنا فرض بدرجہ اتم انجام دے رہا ہے۔

اس باغ کے پھول بھی ایسے ہیں۔ کہ ہر جگہ نہیں اُگا کرتے۔ ان پھولوں کو مسرت، جذبات علم آرزو اور حسن کے

نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چونکہ انکی پرداخت کی جاتی ہے اس لئے وہ لطافت باغ میں اضافہ خوشبو کا باعث ہوتے ہیں۔

اس میں تین طویل القامت درخت ایسے ہیں۔ جو تاریک اور پژمردہ سایہ ڈالتے ہیں۔ ان کو درختانِ تاسف اور اشجار یاس و الم کہا جاتا ہے۔ چونکہ لوحِ تقدیر پر یہی حروف کندہ تھے کہ ایسے درخت سر "خوش منظر باغ" میں پائے جائیں۔ اس لئے یہ بھی تحریر کر دیا گیا تھا۔ کہ جن کو اس باغ میں سکونت پذیر ہونے کی اجازت ملے۔ وہ مشیت ایزدی کی پُر لطف تکمیل کا حظ انہی درختوں کے سایہ میں حاصل کر سکتے ہیں۔

خوش منظر باغ کی آنکھیں ہمیشہ اُن اشخاص پر لگی ہوئی ہیں۔ جو صفائی اور استقلال کے ساتھ اس پر نظر جمائے رہتے ہیں۔ جو شاہراہ حیات سے ذرا بھی ادھر اُدھر نہیں ہٹتے۔ اور وہی اس استحقاق کے مدعی ہو سکتے ہیں کہ انہیں وہاں آباد ہونے کی اجازت دی جائے۔"

کتاب کے افتتاحی فقرات اسے دنیائے تخیل کے ایک خاک آلود مکان میں لے گئے۔ جس کے چاروں طرف کوڑا کرکٹ پڑا تھا۔ وہاں وہ ایک لڑکے کی داستان پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔ جو غالباً دوسرے لڑکوں کی طرح نہیں تھا۔" ایک لڑکا جو ہیم اضطراب انگیز خواہشات اور مرضیات کا طالب تھا۔ جو اُس چیز کا خواہشمند تھا جس کو نہ وہ خود جانتا تھا۔

اور نہ ہی اسے خیال تھا کہ کوئی اس کو سمجھانے یا واضح کرنے کے قابل ہو سکیگا۔

موہن اس غیر تسلی بخش کتاب کے سہارے اپنی تجویز کی تکمیل کے لئے "خوش منظر باغ" کی تلاش میں نکلا۔ جو یقیناً کمال توجہ سے مصروف جستجو رہنے والوں کے لئے تھا۔ یہ بھی تقدیر کی ایک ادا تھی۔ کہ چند سال میں اُس نے اپنے آپ کو اُسی باغ کے کنارے پایا۔ وہ یہاں صاف طور پر محل کی چھت اور اس کی دہلیز پر نسترن و یاسمن دیکھ سکتا تھا۔ اسکے اندرونی حصّے میں برف سے زیادہ سفید دیواریں سیتا سپاری کی شہتیریاں اُن کا چمکتا ہوا تانبا اور پیتل آنکھوں کو دعوت نظارہ دے رہے تھے۔ اور وہ کھڑکیوں سے آفتاب کی کرنیں ملاحظہ کر سکتا تھا۔ وہ وسیع اور شاندار راستے کے ہر پتھر کو پہچانتا تھا۔ اُس گچ اور چونے کو بھی جانتا تھا۔ جن سے یہ پتھر پیوستہ تھے۔ وہ رنگین پھولوں سے آشنا تھا۔ جو اس راستے کے دونوں رُخوں کو محصور کئے ہوئے تھے۔ اس محل کے عقب میں وہ ایک سرسبز اور نرم قطعہ زمین کا نظارہ کر سکتا تھا۔ جس پر تین درخت دکھائی دیتے تھے۔ گردش زدہ آفتاب وادی کے اس پار غروب ہو رہا تھا۔

جب وہ بالغ ہوا تو اُس کے پروردہ تخیل باغ میں یکایک ایک شکل دکھائی دی۔ اس شکل نے اُسے "غیر ممکن التعریف" آرزوؤں اور تمناؤں سے معمور کر دیا۔ یہ تصویر بہت جلد اس

باغ کا ایک جزو لاینفک بن گئی۔ وہ حیران تھا۔ کہ وہ کیوں پہلے نہیں دکھائی دی۔ اُس نے اس شکل کو "محبوبۂ خواب" کے نام سے موسوم کیا۔ جب وہ اپنے باغ کے خواب میں تھا۔ وہ شکل ایک رات اس کے سامنے نمایاں ہوئی۔ یہ شکل نازک اور لطیف تھی۔ اس کی صباحت عدیم المثال تھی۔ نوجوان کے طفلانہ تخیل میں یہ بات جم گئی۔ کہ یہ باغ "محبوبۂ خواب" کے بغیر کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ توہم نے اسے یقین دلا دیا۔ کہ اس باغ کی ہستی بس اسی کے دم قدم سے ہے جب وہ دہلیز پر کھڑی تھی۔ یہ اُسے دیکھ رہا تھا۔ مگر جونہی وہ اُس سے ہمکلام ہونے کے لئے بڑھا۔ وہ بیدار ہو گیا لیکن بعد ازاں "محبوبۂ خواب" نے اس کے گلشن دل میں باقاعدہ جگہ حاصل کر لی۔

(۲)

موہن گاڑی سے اُتر کر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ اور مرجھائے ہوئے چہرے سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس نے قلی سے چلا کر پوچھا۔ اب کیا ہوگا۔

قلی۔ آج کوئی اور گاڑی جنکشن کی طرف نہیں جائیگی۔ آپ کو چاہیئے تھا۔ کہ پیچھے ہی گاڑی تبدیل کر لیتے۔

موہن۔ خیر یہ تو میں نے نہیں کیا۔

قلی۔ اب آپ کیا کرینگے۔

موہن نے سر ہلا دیا اور زرّیں اور ارغوانی پہاڑیوں کو دیکھنا شروع کیا۔ چھوٹے سے صندل کے درختوں کے جھنڈ پر نگاہ ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں خواب آلود تصورات سما گئے اور وہ یہی مظاہرات تھے۔ جنہوں نے برسوں پہلے اسی کے داداکو بہت کچھ اضطراب میں ڈال دیا تھا۔

قلی۔ آپ کو ایک گاڑی مل سکتی ہے۔

موہن نے چونک کر کہا "ہے ایشور۔ میں تیرا شکرگزار ہوں" پھر اُس نے قلی کو کچھ پیسے دیئے۔ اور سیٹی بجاتا ہوا اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔

مطلع صاف اور آفتاب ضیا بار تھا۔ وہ ارغوانی پہاڑیوں سے نکلکر ایک ندی کے کنارے ٹھہر گیا۔ یہ ندی چھوٹے چھوٹے سنگریزوں پر سے ایک موسیقی رواں کی طرح گزر رہی تھی۔ اُس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اور کہا۔ "صحت اور طمانیت نہایت پسندیدہ چیزیں ہیں۔ لیکن اچھا یہی ہے کہ زندگی میسّر ہو۔"

جب وہ کچھ دُور جنگل میں پہنچ گیا تو اُس نے محسوس کیا کہ وہ جگہ جہاں وہ چل رہا ہے۔ اس کی دیکھی ہوئی ہے۔ اسے تھوڑی دُور کوئی چیز گزرتی معلوم ہوئی جس سے فضا میں سنسناہٹ پیدا ہو رہی ہے۔ اُس کے سر پر کوئلیں کُوکُو کر رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھا۔ پھر یکایک ٹھہر گیا۔ اُس نے دیکھا کہ میں ایک ایسے راستے پر چل رہا ہوں جس پر گھاس اُگی ہوئی ہے۔ اور بہت کم چوڑا ہے کہ اُس پر صرف ایک چھکڑا

چل سکتا ہے۔ یہ راستہ اُسے عجیب وغریب معلوم ہُوا۔ وہ کچھ عرصہ اس راستے کی طرف ٹکٹکی باندھے اپنے دماغ کو ٹٹولتا رہا۔ اُس پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی۔ اور اس جوش کے عالم میں اُس نے اپنے جزدان کو اُلٹنا پلٹنا شروع کیا۔ اُس نے ایک چھوٹی سی فرسودہ کتاب نکالی اور مغلوب جذبات ہوکر اس کی ورق گردانی شروع کردی۔ یہاں تک کہ وہ آخری ورق تک پُہنچ گیا۔

"ایک دن وہ زریں اور ارغوانی پہاڑیوں میں گھومتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ایک جنگل میں پُہنچ گیا۔ کوئلیں اُس کے سر پر اُڑ رہی تھیں۔ اور کُوکُو کر رہی تھیں۔ اور نیچے اُترتے ہُوئے وہ ایک ایسے راستے پر پُہنچ گیا۔ جس پر گھاس اُگی ہُوئی تھی۔ اور چھکڑا جنگل سے گزر رہا تھا۔ آخرکار اُسے معلوم ہوگیا کہ یہی راستہ "خوش منظر باغ" کی طرف رہنمائی کرتا ہے"۔ وفورِ اشتیاق میں اُس نے اور بڑھنا چاہا۔ مگر۔۔۔

یہاں پر صفحہ کتاب بکلّیت ختم ہوگیا۔ اور بقیہ اوراق گم تھے۔ کچھ عرصہ تک موہن بے حرکت کھڑا رہا۔ کتاب اس کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ اُس کا دل نہایت تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ اپنے خوابہائے لیل ونہار میں وہ کئی مرتبہ اُس جنگل میں کھڑا ہوچکا تھا۔ "یہ ناممکن ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا"۔ کتاب کو نہایت مضبوطی سے پکڑ کر اُس نے چھکڑے کے راستے پر چلنا شروع کردیا۔ جب وہ اس راستے پر چل رہا تھا۔ تو وہ مبہم طور پر اس جذبہ سے آگاہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ حیرت انگیز طریق پر ایک قسم کی فرحت محسوس کر رہا ہے۔ اگرچہ اُس نے اپنے دل کو بہت سمجھایا۔ کہ یہ شعور یا احساس بالکل غیر حقیقی لغو اور ناممکن ہے۔ پھر بھی اُس کا دل ہتھوڑے کی طرح ضربیں لگاتا رہا جب اُس نے دل پر خاص دباؤ ڈالا۔ تو معلوم ہُوا کہ وہ کسی چیز کی اُمید کر رہا ہے۔ اس کو کسی بات کی توقع ہے۔ وہ مشکل سے خیال کرسکا۔ کہ وہ کسی چیز کی توقع کر رہا ہے لیکن۔۔۔

اُس وقت اس کے لبوں سے یکایک ایک چیخ نکلی۔ اور ایک مقام پر منجمد ہوکر کھڑا ہوگیا۔ ایک منٹ کے لئے نہ تو وہ جنبش کرسکا۔ اور نہ کوئی لفظ مُنہ سے نکال سکا کیونکہ جب راستے کا موڑ دکھائی دیا۔ تو وہ معلوم ہُوا کہ وہ جنگل کے کنارے کھڑا ہے۔ اُس کے سامنے ایک سرسبز وادی پھیلی ہُوئی ہے۔ اور پہلو کے قریب ہی ایک چھوٹا سا سفید دروازہ ہے۔ فی الفور اس کے دل میں یہ بات پیدا ہُوئی کہ وہ "خوش منظر باغ" میں پُہنچ گیا ہے۔

درماندہ آدمی کی طرح وہ آہستہ آہستہ دروازے تک پُہنچا۔ اور وہاں اُس شخص کی طرح کھڑا ہوگیا۔ جو بڑی مشکل اور سعی کے بعد اپنی مطلوبہ حفاظت گاہ میں پُہنچ گیا ہو۔ یہ وہی منظر تھا جس کی تصویر اس کے تخیل نے کھینچ رکھی تھی۔ وہی وسیع شاندار راستہ وہی پھل پھول اور درخت

وہی سرسبز وادی۔ غرضیکہ وہ ایک منٹ میں ان سب چیزوں
کو پہچان گیا جنہیں وہ پہلے عالم تخیل میں دیکھ چکا تھا۔ یہاں
ایک محل بھی تھا۔ دہلیز بھی تھی اور یاسمن و نسترن بھی اپنی بہار
دکھا رہے تھے۔

جب اس کی "محبوبۂ خواب" اس کے سامنے آئی تو اس
نے کوئی تعجب نہیں کیا۔ کیونکہ اسے ایک قسم کا وجدانی یقین تھا
کہ اس کی منتظر ضرور اس کے سامنے آئیگی۔ اسکی "محبوبۂ خواب"
اسی ہیئت و کیفیت اور پوشاک کے ساتھ اس کے روبرو
جلوہ آرا تھی۔ جس میں اس نے پہلے کئی بار دیکھا تھا۔

موہن کو محسوس ہوا کہ وہ اس کے چھوٹے سے پاؤں پر
سجدہ ریز ہونا چاہتا ہے۔

"کیا تم کملا کو دیکھنا چاہتے ہو؟"

موہن کو اس کی آواز کوئل کی کوکو معلوم ہوئی۔ اور اس
نے کوشش کرکے اپنے آپ کو بڑھایا "نہیں" "نہیں"
آپ مجھے گستاخ خیال نہ فرمائیں۔ میں آپ کے محل اور باغ
کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں یہ جگہ خواب میں تو ضرور دیکھ چکا ہوں
لیکن یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ کہ ایسی جگہ حقیقت
میں بھی ہو سکتی ہے۔

لڑکی نے اسکے متانت نما لہجے اور اس کی بیباکانہ نظربازی
پر مسکرا دیا۔ "میں بہت خوش ہوں کہ آپ اسے پسند کرتے ہیں
جب کوئی اس کی تعریف کرتا ہے۔ تو میں بہت مسرور ہوتی ہوں

موہن نے دیکھا کہ ایک سفید بالوں والی بڑھیا لکڑی کے
سہارے راستے پر سے چلی آرہی ہے۔

موہن۔ آپ میری بظاہر گستاخی کو معاف فرمائیں۔ اور مجھے
اجازت دیں کہ میں اس بڑھیا سے گفتگو کر سکوں۔

لڑکی نے خوبصورتی سے منہ بنا کر کہا "نہیں نہیں اس
میں گستاخی کی کونسی بات ہے۔"

بڑھیا کے بشرے میں قدرے سختی تھی۔ اس کی دوربین آنکھوں
نے موہن کو اچھی طرح گھورا۔

موہن نے بہت جلد اس بات کو بھانپ لیا اور مؤدبانہ
طریق سے کہا۔ مجھے ضرور معافی کا خواستگار ہونا چاہیئے۔
میں یہاں مسافر ہوں اور اس کوشش میں ہوں کہ پہاڑیوں
سے پرلی جانب کا راستہ دریافت کر سکوں۔ میں آپ کے
باغ میں اتفاقاً آگیا ہوں۔ اس کی دلربائی ہی میرا عذر ہے۔
اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں کھڑا ہو کر اس کا نظارہ کر سکوں۔
اس کے پرخلوص اور باادب لہجے نے بڑھیا کو کسی حد تک
متاثر کر دیا۔ اس نے پوچھا۔ "شاید تم راستہ بھول گئے ہو؟"

اس نے اپنے نادرالوقوع تبسم سے کہا۔ میں اس جرم
کا مجرم بھی نہیں۔ کیونکہ جب میں آج صبح گھر سے روانہ ہوا۔
تو میرے سامنے کوئی منزل مقصود نہیں تھی۔ غلطی نے مجھے
اسٹیشن پر اتار دیا۔ اور میں نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر ان دلاویز
پہاڑیوں کی سیاحت شروع کر دی۔ اس وقت معاً اسکے

دل میں یہ خیال آیا۔ شاید وہ یہ سمجھتی ہو کہ وہ خواہ مخواہ ان کے یہاں مقیم ہونا چاہتا ہے۔

بڑھیا نے کہا۔" میں آپ کی خدمت میں چائے پیش کرتی ہوں۔ میں نے ایک نظر میں دیکھ لیا ہے۔ کہ آپ کوئی معمولی سیاح نہیں ہیں۔ آپ دور سے آئے ہیں تھک گئے ہونگے

موہن۔ میں اس مداخلت کے لئے معافی کا خواستگار ہوں لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لڑکی نے قطع کلام کرتے ہوئے جلدی سے کہا" بیشک تھک گئے ہونگے۔ تقریباً سات میل کا سفر طے کیا ہے"

پھر وہ ٹھہر گئی اور یکایک مسرور ہوگئی لیکن اس کو یہ بات مشکل سے محسوس ہوئی۔ کہ اُس کا سرور کس وجہ سے ہے۔

موہن نے دیکھا کہ وہ گھبرا گئی ہے۔ اُس کی گھبراہٹ دور کرنے کے لئے نہایت وضاحت سے کہا۔" میں حیران ہوں کہ آیا مجھے یہاں آرام کرنے کے لئے کوئی جگہ بھی مل سکیگی یا نہیں۔ اس پر بڑھیا نے کہا چلئے مکان کے اندر چلیے

یہ کہکر بڑھیا نے محل کا دروازہ کھول دیا۔ اتنے میں موہن نے کہا۔" کیا مجھے اجازت ہے۔ کہ میں اپنا تعارف کراؤں۔ میرا نام موہن ہے۔ اور میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بڑھیا نے ٹوک دیا۔ کیا تمہارا نام موہن چندر ہے؟ تمہارا دادا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

موہن نے نرمی سے کہا" وہ گزشتہ سال فوت ہوگیا۔ میں ایام طفولیت ہی سے اُن کے یہاں رہتا ہوں۔ پھر تینوں نے چائے نوش کی۔

موہن اسے ایک عجیب و غریب خواب خیال کر رہا تھا لیکن یہ خواب نہ تھا۔ وہ اپنے گلشن خیال کے اسی باغ میں بیٹھا ہوا جس کے وہ صرف خواب دیکھا کرتا تھا۔ ایک نوجوان عورت کا جام دلربائی نوش کر رہا تھا۔ اُسے محسوس ہوا۔ کہ تقدیر کا غیر مرئی ہاتھ اُسے گردش طویل کے بعد یہاں لے آیا ہے۔ آخرکار اس نے جانے کا ارادہ کیا۔

سُنہری سُورج ارغوانی پہاڑیوں میں غروب ہو رہا تھا۔ کوئلیں درختوں پر کوکو کر رہی تھیں۔ اُس کی چھوٹی سی کتاب کے یہ الفاظ" کیونکہ یہ تقدیر کا لکھا ہے" اسے دوبارہ یاد آگئے۔ اور جب وہ سفید دروازے پر ایک دوسرے کو الوداع کہہ رہے تھے۔ اُس کے دل میں صرف طمانیت اور مسرت کا احساس تھا۔ اُس وقت لڑکی نے نہایت شرم وحیا سے اسے خطاب کیا۔" آپ پھر بھی تشریف لائینگے۔

لڑکی کا چھوٹا سفید ہاتھ ایک لمحہ کے لئے موہن کی رگ رگ میں برقی رو پیدا کر گیا۔

موہن نے نرمی سے کہا۔ میں دوبارہ آؤنگا۔

اس واقعہ کے ایک ماہ بعد اُس کو پھر کملا کے باغ میں یکجا بیٹھنا نصیب ہوا۔ وہ محبت کی سُنہری زنجیریں جو اُس کے گلے میں پڑ گئی تھیں۔ روز بروز زیادہ مضبوط اور کڑی ہوتی گئیں۔ اُس

نے کتنی مرتبہ یہ چاہا۔ کہ اُسے اُن واقعات سے آگاہ کر دے کہ کس طرح وہ "خوش منظر باغ" کی جستجو میں رہا۔ اور کس طرح اُسے "محبوبہ خواب" کی تلاش تھی۔ اور کس طرح اُس کی قسمت نے یاوری کی۔ اور آخر کار اُسے حاصل کر لیا۔ لیکن اس نے عمداً ان امور کے اظہار سے اجتناب کیا۔ کیونکہ اُسکو اندیشہ تھا کہ کہیں یہ شیریں ادا محبوبہ بچھڑ نہ جائے۔

موہن۔ مَیں تمہارے ان درختوں کو نہایت محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ یہ درخت باوجودیکہ یاس انگیز، اور پُراسرار ہیں۔ پھر بھی بڑے خوبصورت اور پُرسکون دکھائی دیتے ہیں۔

کملا۔ مَیں بھی ان کی نسبت یہی خیال رکھتی ہوں۔ برسوں کی بات ہے۔ کہ مَیں نے ان کو یاس، تاسّف اور الم کے نام سے موسوم کیا تھا۔

موہن یہ سُنکر حیران ہو گیا۔ کہ یہ محبوبہ جو اس کے نصف اسرار کا پتہ دے رہی ہے۔ وُہی ہے جس کی اُسے تلاش ہے یہی اُس کی محبوبہ خواب" ہے۔ اور یہی وہ محبوبہ ہے۔ جسے اس کے مطلوب "خوش منظر باغ" کا علم ہے۔

موہن نے زبان کو روکتے ہُوئے کہا۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے ان کے یہ نام کیوں رکھے ہیں۔

کملا۔ میرے پاس ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ جس کا پہلا حصّہ ندارد ہے۔ اور وہ حصّہ اس لڑکے کے پاس ہے جسے اس محل میں آنا ہے۔

موہن نے محل اور باغ کا تذکرہ ایک دلخوش کن موسیقی کی طرح سُنا جس سے اس کے کان پہلے ہی سے مانوس تھے جب وہ ان درختوں کے ذکر میں آخری مقام پر پہنچی۔ تو وُہ پڑھتے پڑھتے یکا یک رُک گئی۔ جیسے کسی غیبی طاقت نے اُسے ٹھیرنے پر مجبور کر دیا ہو۔

کہانی کو بیان کرتے ہُوتے موہن نے کہا۔ "یہی وہ 'خوش منظر باغ' ہے۔ جس کی آنکھیں استقلال اور صفائی کے ساتھ اس شخص کی طرف لگی ہیں۔ جو شاہراہِ حیات سے اِدھر اُدھر نہیں ہٹتے۔ انہیں کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اس باغ میں داخل ہو سکیں۔

لڑکی حیران و ششدر رہ گئی۔ اُس پر خوف طاری ہو گیا۔ اُس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ فرطِ دہشت سے اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اور اُس نے کہا۔ "اوہ" پھر وہ ہانپنے اور اس طرح سانس لینے لگی۔ گویا دوڑ رہی ہے۔ اُس نے کہا۔ "تم جانتے ہو، اس کا کیا مطلب ہے۔"

موہن نے نہایت تیزی سے اپنی جیب سے وہی بوسیدہ کتاب نکالی اور اس کی گود میں رکھ دی۔ پھر اُس کے نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے۔ اُس وقت اُس کی آواز میں غضب کی نرمی تھی۔

اے میری "محبوبہ خواب" یہ تمہاری کتاب کا دوسرا حصّہ ہے۔ مَیں ساری عمر تیری جستجو میں رہا ہوں۔ افق پر ہلال

سرنگوں ہوکر زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور عنادل اپنے ترانوں سے گزشتہ زمانے کی محبتوں کو آشکار کر رہے تھے۔

اُس نے اُس کو ہر ایک بات بتادی "جس دن تم یہاں آتے تھے۔ بڑھیا نے اُسی دن مجھے تمام معاملہ سمجھادیا تھا۔" معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمہارے جدِّ بزرگوار کو پہچانتی ہے۔

وہ ایک دوسرے کے ہمسایہ اور منظورِ نظر رہ چکے ہیں قسمت نے انہیں کسی طریق سے جدا کر دیا۔ اس لئے ضرور تھا کہ کتاب بھی دو حصّوں میں بٹ جاتی۔ آدھی تمہارے پاس رہ گئی اور آدھی میرے قبضے میں آگئی۔ مجھے کتاب عرصے سے مِل گئی تھی میں تمہیں ہمیشہ اپنا محبوبِ خواب سمجھتی رہی (شرمیلی آنکھیں اُوپر کو اُٹھاکر) آؤ میرے ساتھ باغ میں چلو۔

موہن نے اپنا چہرہ اُس کے چمکتے ہوئے گیسوؤں پر رکھ کر کہا۔ راز آشکار ہوگیا۔ جس طرح تم میرے خواب دیکھتی تھیں۔ اُسی طرح میں بھی تمہارے ہی خواب میں تھا۔ اس داستان کے عجائبات ختم نہیں ہو سکتے۔

"ہاں پہلے حصّے کی تعبیر میں نے کی اور دوسرے حصّے کو تم نے پایۂ تکمیل تک پہنچادیا۔

وہ حصّہ جس سے تم بھی واقف تھے۔ اور میں بھی آگاہ تھی وہ داستانِ باغ ہے۔ یہی وہ تذکرہ ہے جس سے کتاب کا آغاز ہے۔ اور یہی وہ ذکر ہے جس سے کتاب اختتام کو پہنچتی ہے۔ میں خیال کرتی ہوں کہ میں ساری عمر تمہارے انتظار میں رہتی۔ اگرچہ میں نے اُس کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

موہن۔ مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر مجھے متذکرۃ الصدر باغ کا سراغ مِل گیا تو میں تمہیں ڈھونڈ نکالوں گا۔ اگرچہ مجھے کبھی یہ جرأت نہیں ہوئی۔ کہ میں تمہیں پالونگا۔ تاہم جس دن میں تمہارے دروازے پر کھڑا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ میں نے اپنا مدّعا پالیا۔ اور میں سمجھ گیا تھا کہ تم ضرور نمودار ہوگی۔

کملا نے اپنی چمکتی ہوئی آنکھیں اُوپر اُٹھائیں اور موہن کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کتاب کے دو حصّے جو ابھی تک ایک نہیں ہوئے۔ . . . ."

موہن۔ میری "محبوبۂ خواب" زندگی کے دو حصّے تاقیامِ حیات الگ الگ نہ ہونگے۔

پُورن سنگھ ہُنر

رُباعی

مازمزمہ سنجِ گلشنِ لاہوتیم	افتادہ بدامِ نغمۂ ناسوتیم
نے عشق نہ عقل نے تصرف نہ اثر	پیچیدہ بخویش مردہ در تابوتیم

گرامی

سرودِ مستاں

شراب خانہ ہے بزم ہستی | ہر ایک ہے محوِ عیش و مستی
مآل بینی و مے پرستی؟ | ارے یہ ذلت ارے یہ پستی!!
شعارِ رندانہ کر۔ پیئے جا

اگر کوئی تجھ کو ٹوکتا ہے | شراب پینے سے روکتا ہے
سمجھ اسے ہوش میں نہیں ہے | خرد کے آغوش میں نہیں ہے
تو اس سے جھگڑا نہ کر پیئے جا

خیالِ روزِ حساب کیسا | ثواب کیسا عذاب کیسا
بہشت و دوزخ کے یہ فسانے | خدا کی باتیں خدا ہی جانے
فضول سوچا نہ کر پیئے جا

نہیں جہاں میں مدام رہنا | تو کس لئے تشنہ کام رہنا
گرہ میں جو کچھ ہے زر لٹا دے | بس آج ہی سارا گھر لٹا دے
خیالِ فردا نہ کر پیئے جا

یہ تجھ پر آوازے کسنے والے | نہیں ہیں پرہیزگار سارے
اٹھا اٹھا ہاں اٹھا سبو کو | تمام دنیا کی ہاؤ ہو کو
غریقِ پیمانہ کر پیئے جا

کسی سے تکرار کیا ضرورت | فضول اصرار کیا ضرورت
کوئی پیئے تو اسے پلا دے | اگر نہ مانے۔ تو مسکرا دے
ملال اصلا نہ کر پیئے جا

تجھے سمجھتے ہیں اہلِ دنیا | "خراب خستہ ذلیل رسوا"
نہیں عیاں ان پہ حال تیرا | کوئی نہیں ہم خیال تیرا
کسی کی پروا نہ کر پیئے جا

ابو الاثر حفیظ جالندھری

ایفائے وعدہ

(۱)

بہار کے سفید اور بنفشئی پھول نسیم کی سرگوشیوں سے مسکرا رہے تھے۔ اور وہ جھکی ہوئی ان کی نازک پتیوں کو اپنی پتلی انگلیوں سے سہلا رہی تھی۔ اچانک سنہری پھولوں کا ایک گچھا ٹوٹ کر رخسار کو مس کرتا ہوا اس کے قدموں میں گرا۔

وہ اس شوخی پر مسکرائی۔ "موسم بہار کے خوش رنگ پھول واپس آگئے تھے لیکن "وہ" ابھی تک نہیں آیا تھا۔

پورا ایک سال گزر چکا تھا۔ دونوں ان خوشرنگ اور دلفریب پھولوں کے سائے میں بیٹھے تھے۔ اور اس نے یہ اقرار کیا تھا۔ کہ جب دوبارہ یہ کلیاں اپنے چہرے سے گھونگٹ اٹھائینگی میں واپس آجاؤنگا۔

"ڈائنا تم ایک سبز لباس پہنکر جیسا اسوقت پہنے ہو، یہاں میرا انتظار کرنا" اس نے فخر سے کہا۔

"لیکن اگر تم واپس نہ آؤ؟"

اس کے بازو اس کی گردن میں حمائل ہو گئے اس کے لب اس کے خوشبودار ریشمی بالوں کی گرہیں کھولنے لگے۔

"کچھ بھی ہو میں ضرور آؤنگا۔ ڈائنا! سنا میں ضرور آؤنگا!"

اس وقت اس کی آنکھوں میں صداقت کی ایک غیر معمولی کشش تھی۔ اس لئے وہ یقین کر لینے پر مجبور ہو گئی تھی۔

(۲)

لیکن موسم بہار اپنی تمام دلفریبیوں کے ساتھ وقت پر آیا اور گزر گیا۔ خوشرنگ پھول وقت پر کھلے اور مرجھا گئے۔ وہ سبز لباس پہنے سایہ کے نیچے فضول انتظار کرتی رہی۔

چند خطوط آئے گئے۔ بعد میں اس کی کوئی خبر نہ ملی۔

"میں نے انتظار کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس نے بھی زندگی بھر میرے ساتھ کوئی وعدہ خلافی نہیں کی تھی۔ اب کیوں کریگا۔"

وہ اپنے دل کو جو رات کی تاریکی میں اسے یاد کرتا تھا۔ جو سبز لباس پہنتے وقت امید و بیم سے دھڑکتا تھا۔ جو سنہری پھولوں کے نیچے اسے دیکھنے کو ترستا تھا۔ بار بار سمجھاتی تھی۔ مگر وقت گزر رہا تھا۔ وہ بیقرار ہو کر تعجب سے کہہ اٹھتی تھی۔ "کیا وہ نہیں آئے گا"؟

اس کا بےچین دل یہ ماننے کو تیار نہ تھا۔ وہ کسی طرح سے بھی یہ خیال اپنے دل میں آنے نہ دیتی تھی۔ تاہم اس کا حوصلہ گھٹ رہا تھا۔ وہ بیتاب ہوتی جاتی تھی۔

"میں نے آج دوپہر۔ ماسٹر جارج کو دیکھا ہے"۔ بوڑھے مالی نے باغ کی سڑک پر سے کہا۔

بادِ خزاں چل رہی تھی۔ پتّیاں یہ سختی برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ اور مجبور ہو کر زمین پر گر رہی تھیں۔ اس نے محسوس کیا۔ کہ خزاں کی جگہ موسمِ بہار نے لے لی ہے۔ اسے ارد گرد گلاب اور یاسمین لہلہاتے نظر آتے۔

"جارج ۔ ۔ ۔ ۔ آخر کار جارج آگیا ہے۔"

لیکن دُنیا پھر خزاں میں تبدیل ہو گئی۔ آفتاب گوشۂ مغرب میں غروب ہو رہا تھا۔ ہوا کے سرد جھونکے آ رہے تھے۔

"جارج۔ ۔ ۔ ۔ اگر واقعی وہ آگیا ہے۔ تو اس نے یہاں آنے میں اتنی دیر کیوں کی" وہ آہستہ آہستہ مالی کے پاس گئی۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ جارج ہی آ رہا تھا۔"

یقیناً وہی۔ یہ عجیب بات ہے۔ حضور میں جارج کو آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ کیا میں انہیں پہچان بھی نہیں سکتا۔ وہ گاؤں کے نزدیک سنٹ کا کھیت دیکھ رہے تھے۔ انکا چہرہ زرد تھا۔ وہ سفر پر فخر کرتے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ مگر اُنہوں نے جواب نہیں دیا۔ میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔ اُنہوں نے بھورے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور سفید داغوں والی آسمانی ٹائی باندھ رکھی تھی۔"

سفید داغوں والی آسمانی ٹائی جارج کے لئے اس کا آخری تحفہ تھا۔ اُس نے اپنے نازک ہاتھوں سے اسے باندھا تھا۔ "وہی ہوگا، ضرور وہی ہوگا۔" "شاید وہ کوٹھی میں میرا انتظار کر رہا ہو۔ شاید وہ چچی لیونیا سے باتوں میں مشغول ہو گیا ہو۔ اور یہاں نہ آسکا ہو۔"

لیکن ملاقات کے کمرے میں چچی لیونیا ہی تھی۔ وہ دروازہ کھولکر جلدی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کی بوڑھی چچی اکیلی بیٹھی تھی۔

"پیاری ڈاینا کیوں؟"

فقرہ ختم ہونے سے پیشتر ڈاینا اس کے پہلو میں تھی۔

"چچی جارج واپس آگیا ہے۔ جان نے اسے آج دوپہر گاؤں کے باہر آتے دیکھا ہے۔ وہ ایک منٹ میں یہاں آپہنچیگا"

"بیوقوف بھولی ڈاینا۔ مرد نہیں آیا کرتے۔"

"مرد" چچی نے اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ "میں نے تین دن گزرے اُسے اپنی آنکھوں سے مردہ دیکھا ہے۔"

"خواب میں" ڈاینا نے ایک ننھا سا قہقہہ لگایا۔ اچھی چچی تم نے تو مجھ کو ڈرا دیا تھا۔

(۳)

اس نے اُٹھ کر کھڑکی کھولی۔ سورج چھپ چکا تھا تاریکی نے نیلے آسمان پر جالا سا تن رکھا تھا۔

"جارج کہاں ہے" صرف خیال تھا یا واقعی بہار کے پھولوں میں کوئی انتظار کر رہا تھا۔ کیا صرف درختوں کا سایہ تھا یا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ

اس نے سبز لباس پہن لیا۔ کھڑکی کھولی اور دوڑتی ہوئی

اس جگہ گئی۔ سایہ کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

جونہی کہ وہ نزدیک پہنچی۔ جارج اسے نظر آ گیا۔ وہی بھورا سوٹ۔ وہی سفید داغوں والی آسمانی ٹائی۔

"یا خدا اس کا رنگ کتنا زرد ہے۔ وہ اس کو بغلگیر کرنے کیوں نہیں بڑھا۔ وہ اس کی طرف ٹکٹکی باندھے کیوں دیکھ رہا ہے"۔ وہ دوڑ کر آگے بڑھی اس کی کلائیاں اس کی گردن کے گرد تھیں۔ مگر افسوس آنکھ کھلی تو کیا دیکھا۔ کہ وہ صرف ہوا سے بغلگیر ہے۔ وہ بیہوش ہو کر پھولوں کی روش پر گر پڑی۔

(۴)

"میں نے تمہیں نہیں کہا تھا"۔ چچی لیونیا اس سے کہہ رہی تھی۔

اس نے اپنے آپکو کمرے میں پایا۔ جان (مالی) کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ خادمہ اس کے ہاتھ سہلا رہی تھی۔ چچی لیونیا کے ہاتھ میں ایک تار تھا۔ جو یقینی طور پر خبر دے رہا تھا۔ کہ جارج اب اس دُنیا میں نہیں ہے - - - - - -

تیسرے دن جب وہ بُخار کی حالت میں تھی۔ اس کی نظر ایک ریشم کے ٹکڑے پر پڑی۔ جس کا رنگ آسمانی اور جس پر سفید داغ تھے۔ خادمہ یہ ٹکڑا چچی لیونیا کو دکھا کر کہہ رہی "حضور یہ مَیں نے ان کے ہاتھ میں پایا تھا۔

والا گوہر

تلاطم جذبات

ناواقفِ حقیقت محشر طراز ہو جا
بے راز اسقدر بن دُنیا سے راز ہو جا

محوِ جمال ہو کر صرفِ گداز ہو جا
یعنی کہ آپ اپنی تو شرحِ راز ہو جا

وجہ سکوں ہے تو ہی دلہائے خوں شدہ کی
ہاں شانِ بے نیازی مصروفِ ناز ہو جا

حسرتکدے میں دل کے سامانِ صد تپش ہے
او محوِ خواب غفلت صرفِ گداز ہو جا

ہے تجھ سے بود عالم اے ناشناس معنے
درماندگی کا اپنی خود چارہ ساز ہو جا

یا سر سے لیکے پا تک خود شوق و آرزو بن
یا شوق و آرزو سے تو بے نیاز ہو جا

فطرت کا ذرّہ ذرّہ تیرا ہی منتظر ہے
بزمِ جمود سے اُٹھ ہنگامہ ساز ہو جا

ثاقب پڑا ہے بیحس مدہوش اہل دل ہیں
ہاں جلوۂ حقیقت ہنگامہ ساز ہو جا

ثاقب

انگشتری

(۱)

مجھے بچپن ہی سے دلاوری کے کارناموں سے شغفِ کامل ہے۔ اور میں اوائل عمر ہی میں تاریخی واقعات کو نہایت ذوق شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ خصوصاً فراعنہ مصر کے حالات مجھے بہت مرغوب تھے۔ اس ضمن میں سب سے پہلی کتاب جو میری نظر سے گذری۔ وہ انگلستان کے مشہور مُصنّف سر رائڈر ہیگرڈ کے ناول "شی"[۵۱] کا ترجمہ تھی۔ جس نے میرے دل میں یہ خواہش پیدا کر دی کہ کسی نہ کسی طرح میں بھی ممی (حنوط شدہ نعش) دیکھوں۔ اور اگر ہو سکے تو مردہ سے ہمکلام ہوں۔

اس خواہش نے میرے دل و دماغ پر ایسا تسلّط جمایا کہ میں نے بحالتِ خواب جامع ازہر (مصر کی یونیورسٹی) میں اپنے آپ کو مسٹر لیو[۵۲] سے گفتگو کرتے پایا۔ جتنا اس خواہش کو دباتا۔ اتنا ہی شوق بڑھتا تا آخر جب والد محترم کو معلوم ہُوا۔ تو اُنہوں نے میرے وہم کو دل سے نکالنے کا یہ طریقہ سوچا۔ کہ میری تمام کتابیں جو علوم مصریہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ مجھ سے چھین لیں۔ اور اپنی نگرانی میں دوسری رزمیہ کتابیں مطالعہ کو دیں۔

میری عمر بارہ برس کی تھی۔ آخر اس عمر میں بچّے کی کیا بساط کہ والد کا کہنا نہ مانے۔ "قہر درویش بر جانِ درویش" دل پر پتھر رکھ کر خاموش ہو گیا۔ اور بظاہر اس خواہش کو گلدستہ طاقِ نسیاں بنا کر تعلیم میں مشغول ہو گیا۔ اور چونکہ امتحان کے دن قریب آگئے تھے۔ اس لئے وہ خواہش فراموشی کی گہرائیوں میں غرق ہو کر رہ گئی۔

(۲)

کچھ مدّت کے بعد انگلستان پہنچنے پر میں نے محسوس کیا۔ کہ وہاں کی بارونق زندگی میری خلوت پسند طبیعت کے مطابق نہیں۔ اس لئے مجھے ایک ایسے مکان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جو آبادی سے دُور واقع ہو۔ تاکہ میں اپنے خیالات کو اطمینان سے مجتمع کر کے حوالۂ قلم کر سکوں۔ متواتر

---

۵۱ "شی" موسومہ بہ عذرا کا ترجمہ جناب مولوی خلیل الرحمٰن صاحب مترجم اخبار الاندلس کی کوشش کا ثمر لطیف ہے۔ اس کو پڑھنے سے پتہ ہی نہیں چلتا۔ کہ یہ اصلی تصنیف ہے یا ترجمہ۔ اُردو ادب کے دلدادوں کے لئے ایک بیش بہا تحفہ ہے۔

۵۲ مسٹر لیو دراصل انگریزی کتاب "شی" میں ہیرو کے عزیز ترین دوست کا نام ہے۔ ترجمے میں اس کا نام حنیف بتایا گیا ہے۔

تجسّس کے بعد مجھے معلوم ہُوا۔ کہ لندن کے مشرقی حصّہ میں ایک چھوٹا سا مکان خالی ہے۔ اس حصّہ شہر کے باشندے غریب اور مفلس ہیں۔ اور اُمرا کے ہنگامہ عیش سے دُور ایک تنگ و تاریک دُنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی غربت کا یہ حال ہے۔ کہ وہاں سے گزرنے والا ان کے بھوکے اور افلاس زدہ چہروں اور حریصانہ نگاہوں سے یہ گمان کرنے لگتا ہے۔ کہ شاید وہ لوگ مردم خوار ہیں۔ اور غالباً دو قدم بھی نہ جانے پاؤنگا۔ کہ تکّا بوٹی کر لیا جاؤنگا۔ مَیں نے اس مکان کو کرایہ پر لینے کا ارادہ کر لیا۔ اور اس ارادے سے اسے دیکھنا شروع کیا۔ یہ مکان بہت دلفزا مقام پر واقع تھا۔ اور کھلا ہوادار تھا۔ جب مَیں نے پڑوسیوں سے اس مکان کے لینے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تو وہ بہت ہنسے۔ مَیں نے ان سے اس بیجا ہنسی کا سبب پُوچھا۔ تو ان میں سے ایک بولا۔

"جناب یہ مکان تو آسیب زدہ ہے۔ جو شخص اس میں آتا ہے۔ زندہ نہیں رہ سکتا۔ دو ہی تین دن کے اندر اس کی لاش نکلتی ہے۔ جب سے یہ مکان بنا ہے۔ پانچ اشخاص نے مختلف مواقع پر اس میں قیام کیا۔ لیکن کوئی بھی زندہ سلامت واپس نہیں گیا"

مَیں نے ایک افتخار آمیز تحقیر کے لہجہ میں کہا۔ "مَیں دُنیا میں کسی جن یا بھوت سے تو کیا خود شیطان سے بھی نہیں ڈرتا لیکن آخر کوئی وجہ بھی تو ہو۔ جب یہ مکان بنا تھا۔ اس وقت سب سے پہلے کون اس مکان میں رہا تھا؟ اور اس کا کیا انجام ہُوا؟"

وہ شخص۔ "جناب میرے باپ نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔ کہ یہاں ایک پروفیسر کسی دُور دراز مُلک سے آکر ٹھیرا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد اس نے مکان چھوڑ دیا۔ بس اسی دن سے اس میں آسیب رہتا ہے۔ اور اب اگر مالک مکان اسے مفت دے تو کوئی نہیں رہیگا۔ اس کا مالک خود بہت مالدار تاجر ہے وہ کبھی یہاں نہیں ٹھیرتا"

مَیں۔ لیکن مَیں ضرور اس مکان میں ٹھیرونگا۔ اور دیکھونگا کس کی طاقت ہے جو مجھے گزند پہنچائے یہ آسیب ہی کو نہ تباہ کر دُوں، تو سہی

(۳)

مجھے ایک کتاب دیکھنے کے لئے لندن کے عجائب خانہ کے دارالکتب میں جانا تھا۔ اس لئے مَیں اپنے مکان کا انتظام کرکے وہاں پہنچا۔ فہرست اشیاء کو پڑھتے وقت ایک جگہ فراعنہ مصر کی ممیوں کا ذکر آگیا۔ بس پھر کیا تھا۔ میری پُرانی خواہش راکھ میں دبی ہُوئی چنگاری کی طرح از سرِ نو چمکی۔ اور چونکہ مَیں طبعاً ضدی واقع ہُوا ہوں۔ اس لئے مطالعہ کی مصروفیات چھوڑ چھاڑ سیدھا عجائب خانہ کے اس حصّہ میں گیا۔ جہاں مصر سے حاصل کی ہوئیں ممیاں بند رکھی تھیں۔ وہاں مَیں نے ان تمام شکلوں کو دیکھا۔ اس دوران میں میری نظر ایک حسین عورت کی ممی پر پڑی۔ بس ہوش ہی تو اُڑ گئے۔ یہی دل چاہتا کہ یہ تصویرِ حسن کسی طرح زندہ ہو جاتی۔ اور مَیں اسے کلیجہ میں رکھ لوں۔

اس کا حسن بے اختیار دل کو کھینچتا تھا۔ اس محویت کے عالم میں میں نے دیکھا۔ کہ اس کے تمام زیور مرصع تھے۔ اور قیمتی جواہر سے مزین۔ زمانہ سلف میں ممی جس صندوق کے اندر رکھی جاتی تھی۔ اس صندوق کی تراش ممی کی جسمانی ساخت کے مطابق ہوا کرتی، اور صندوق پر اس کی تصویر اس کے قدرتی رنگ میں منقش کی جاتی تھی۔ جب میں نے اس عورت کے اصلی جسم کو دیکھا تو صرف ایک فرق پایا کہ تصویر میں وہ مہ جبیں ایک انگشتری اپنی چھنگلیا میں پہنے ہوئے تھی لیکن نعش میں وہ انگشتری ندارد تھی۔ یہ تفاوت واقعی حیرت انگیز تھا۔ لیکن میں یہ سوچ کر خاموش ہو رہا۔ کہ جن چوروں نے اسکو فراعنۂ مصر کے قبرستان سے چرایا ہوگا۔ انہی نے وہ انگشتری خورد برد کر لی ہوگی۔

(۴)

میں شام کے قریب اپنے گھر پہنچا۔ تمام دن کی محنت سے تھک گیا تھا۔ نیند آرہی تھی۔ دلیر ہونے کے باوجود میرا بدن لرزش سی محسوس کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد خدمتگار نے کھانا لاکر سامنے رکھا۔ لیکن میں نے چند ہی لقموں پر اکتفا کیا اور شب خوابی کا لباس پہن دو بھرے ہوئے ریوالور سرہانے رکھ لئے۔ اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اس حالت میں مجھ پر غنودگی سی طاری ہو گئی۔ لیکن دفعتہً ایک آواز نے جو لکڑی کے تختوں کے ٹوٹنے سے پیدا ہوئی تھی۔ مجھے بیدار کر دیا۔ میں فوراً بستر سے اُچھل کر کرسی پر آبیٹھا اور ریوالور دونوں ہاتھوں میں سنبھال لئے۔ میں نے دیکھا کہ پردہ اُٹھا۔ اور ایک نہایت خوبصورت عورت نمودار ہوئی۔ جب وہ میرے نزدیک آئی تو میں نے پہچانا کہ یہ وہی عورت ہے۔ جس کی نعش میں نے صبح عجائب خانہ میں دیکھی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ دونوں ریوالور ہاتھوں سے گر پڑے۔ قریب تھا کہ میں اس کے قدموں میں گر جاؤں۔ دفعتہً اُس نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ پھر انگشت شہادت سے فرش کی طرف اشارہ کیا۔ میں پہلے تو بہت حیران ہوا۔ لیکن خوف۔ استعجاب اور رعشہ نے جو میرے تمام جسم میں پیدا ہو گیا تھا۔ میرے حواس مختل کر دیتے تھے۔ میں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ تو وہ عورت ایک جلیل القدر مغرور ملکہ کی طرح حاکمانہ انداز سے کھڑی تھی۔ اور اُنگلی سے اشارہ کر رہی تھی میں گھبرا گیا۔ میں نے نیچے کی طرف دیکھا۔ وہاں سوائے فرش کے کچھ نہ پایا۔ پھر میں نے اپنی نگاہیں اس کی طرف پھرائیں تو اس کے لبوں پر تبسم جھلک رہا تھا۔ وہ نہایت غور سے میری کیفیات کا جائزہ لیتی معلوم ہوئی۔ میں نے ایک غیر معلوم قوت کے زیر اثر فرش کو ٹٹولنا شروع کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ تمام لکڑی کا بنا ہوا ہے۔ عورت اس وقت سراپا توجہ ہو رہی تھی۔ میں دل میں حیران تھا۔ کہ آخر اس تمام حرکت کا کیا مطلب ہے۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دفعتہً فرش میں ایک شگاف ہو گیا۔ میں نے جو اس میں جھانکا۔ تو معاً مجھے ایک ویسی ہی

انگشتری دکھائی دی۔ جس کی تصویر میں نے ممی کے صندوق پر دیکھی تھی۔ میں نے اُسے اُٹھایا۔ وہ مہ جبیں اپنی خالی انگلی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ میں سمجھ گیا۔ اور بہت احترام اور احتیاط سے وہ انگوٹھی اس کی نازک چھنگلیا میں پہنا دی۔ اسی وقت وہ شکل غائب ہو گئی۔ اور میں بیہوش ہو گیا۔

صبح کو یہ تمام واقعہ ایک خواب معلوم ہوا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ بجائے بستر کے فرش پر پڑا ہوں۔ اور فرش میں شگاف ہے۔

(۵)

شوق مجھے کشاں کشاں لندن کے عجائب خانہ میں لے گیا۔ میں فوراً اس حصّہ میں گیا۔ جہاں ممیاں رکھی جاتی ہیں جب میں اس عورت کی نعش کے قریب پہنچا۔ تو میں نے کیا دیکھا کہ انگشتری اس کی چھنگلیا میں موجود ہے۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ کسی کے سرد لبوں نے میرا بوسہ لیا ہے۔ میں اس حسینہ کے لئے دعا مغفرت مانگتا ہوا اپنے مکان پر واپس آ گیا۔ اور اپنے قیام انگلستان کا زمانہ اُسی مکان میں رہ کر بسر کیا۔ لوگ حیران تھے۔ اور مجھے جادوگر سمجھتے تھے۔

میں خود حیران ہوں کہ یہ معاملہ کیا تھا؟

معتصم

میری سحر

جلوہ آرا ہوئی سحر میری
یہ بجا آفتاب نکلا ہے
روح تاریک ہے مگر میری
یہ غلط ہو گئی سحر میری

حُسن کے موجزن سمندر میں
آہ ! وہ پیکرِ بہار کہاں
رُوح تشنہ ہے کسقدر میری
ڈھونڈھتی ہے جسے نظر میری

ہو ہم آغوش اگر وہ خرمنِ گل
شام میری ہے پھر سحر میری

کب مرا آفتاب نکلے گا
کب سحر ہو گی اے اثرؔ میری

اثرؔ صہبائی

باغ آرزو

یہ آرزو کا باغ بھی | رکھتا ہے کیسی تازگی
ہر پھول محوِ ناز ہے | ہر رنگ اِک اعجاز ہے
نرگس چمن میں ہر طرف | کیا کھل رہی ہے صف بصف

اس کی بھی آنکھوں میں مگر
جلوہ نما ہے آرزو

اِک اِک کلی اس باغ کی | رکھتی ہے دل میں بے کلی
کانٹا کھٹکنے کے لئے | اور گل مہکنے کے لئے
اِس کو خیالِ رنگ و بو | دامن کی اُس کو جستجو

ہر اک ہیں قصّہ مختصر
جلوہ نما ہے آرزو

ہر رنگ پر تنویر ہے | حیرت کی اِک تصویر ہے
ہر شاخ محوِ کار ہے | اِک اِک شجر تیار ہے
آرام دینے کے لئے | دِل چھین لینے کے لئے

ڈھونڈو جدھر دیکھو جدھر
جلوہ نما ہے آرزو

ہیں بلبلیں نغمہ سرا | ان کو ہے ٹپکا دید کا
دیکھو تو ان کی دِل لگی | گل پر ہے باندھی ٹکٹکی
جب پاس جا بیٹھی کبھی | ننھی سی ٹہنی جھک گئی

اس شاخ پر اس شاخ پر
جلوہ نما ہے آرزو

جب سر سے بادل ہٹ گئے | کرنوں سے گلشن پٹ گئے
پھولوں کے گھر میں عید ہے | سورج بھی محوِ دید ہے
کھولے ہیں اس نے بال و پر | رنگ چمن کو دیکھ کر

اس سے دمِ عزمِ سفر
جلوہ نما ہے آرزو

عبدالرحمن آذر

گورا

مصنفہ رابندر ناتھ ٹیگور　　مترجمہ عبدالستار خاں

باب چودھواں

دوپہر کو گورا کھانا کھا رہا تھا۔ انندا مائی نے باتوں ہی باتوں میں کچھ دریافت کرنا چاہا۔ اور بولیں۔ "آج صبح بی نئے آیا تھا۔ کیا تم سے ملاقات نہیں ہوئی؟"

گورا نے بغیر مخاطب ہوتے جواب دیا۔ "ہاں ملاقات تو ہوئی تھی۔

انندا مائی۔ "مَیں نے اس سے ٹھیرنے کو کہا تھا۔ وہ کچھ پریشان سا تھا۔ تھوڑی دیر میں اُکتا کر چلا گیا۔"

گورا نے کوئی جواب نہ دیا۔ انندا مائی نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھ کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسے کچھ دلی کوفت ہے۔ مَیں نے اُسے ایسا پریشان کبھی نہیں دیکھا اُسے رنجیدہ دیکھ مجھ کو بڑا صدمہ ہوتا ہے۔"

گورا نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔

انندا مائی کو گورا سے بے انتہا محبت تھی۔ چنانچہ وہ اُسے کبھی نہ مجبور کرتی تھیں۔ کہ اپنے دل کی بات کہے۔ وہ جو کچھ کہتا خود ہی کہا کرتا تھا۔ اگر کوئی دوسرا موقع ہوتا تو وہ خاموش ہوجاتیں۔ مگر یہاں تو بی نئے کو رنجیدہ دیکھ کر خود بھی پریشان تھیں۔ اس لئے کہا۔ "گورا سنو۔ تم ناراض نہ ہونا۔ خدا نے جتنے آدمی پیدا کئے ہیں۔ اُن کی طبیعتیں بھی مختلف بنائی ہیں۔ ایسی حالت میں سمجھ سکتے ہو کہ سب ایک ہی طریقہ کے پابند نہیں ہو سکتے۔ بی نئے تم کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ تمہاری ہر بات کو برداشت کرتا ہے۔ اگر تم نے اس سے زبردستی کی تو کوئی خوشگوار نتیجہ پیدا نہ ہوگا۔"

گورا۔ اماجان تھوڑا سا دودھ اور دیجئے۔

باتیں یہیں ختم ہوگئیں۔ کھانا کھانے کے بعد انندا مائی اپنے پلنگ پر جا بیٹھیں۔ انہیں کچھ اُلجھن سی تھی۔ اسی غور وفکر میں بیٹھی ہوئی کچھ سی رہی تھیں۔ لچھمنیا آکر نیچے بیٹھ گئی۔ نوکروں کی شرارتوں کی شکایت کرنے لگی۔ اور چاہا کہ ان کا خیال اس طرف منتقل کردے۔ لیکن ناکامیاب رہی۔ وہیں نیچے پڑ کر سو رہی۔

گورا نے اپنا تمام وقت خطوں کے لکھنے میں صرف کیا حالانکہ بی نئے کو صبح ہی یہ معلوم ہوچکا تھا کہ گورا اس سے ناراض ہے۔ تاہم گورا کو امید تھی کہ بی نئے عفو تقصیر کے لئے

اس کے پاس آئیگا۔ اس لئے باوجودیکہ گورا اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ تاہم ہر آہٹ کے سنتے ہی اس کی نگاہ بی نتے کی تلاش میں زینہ کی طرف اٹھ جاتی تھی۔

دن یونہی انتظار میں ختم ہوگیا لیکن بی نتے نہ آیا۔ گورا کی طبیعت بی نتے سے ملنے کو بے چین تھی۔ انتظار کی تکلیف سے عاجز ہوکر اس نے قلم رکھ دیا۔ چاہتا تھا کہ بی نتے کے یہاں جائے کہ مہم آموجود ہوئے۔ کرسی پر بیٹھتے ہی کہنے لگے "گورا تم کوشش مکھی کے بیاہ کی بھی کچھ فکر ہے"۔

گورا نے ابتک اس مسئلہ پر کبھی غور ہی نہ کیا تھا خاموش رہ گیا۔

مہم نے گورا کو چچا کے فرائض یاد دلا کر کہا "آجکل لڑکے مشکل سے ملتے ہیں۔ اپنی مالی حالت بھی کچھ اچھی نہیں ہے۔ جہیز کا سوال کتنا مشکل ہے" اس مسئلہ پر گورا غور کرتے کرتے عاجز آگیا۔ اب موقع تھا فوراً ہی مہم نے بی نتے کا نام لیکر ذکر چھیڑ دیا۔ اس تمہید کی بھی ضرورت نہ تھی۔ مگر مہم نے یہی مناسب سمجھا۔ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ مہم منہ پر گورا کو چاہے جو کہہ لے مگر دل میں اس سے ڈرتا تھا۔

گورا کو کبھی خواب میں بھی اس کا خیال نہ آیا تھا۔ کہ ان معاملات میں کبھی بی نتے کا نام بھی لیا جائیگا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ان دونوں نے ملک اور قوم کی خدمت کیلئے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں۔ اور ہمیشہ مجرد رہنے کا عہد کیا تھا۔ گورا نے صرف اتنا ہی کہا۔ "کیا بی نتے شادی بھی کریگا"۔

مہم۔ بس معلوم ہوگیا۔ کہ آپ کتنے بڑے پابند مذہب ہیں۔ تمہارا یہ ٹیکا اور چوٹی سب نمائشی ڈھکوسلے ہیں۔ تم لوگوں کے رگ وریشہ میں انگریزی تعلیم سرایت کرگئی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ برہمن کو شادی کرنا ضروری ہے۔

مہم نہ تو موجودہ نسل کی طرح مذہبی پابندیوں سے بالکل بے نیاز ہی تھا۔ اور نہ مذہب کا سخت پابند ہی تھا۔ نہ ہوٹلوں میں علانیہ کھانا کھانا فخر سمجھتا تھا۔ اور نہ شاستروں کے فقروں کو پڑھ پڑھ کر ہر شخص سے مباحثہ کرنا پسند کرتا تھا۔ بلکہ ان حرکتوں کو حماقت سمجھتا تھا۔ اس کا مسلک جیسا دیس ویسا بھیس تھا اسی لئے اس نے گورا سے مذہبی کتابوں کا ذکر کیا۔

اگر گورا سے کہیں یہ باتیں دو دن پہلے کی گئی ہوتیں غالباً وہ ان پر اتنی جلد خیال نہ کرتا۔ اب ان باتوں کا نظرانداز کرنا بالکل غیر ممکن ہوگیا۔ اور ہر طرح بی نتے کے یہاں جانے پر اپنے کو مجبور پاتا تھا۔ آخر کار اس نے کہا۔ "بہتر ہے۔ پہلے میں بی نتے کا عندیہ لے لوں تو پھر آپ سے عرض کروں"۔

مہم۔ عندیہ لینے میں آپ کو اتنا تردد کیوں ہے؟ آپ اس سے جو کچھ کہینگے وہ منظور کرلیگا۔ آپ کی بات کو بھلا وہ ٹال سکتا ہے۔ اچھا تو ہم معاملہ کو طے شدہ سمجھتے ہیں۔

اسی دن شام کو گورا بی نتے کے یہاں پہنچا۔ بی نتے مکان میں نہ تھا۔ اس نے لڑکے کو بلاکر دریافت کیا معلوم ہوا

کہ بی نے مکان نمبر ۸ ، کو گیا ہے۔

یہ سنتے ہی اس کی طبیعت میں پریش بابو کے خاندان اور تمام برھمو سماجیوں سے نفرت سی پیدا ہو گئی۔ انہی خیالات سے بھرا ہوا وہ فوراً ہی پریش بابو کی طرف تیزی سے روانہ ہو گیا۔ اور اپنے دل میں سوچ لیا کہ میں وہاں پہنچکر ایسی باتیں کرونگا کہ برھمو سماجیوں کو ایک کا بھی جواب دیتے نہ بن پڑیگا۔ اور بی نے بھی سمجھ جائیگا۔ لیکن جب وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ سب کے سب برھمو سماج مندر کو گئے ہوتے ہیں۔

تھوڑی دیر تک تو اُسے شبہ رہا کہ بی نے وہاں نہ گیا ہوگا بلکہ شاید اسی کے یہاں گیا ہو۔ لیکن کچھ اور سوچ کر وہ سیدھا برھمو سماج مندر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ دروازہ پر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ بی نے بارودا کے ساتھ تانگہ میں بیٹھا ہے۔ یہ دیکھتے ہی اُس کو سخت صدمہ ہوا۔ اور اپنے دل میں کہنے لگا۔ "اس احمق کو تو دیکھو اجنبی اور غیر محرم عورتوں کیساتھ شارع عام پر کس بے حیائی سے بیٹھا ہے۔ ہا! کوتاہ عقل کوئی اتنی جلدی بھی نا نعد کرشمہ کا شکار ہو جاتا ہے افسوس اب تیری دوستی میں کوئی حلاوت باقی نہیں۔" یہ سوچ کر وہاں سے فوراً ہی بڑی تیزی سے روانہ ہو گیا۔

بی نے خاموش تھا۔ اور سڑک کی طرف رُخ کئے دیکھ رہا تھا۔ بارودا نے سمجھا کہ بی نے پر یہ وعظ کا اثر ہے اور وہ اُسی پر غور کر رہا ہے۔ اسی سے وہ بھی خاموش رہی۔

باب پندرھواں

گورا اس دن شب کو گھر پہنچ کر سیدھا بالاخانے پر چلا گیا اور چھجہ پر چہل قدمی کرنے لگا۔ ذرا سی دیر بعد مہم بھی ہانپتا ہوا اوپر پہنچا۔ "جب انسان کو پر نہیں دئے گئے ہیں" اُس نے کہا۔ "تو پھر یہ دو منزلہ اور سہ منزلہ عمارتیں کیوں بنائی جاتی ہیں۔ ملاء اعلےٰ کے فرشتے یہ نہیں برداشت کر سکتے کہ طبقۂ اسفل کے باشندے آسمان پر پہنچنے کی کوشش کریں ہاں یہ تو بتاؤ تم سے اور بی نے سے ملاقات بھی ہوئی یا نہیں؟"

بغیر سیدھا جواب دئے گورا نے کہا۔ "بی نے سے ششی کی شادی ہونا غیر ممکن ہے۔"

"کیوں! کیا بی نے راضی نہیں ہوتا؟"

"میں خود نہیں چاہتا۔"

"کیا کہا" مہم نے نا امیدی سے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"نہیں آخر یہ کیا وہم پیدا ہو گیا۔ اس کا سبب تو بتاؤ۔"

گورا "بی نے کو اب زیادہ دنوں تک اپنا ہم عقیدہ اور ہمخیال رکھنا غیر ممکن ہے۔ اس لئے اپنے کنبہ میں اس کی شادی کرنا مناسب نہیں۔"

مہم۔ مجھ کو تم سے یہ امید نہ تھی۔ مَیں نے ہزاروں سخت سے سخت متعصب پابند مذہب لوگوں کو دیکھا ہے لیکن تم تو سب پر سبقت لئے جاتے ہو۔ تم تو بنارس اور ندیا کے پنڈتوں کو بھی مات کرنے لگے۔ وہ تو صرف تعصب کے نام سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور تم دوسروں کو اس پر عمل کرتا دیکھنا چاہتے ہو۔ مجھ کو تو یقین نہیں کہ تم سب کو شدھ کر سکو گے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ کرسٹان ہو گیا ہے؟"

کچھ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ آخر کار مہم نے کہا "میں اپنی لڑکی کسی ناخواندہ کو تو دے نہیں سکتا۔ تعلیم یافتہ عموماً ایسے ہی ملینگے۔ اُن کی مذہبی پابندیوں کی فروگذاشت پر چاہے تم اُن کا مذاق اُڑاؤ یا ان سے جھگڑو لیکن لڑکی کی شادی میں التوا پیدا کرکے اُس کی عمر کیوں برباد کرتے ہو۔ معلوم نہیں تم کس طبیعت کے آدمی ہو۔ ہمیشہ ہر چیز کے تاریک پہلو پر ہی تمہاری نظریں پڑا کرتی ہیں۔"

مہم وہاں سے نیچے اُترا اور سیدھا انداماتی کے یہاں گیا۔ ان سے کہنے لگا "اماں جان غضب ہو گیا گورا کو روکئے۔"

انداماتی۔ "ہیں! کیا ہوا؟"

مہم۔ "مَیں یہ بالکل طے کر چکا تھا کہ ششی مکھی کی شادی بی نئے سے کر دی جائے۔ مَیں نے گورا کو بھی راضی کر لیا تھا لیکن اب وہ بی نئے کو پورا ہندو نہیں سمجھتا۔ غالباً وہ مقننین قدیم سے ہر معاملہ میں متفق نہیں۔ چنانچہ گورا اب بگڑ بیٹھا ہے۔ آپ یہ جانتی ہیں کہ جب وہ بگڑ بیٹھتا ہے تو کیا کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ دُنیا میں مقننین کے بعد صرف آپ ہی کی ذات ایسی ہے جن کی رائے کی وہ قدر کرتا ہے۔ محض آپ ہی کے ایک لفظ پر لڑکی کی زندگی کے سُدھرنے کا دار و مدار ہے۔ بی نئے جیسا لائق لڑکا اور نہیں مل سکتا۔"

مہم نے انداماتی سے پورا ماجرا کہہ سُنایا۔ انداماتی یہ سُنکر بہت متفکر ہو گئیں۔ اور انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ ان دونوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ اور روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔

انداماتی اُوپر گئیں۔ گورا اپنے کمرے میں ایک کرسی پر بیٹھا ہُوا کچھ پڑھ رہا تھا۔ اور اپنے پیر دوسری کرسی پر پھیلا رکھے تھے۔ وہ ایک کرسی کھینچ کر اُس کے قریب بیٹھ گئیں۔ گورا نے فوراً اپنے پیر نیچے کھینچ لئے اور ادب سے سیدھا ہو بیٹھا۔

انداماتی۔ "گورا سُنو۔ مَیں تم کو اور بی نئے کو حقیقی بھائیوں کی طرح سمجھتی ہوں۔ تم بی نئے سے نہ لڑو۔ مَیں تمہارے اختلاف کو اچھا نہیں سمجھتی۔ اس سے مجھ کو صدمہ ہوتا ہے۔"

گورا۔ جب بی نئے خود ہی مجھ سے گریز کرتے ہیں تو مَیں کہاں تک اُن کے پیچھے پھروں۔"

انداماتی۔ "سنو بھیا مَیں تمہارے اختلاف کا سبب تو جانتی نہیں۔ پھر بھی یہ کہتی ہوں کہ بالفرض تم کو یہ یقین آجائے۔ کہ بی نئے اس رشتہ کو قطع کرنا چاہتا ہے۔ جس میں تم دونوں منسلک ہو۔ تو پھر بتاؤ کہ تمہاری دوستی کی قوت

کہاں گئی؟"

گورا۔ اماں جان، آپ یہ جانتی ہیں کہ مَیں ایک سیدھے راستہ پر چلنا چاہتا ہوں۔ اگر کوئی اس میں رکاوٹ پیدا کرے تو مَیں اس سے اپنی ٹانگ ہٹانے کے لئے کہونگا۔ اور پھر مجھ کو یہ پروانہ ہوگی کہ اس سے مجھ کو صدمہ پہنچیگا یا اُس کو۔"

انند امائی۔ آخر ہُوا کیا۔ صرف یہی کہ وہ آجکل ایک برہمو سماجی کے یہاں جایا کرتا ہے ۔۔۔ بس یہی قصور ہے نا"

"اماں جان یہ قصّہ طویل ہے۔"

"خواہ قصّہ کتنا ہی طویل ہو مگر تم سے صرف ایک ذراسی بات کہنا چاہتی ہوں۔ تم کو اپنے استقلال پر ناز ہے ۔۔۔ یعنی جس بات پر تم ایک مرتبہ قائم ہو جاتے ہو پھر اس سے نہیں ہٹتے لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمہاری گرفت بی نئے پر اتنی کمزور کیوں ہے؟ اگر ابی ناش تمہاری جماعت سے علیحدہ ہونا چاہتا تو تم اسے اسی آسانی سے جانے دیتے؟ بی نئے کی علیحدگی اتنی غیر اہم نہیں۔ اور خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ تمہارا جان نثار دوست ہے۔"

گورا خاموش ہوگیا اور غور کرنے لگا۔ انند امائی کی باتوں نے اس کے دل میں صفائی پیدا کردی۔ وہ ابتک یہ سوچ رہا تھا کہ وہ دوستی کو فرائض پر قربان کر رہا ہے لیکن اب اس پر یہ حقیقت آشکار ہوگئی، کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔ وہ بی نئے کو محبت کی سزا میں مبتلا کرنے پر تیار ہوگیا تھا خصوصاً اس وجہ سے کہ دوستی کا مطالبہ پُورا نہ ہُوا تھا۔ اُن کی محبت اور دوستی کی طاقت متقاضی تھی کہ بی نئے اس کی خواہش کے مطابق مضبوط جکڑا رہے۔ لیکن چونکہ ایسا نہ ہُوا۔ اس لئے گورا سخت رنجیدہ ہو رہا تھا۔

جونہی انند امائی نے یہ دیکھا۔ کہ ان کی باتوں نے اپنا اثر پیدا کرلیا۔ وہ اُٹھ کر بغیر کچھ کہے سُنے چلنے لگیں۔ گورا بھی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اور کھونٹی سے اپنی شال اتاری

انند امائی۔ تم کہاں جاتے ہو؟

گورا۔ بی نئے کے یہاں جاتا ہوں۔

انند امائی۔ کھانا تیار ہے پہلے کھالو۔

گورا۔ مَیں بی نئے کو لے آؤں تو ہم دونوں ساتھ ہی کھائینگے

انند امائی نیچے جانا چاہتی تھیں کہ اتنے میں انہیں کسی کے آنے کی آہٹ سُنائی دی۔ اور وہ یہ کہہ کر رُکیں "لو! بی نئے تو یہ آگیا۔" اُن کا یہ کہنا تھا کہ بی نئے بھی وہاں پہنچ گیا انند امائی نے اُسے دیکھا تو اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُنہوں نے تعجب آمیز لہجہ میں پُوچھا "غالباً تم نے ابھی کھانا نہیں کھایا ہے؟"

بی نئے۔ "جی نہیں اماں جان۔ ابھی تو نہیں کھایا ہے"

انند امائی۔ "اچھا تو یہاں کھالو۔"

بی نئے نے گورا کی طرف دیکھا۔ گورا نے کہا "تمہاری بڑی زندگی ہے۔ مَیں ابھی تم ہی سے ملنے جا رہا تھا۔"

انند امائی کے دل کا بوجھ ہلکا معلوم ہونے لگا انہوں نے ان دونوں کو وہیں تنہا چھوڑا اور نیچے چلی گئیں۔

جب دونوں بیٹھ گئے تو ان میں سے کسی کو اتنی جرأت نہ ہوتی تھی۔ کہ اس مسئلہ کو چھیڑے۔ جو ان کے دلوں میں سب سے زیادہ کھٹک رہا تھا۔ گورا نے ادھر اُدھر کی باتیں شروع کیں۔ وہ کہنے لگا۔" آپ اُس جمناسٹک ماسٹر کو جانتے ہیں جو لڑکوں کے کلب میں مقرر کیا گیا ہے۔ وہ بڑا ہوشیار ہے۔ اور بہت اچھا آدمی ہے" وہ اس قسم کی اور بھی باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں انہیں کھانا کھانے کے لئے نیچے بُلایا گیا۔

جب وہ کھانا کھانے بیٹھے تو انند امائی نے انکی باتوں سے یہ اندازہ لگالیا کہ انکے درمیان ابتک ویسا ہی پردہ حائل ہے۔ جب وہ کھانا کھا چکے تو انند امائی نے کہا "بی نتے اب رات زیادہ ہوگئی ہے۔ کہاں جاؤ گے۔ یہیں سو رہو میں تمہارے بہاں کہلا بھیجتی ہوں۔"

بی نتے نے گورا کے چہرہ پر متجسسانہ نگاہ ڈالی اور کہا "سنسکرت میں ایک مقولہ ہے۔ کہ جب کھانا کھا چکو تو شاہانہ انداز سے آرام کرو۔ چنانچہ میں بھی اب کہاں رات کو سڑکوں کی خاک چھانوں۔ اب تو یہیں آرام کروں گا"

دونوں وہاں سے اُٹھکر چلے گئے۔ اور اُوپر ایک چٹائی پر لیٹ رہے جو کھلے ہوئے تختے پر بچھی تھی۔ بارش کی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ سفید بادلوں کے ہلکے ہلکے ٹکڑے کبھی تو نیند کے پردوں کی طرح چاند پر آجاتے۔ اور کبھی ہٹ جاتے تھے۔ چاروں طرف دائرہ افق میں مختلف بلند عمارتیں تھیں۔ جو کہیں کہیں بلند درختوں کی چوٹیوں سے مل جاتی تھیں۔ اور روشنی اور سایہ کا ایک بمعنی غیر وجودی اور وہمی اتصال تھا۔

قریب کے گرجا کی گھڑی نے ۱۱ بجائے برف بیچنے والوں کی پکار بند ہوگئی۔ گاڑیوں کے چلنے کی آوازیں رُک گئیں۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ کسی کے جاگنے کی آہٹ نہ معلوم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی کُتّوں کے بھونکنے یا گھوڑوں کے تختہ پر ٹاپ کی آواز آجاتی تھی۔

بڑی دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پہلے تو بی نتے بہت ہچکچاتا رہا۔ بالآخر بڑی ہمت کر کے بولا "گورا! میرا دل بھر آتا ہے۔ میں جانتا ہوں تم کو میرے خیالات سے دلچسپی نہیں۔ لیکن جبتک میں کہہ نہ لوں۔ مجھ کو چین بھی نہیں میں یہ امتیاز بھی نہیں کر سکتا۔ کہ وہ اچھی بات ہے یا بُری مگر یہ ضرور جانتا ہوں۔ کہ وہ نظر انداز بھی نہیں کی جاسکتی۔ میں نے اس کے متعلق بہت کچھ پڑھا ہے۔ اور ہمیشہ یہ سمجھتا رہا کہ مجھ کو اس مسئلہ کے ہر پہلو پر عبور ہوگیا ہے۔ گویا میری حالت ایسی تھی جیسے کوئی جھیل کی تصویر دیکھ کر عالم خیال میں تیرنے کا لطف اُٹھلئے۔ اب چونکہ میں پانی میں گھر گیا ہوں۔ اس لئے مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی آسان بات نہیں۔"

اس تمہید کے بعد وہ گورل کے سامنے اپنے تحیر خیز تجربہ کا جس سے اس کو اپنی زندگی میں پہلے ہی پہل سابقہ پڑا تھا اظہار کرنے لگا۔ اس نے کہا کہ میری قوتِ امتیازی اتنی مضمحل ہوگئی ہے کہ رات اور دن میں مجھ کو کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ بلکہ پوری فضاء سماوی میں جو مجھ کو محیط کئے ہوتے ذراسی بھی جگہ خالی نہیں دکھائی دیتی۔ وہ ایک شیریں اور لطیف شے سے پُر ہے۔ میری حالت بعینہٖ اس شہد کے چھتہ کی سی ہو رہی ہے جو موسم بہار میں شہد سے پُر ہو کر پھٹا پڑتا ہے۔ آجکل مجھ کو ہر شے سے قربت ہوگئی ہے۔ اور اس کا مجھ پر اثر پڑتا ہے مجھے ہر چیز ایک خاص معنی یا حقیقت سے لبریز معلوم ہوتی ہے۔ مجھ کو یاد نہیں کہ مجھے اس دنیا سے کبھی اتنی الفت بھی تھی یا نہیں۔ آسمان اتنا حیرت افزا۔ روشنی اتنی تعجب انگیز۔ اور اجنبی رہروؤں کی جادہ پیمائی حقیقت سے اتنی لبریز معلوم ہوتی ہے۔ کہ بیساختہ میرا جی چاہتا ہے کہ ہر شخص کی بہبود کی کوشش میں سرگرم ہو جاؤں۔ اپنی قوتوں کو دنیا کی لازوال خدمت میں اسی طرح صرف کر دوں جس طرح سورج سے استفادہ ہوتا ہے۔

بی نتے نے جس طریقہ پر گفتگو کی۔ اس سے نتیجہ اخذ کرنا مشکل تھا کہ باتیں کرتے وقت اس کے دل میں کسی خاص آدمی کا خیال ہے۔ اُسے کسی کے نام لینے میں بھی ایک لطیف ہچکچاہٹ معلوم ہوتی تھی۔ بلکہ اس قسم کا خیال بھی دل میں لانا وہ گناہ سمجھتا تھا۔ یہ غلطی تھی یہ تذلیل تھی لیکن یہ غلطی سخت ترغیب آور تھی خصوصاً ایسی شب اور ایسے وقت میں جبکہ وہ اپنے دلی دوست کے ساتھ پُرسکون آسمان کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔

کیا ہی حیرت انگیز چہرہ ہے۔ تابش حیات نزاکت حُسن سے دل اندوز طریقہ پر ہویدا ہو رہی ہے۔ وہ جلال ذہانت وہ موزوں خط و خال، جب وہ مسکراتی ہے تو اس کے خیالات دلی آنکھوں میں متجلی ہو کر ایک عجیب انداز سے کھل پڑتے ہیں۔ اور عالم سکون میں پردۂ چشم کی آڑ میں گھات لگائے رہتے ہیں۔ اس کے وہ دونوں ہاتھ جو معلوم ہوتا ہے کہ گویا بول اٹھینگے۔ نہایت بے چینی سے اُس کی محبت کو خدمت کی صورت میں ظاہر کرنے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ بی نتے کو معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس کی حیات اور جوانی دل آویز شیرینی سے پُر ہو رہی ہے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے وہی مجسم شکل پھر رہی ہے۔ بار بار اس کے دل میں خوشی کی موجیں اُٹھتی تھیں۔ اور سینہ سے ٹکرا جاتی تھیں۔

اس سے بڑھ کر اور کونسی حیرت افزا بات ہوسکتی ہے کہ دنیا میں لوگ جس چیز کی طلب میں بغیر دیکھے اپنی عمریں گذار دیتے ہیں۔ وہی بی نتے اپنی آنکھوں سے مجسم دیکھ رہا تھا کیا یہ کوئی پاگل پن ہوسکتا ہے؟ یا غلطی ہے؟ اگر ہو بھی تو کیا ـــ اب تو پانی سر سے گذر چکا ہے۔ اگر اس موجِ رواں نے اس کو کسی ساحل تک پہنچا دیا تو خیر ہے۔ اور اگر کہیں وہ اُسے

تھپیڑے مارتی تیراتی رہی یا ڈبو دیا تو کیا ہوگا؟ مشکل تو یہ ہے کہ وہ خود بھی اس گرداب سے نکلنا نہ چاہتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ کہ گویا اس کی زندگی کا حقیقی مقصد اسی طرح روایات و عادات کی بندشوں سے بالکل آزاد ہو جانا ہے۔

گورا بالکل خاموش بیٹھا سن رہا تھا۔ اس چھت پر عالمِ سکون میں اسی قسم کی اجیالی راتوں میں ان دونوں دوستوں نے کئی دفعہ تنہا بیٹھ کر مختلف مسائل پر مباحثہ کیا تھا۔ علم ادب، اقوامِ عالم، بہبودیٔ جماعت، اپنی آئندہ زندگی کے لائحہ عمل لیکن کبھی ایسا پُر محبت مسئلہ نہ چھڑا تھا۔ گورا کو انسانی قلب کے حسیات کا سچا نقشہ اور مکمل صورت الفاظ کے جامہ میں دیکھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ وہ ابتک ان چیزوں کو محض شعرا کے تخیلات سمجھ کر قابلِ التفات نہ سمجھتا تھا۔ لیکن آج اس کا اتنا اثر ہوا کہ وہ اُسے نظرانداز نہ کرسکا۔ بلکہ یکایک پھٹ پڑنے کے جھٹکے نے اُس (گورا) کے بھی قلب کے دروازہ کو ہلا دیا۔ اور اس کا وجدانی کیف سارے جسم میں بجلی کی رو کی طرح پھیل گیا۔ ایک لمحہ کے لئے پردہ بالکل اُٹھ گیا۔ موسمِ برشگال کی چاندنی نے اس حصۂ دل کو جو ابتک تاریک تھا تجلی کر دیا۔

وہ اپنی باتوں میں اتنے محو تھے کہ اُن کو یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ چاند کس وقت چھتوں کی اوٹ مغرب میں جاکر غروب ہوگیا اور اس کی جگہ مشرق سے خفیف روشنی جو سوتے بچے کی مسکراہٹ کے مانند تھی۔ نمودار ہوگئی۔ بالآخر جب بی نئے کے دل کا بوجھ ہلکا پڑا تو وہ کچھ محجوب ہونے لگا۔ تھوڑی دیر رُک کر وہ کہنے لگا۔ "جو کچھ مجھ پر گزرا ہے۔ وہ آپ کی نظروں میں بالکل غیر وقعت اور ہیچ معلوم ہوگا۔ غالباً اس کی وجہ سے آپ کو مجھ سے کچھ نفرت بھی ہوگی۔ لیکن میں کیا کروں۔ میں نے کوئی بات آپ سے نہیں چھپائی ہے۔ آج بھی میں نے صاف صاف کہہ دیا ہے، آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں"

گورا نے جواب دیا۔ "بی نئے! حقیقت تو یہ ہے کہ میں خود نہیں کہہ سکتا۔ کہ میں نے ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے چند دنوں قبل تو آپ بھی اچھی طرح نہ سمجھ سکتے تھے۔ میں اس سے انکار بھی نہیں کرسکتا۔ کہ زندگی کی بے پایاں وسعت کے اس پہلو کو جس میں خواہشات وجوش کا نمایاں حصّہ ہے میں لچر اور ناقابلِ التفات سمجھتا تھا۔ اب میں اتنا ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ غالباً وہ ایسا نہ ہوگا۔ چونکہ مجھ کو کبھی اس کی قوت کا تجربہ نہ ہوا تھا۔ اس لئے اس کو میں سطحی اور غیر وقعت سمجھتا تھا لیکن اب جس کو آپنے اس تیقن کے ساتھ سمجھ لیا ہے اس کو میں وہم اور جھوٹ سمجھ کر نظرانداز نہیں کرسکتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کو اگر اس خاص دائرۂ عمل کے باہر، جس کے اندر رہ کر وہ کسی خاص مقصد کی تکمیل میں کوشاں ہوتا ہے۔ واقعات جو حقائق پر مبنی ہیں۔ غیر وقعی نہ معلوم ہوں تو وہ اپنے مقصد کی تکمیل میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا یہی ایک خاص وجہ ہے کہ انسان کی نظروں میں خداوندِ عالم نے اس دائرہ کے باہر

تمام حقائق کو یکساں اہمیّت اور وقعت نہیں دی۔ وہ نہیں چاہتا کہ سب حقائق کا انسان پر انکشاف کر کے اسے عالمِ حیرت میں ڈال دے۔ ہم کو اس کی ضرورت ہے کہ اپنے اپنے لئے ایک خاص دائرہ عمل منتخب کر لیں۔ اور اپنی تمام توجہات کو اُسی ایک مرکز پر صرف کر دیں۔ اور چاروں طرف ہاتھ پیر مارنے سے باز رہیں۔ ورنہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے اور نہ اس صداقت سے جس کے ہم متلاشی ہیں۔ ہمکنار ہو سکتے ہیں۔ میں اس صنمکدہ کا جہاں آپ 'صداقت' کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ پوجاری نہیں بن سکتا ورنہ مَیں اپنی زندگی کی باطنی حقیقت کو کھو بیٹھونگا۔"

بی نے "اب مجھے دو شاہراہیں نظر آ رہی ہیں۔ ایک تو وہ ہے جس پر آپ گام زن ہیں۔ اور ایک وہ ہے جس پر مَیں پڑا ہُوا ہوں مَیں اس لئے کوشاں ہوں۔ کہ کامل ہو جاؤں اور آپ اپنی زندگی وقف کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

گورا نے بے صبری سے بات کاٹ کر کہا۔ "بی نے! خواہ مخواہ لفاظی نہ کرو۔ مَیں دیکھ رہا ہوں۔ کہ آج تم ایک زبردست اور اٹل صداقت سے دوچار ہو رہے ہو۔ جسے مذاق میں نہیں ٹالا جا سکتا۔ فی الحقیقت اگر آپ کو کسی صداقت سے بہرہ اندوز ہونے کی خواہش ہے۔ تو اس کے حصول میں منہمک ہو جاؤ۔ بغیر انہماک کامیابی غیر ممکن ہے۔ میری صرف یہی ایک خواہش ہے کہ مَیں جس صداقت کے حصول میں منہمک ہوں اس کا مجھ پر صاف صاف انکشاف ہو جائے۔ ابتک تم نے محبت کے متعلق اپنے اسی علم پر اکتفا کیا تھا جس کا وقوف تمہیں کتابوں سے ہو سکا۔ میرا بھی حب الوطنی کا علم و وقوف کتابوں ہی تک محدود ہے۔ آج آپکو جب صحیح تجربہ ہُوا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ محبت کتابوں کی محبت سے کتنی مختلف ہے۔ یہ ہے محبت جس نے آپکی فضا کائنات کو گھیر رکھا ہے۔ اور اس میں کہیں بھی خلا نظر نہیں آتی جہاں سے آپ کو چھٹکارا مل سکے۔ جس دن مجھ پر بھی حب الوطنی کا ایسا ہی انکشاف ہو جائیگا۔ اس دن میری بھی یہی حالت ہو جائیگی۔ اور مجھے گریز کا موقع نہ رہیگا۔ وہ میری دولت، میرا گوشت، میرا پوست، میرے استخواں، میری جان، میرا آسمان اور جو کچھ میرا ہے سب اپنی طرف کھینچ لے گی۔ میرے مُلک کی وہ کتنی صحیح، سچی، دلکش، حیرت افزا اور صاف تصویر ہوگی۔ اُس کی مصیبتیں کتنی مسخر کرنے والی ہونگی۔ اس کی مسرتیں ایک ہی لمحہ میں قوت اور زندگی کے متموج سیلاب کو عبور کر لیتی ہیں۔ جس وقت مَیں آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ اس وقت مجھ کو اس کی ایک جھلک سی نظر آئی۔ اس تجربہ نے جس نے آپ کو زندہ کر دیا، مجھ میں بھی نئی زندگی کی رُوح پیدا کر دی ہے۔ مجھ کو اس کا علم نہیں کہ مَیں کبھی وہ کچھ جس کا آپ کو مکاشفہ ہُوا ہے۔ سمجھ سکونگا۔ لیکن محض آپ ہی کے تجربہ کی بدولت مَیں بھی قدرے اُس لذّت سے جس کا مَیں متلاشی تھا آشنا ہو سکا۔"

یہ کہتا ہُوا گورا چٹائی سے اٹھ کھڑا ہُوا اور چھت پر ٹہلنے لگا مشرق کی سپیدیٔ صبح اس کے لئے پیغام بن رہی تھی۔ اس کی رُوح مسرت آمیز خوشی سے مرتعش ہو گئی۔ اور اسے یوں معلوم

ہونے لگا کہ گویا کسی قدیم جنگل میں ویدمنتروں کے پڑھنے کا سماں
اُس کی آنکھوں کے سامنے بندھا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے
وہ ساکت ہوگیا۔ اس کے سارے جسم میں ایک لرزش دوڑ گئی اور
اسے یہ معلوم ہونے لگا۔ گویا اس کے دماغ سے ایک کنول کا
درخت نمودار ہوا۔ اور وہ کھل کر ساری فضائے سماوی پر محیط ہوگیا
اس کی جان اور اس کا وقوف، اُس کی تمام قوتیں ایک فائق ترین
فرحت میں فنا ہوگئیں۔

جب گورا ہوش میں آیا تو اس نے چونک کر کہا۔ "بی نئے!
تم کو اپنی محبت سے بھی علیحدہ ہونا پڑیگا ـــــ میں تم سے یہ کہتا
ہوں کہ تم وہاں نہیں رُک سکتے۔ ایک دن میں آپ کو دکھا
دُونگا۔ وہ جو مجھ کو اپنی پُرجلال قوت سے اپنی طرف بُلا رہا ہے
کتنا جلیل القدر ہے۔ آج میرا قلب لازوال مسرت سے پُر
ہو رہا ہے ـــــ میں جانتا ہوں میں آپ کو کسی کمتر درجہ کی قوت کے
ہاتھوں میں نہیں چھوڑ سکتا۔

بی نئے چٹائی سے اُٹھا اور گورا کے قریب جا کھڑا ہوا۔ گورا
نے جوش میں اُسے اپنے سینہ سے لپٹا لیا۔ اور زور سے دبا کر
کہا۔" اگر ہمارے لئے موت ہے تو وہی ایک موت ہمیں کوئی
جُدا نہیں کر سکتا۔" من تو شدم تو من شدی من جاں شدم تو تن شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری"

گورا کے اس جوش کی ایک لہر بی نئے کے قلب کے اندر
جا پہنچی۔ اور بغیر کچھ کہے۔ اس نے اپنے دوست کے سامنے
سر جھکا دیا۔ وہ دونوں چپ چاپ چھت پر ٹہلنے لگے۔ اور
افق مشرق پر سُرخی چھا گئی۔

گورا نے پھر کہا" برادرمن! وہ دیوی جس کی میں پرستش
کرتا ہوں۔ مجھ تک کسی شان وشکوہ اور حسن ودلفریبی کے لباس
میں نہیں آتی ہے۔ میں اُسے وہیں دیکھتا ہوں۔ جہاں فلاکت،
اور افلاس ہے، جہاں قحط اور مصیبت ہے، اور جہاں ذلت
اور خرابی ہے وہاں نہیں دکھائی دیتی۔ جہاں نغمہ وگل کا چڑھاوا
چڑھایا جاتا ہے۔ بلکہ صرف وہیں نظر آتی ہے۔ جہاں خونِ حیات
قربانگاہ پر چڑھایا جاتا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حد سے زیادہ خوشی
ہوتی ہے۔ کہ وہاں کوئی بھی ایسی خوشگوار چیز نہیں جو انسان
کو اپنے فرائض کی انجام دہی سے منحرف کردے۔ وہاں تو صرف
اپنی ہی قوت پر بھروسہ کر کے انسان اپنا سب کچھ قربان کرنے
کے لئے تیار ہوجاتے۔ اس قسم کا ظہور کسی شیریں اور لطیف
حسیات سے ملوث نہیں۔ وہ ایسی بیداری ہے جسکی کوئی
روک نہیں۔ اور جو ناقابلِ برداشت ہے مشکل ترین اور
سخت ترین ہے۔ جس میں ربابِ ہستی کے تار اس طرح
وصل ہیں۔ کہ مضراب کے ذرا سے اشارے پر اس زور سے
نغمہ زن ہو سکتے ہیں، گویا ٹوٹ کر علیحدہ علیحدہ بکھر جائینگے۔
جب میں اس پر غور کرتا ہوں تو میرا دل خوشی سے اچھلنے لگتا
ہے۔ یہی خوشی مرد کے شایانِ شان ہے ـــــ یہ وہ خوشی
ہے۔ جس سے شیوجی مسرور ہو کر رقص کرنے لگتے ہیں فنا۔ فدا

کے شعلوں کی چوٹیوں پر مناظر جدید کا مشاہدہ ہی انسانی جستجو اور طلب کا ماحصل ہے۔ مَیں اس خونی رنگ کے آسمان ہی پہ درخشاں مستقبل دیکھ سکتا ہوں جس کے حدود وسیع اور لامحدود ہیں۔ آج کے آثار صبح میں مجھے دکھائی دے سکتا ہے۔ سنئے اس کے نقارہ کی صدا میرے سینہ سے نکل رہی ہے۔" یہ کہہ کر گورا نے بی نتے کا ہاتھ اپنے سینہ پر رکھ لیا۔

بی نتے نے بہت متاثر ہو کر کہا۔" بھائی گورا! میں تمہارا ہر حال میں ساتھ دونگا۔ مگر میں تم سے تاکیداً کہتا ہوں کہ مجھے شک نہ کرنے دینا۔ مجھ کو اسی بیرحمی سے گھسیٹتے لئے جاؤ۔ جس بیرحمی سے قسمت انسان کو گھسیٹتی پھرتی ہے ہم تم دونوں ایک ہی شاہراہ پر کھڑے ہیں۔ لیکن ہماری قوتیں یکساں نہیں۔"

گورا۔ ہماری طبیعتیں فطرتاً مختلف ہیں لیکن وہ عظیم الشان خوشی ہماری طبیعتوں کے اختلاف کو مٹا کر ایک کر دیگی۔ وہ محبت جو ہماری اس محبت سے جو ہمیں ایک دوسرے سے ملائے ہوئے ہے عظیم تر ہے۔ ہم دونوں کو ایک کر دیگی۔ جب تک ہم دونوں اُس عظیم تر محبت کو محسوس نہ کر لیں۔ ہر ہر قدم پر جدائی اور اختلاف کا احتمال ہے۔ آخر کار وہ دن آ جائیگا۔ جب ہمارے تمام اختلافات مٹ جائینگے۔ ہم کو ہماری دوستی کی خبر نہ رہیگی ہم ایک لازوال جوش کے عالم میں ایثار اور قربانی کے لئے ملکر کھڑے ہونگے۔ اور ایسے گھل ملے ہونگے کہ ہمارے قدموں میں اور ہمارے ارادوں میں غیر متزلزل استقلال ہوگا۔ اور اُسی لازوال خوشی میں ہماری دوستی کا ماحصل ہوگا۔"

بی نتے نے نہایت گرمجوشی سے گورا کا ہاتھ دبا کر کہا۔" خُدا کرے ایسا ہی ہو۔"

گورا۔" لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ میں آپ کو سخت تکلیفیں پہنچاؤنگا۔ اور آپ کو میری چیرہ دستیاں برداشت کرنی پڑینگی۔ کیونکہ ہمارا آخری مقصد ہماری دوستی ہی نہیں ہے۔ ہم کو اُسے کسی طرح ہدف تحقیر نہ بنانا چاہئے۔ اگر ہماری دوستی کسی عظیم ترین محبت کی خاطر معرض خطر میں پڑتی ہو تو مجبوری ہے۔ لیکن اگر وہ قائم رہ گئی تو بالضرور وہ کامیاب اور بامراد دوستی ہوگی۔

ان دونوں نے پیچھے کسی کے آنے کی آہٹ سُنی۔ لوٹ کر دیکھا کہ انند امائی آ رہی ہیں۔ انہوں نے ان دونوں کا ہاتھ پکڑا۔ اور خوابگاہ میں لے گئیں۔ اور کہا" چلو اب سو رہو۔"

دونوں نے ساتھ ہی جواب دیا۔" امّاں جان اب نیند نہ آئیگی۔"

انند امائی نے دونوں کو بستر پر لٹا کر کہا۔" ہاں ہاں تم کو ضرور نیند آئیگی" اُنہوں نے دروازہ بند کر دیا۔ اور سرہانے بیٹھ کر پنکھا جھلنے لگیں۔

بی نتے۔" امّاں جان آپ پنکھا جھلتی ہیں تو کیا۔ مگر آج نیند نہیں آئیگی۔"

انند امائی۔ "اچھا دیکھتی ہوں نیند کیسے نہیں آتی جہاں میں اُٹھی تم باتیں کرنے لگو گے۔ اسی لئے اب مَیں یہاں سے نہ ہٹونگی اور تم باتیں نہ کرنے پاؤ گے۔"

جب دونوں کی آنکھیں لگ گئیں تو انند امائی آہستہ سے اُٹھ کر کمرے سے نکل آئیں۔ نیچے آتے وقت انہیں سیڑھیوں پر مہم مل گیا۔ جو اُوپر آرہا تھا۔ انہوں نے اس سے کہا۔ "ابھی نہ جاؤ۔ وہ دونوں رات بھر جاگتے رہے۔ مَیں ابھی ان کو سلا کر آرہی ہوں۔"

مہم۔ "خوب! یہ بھی کوئی دوستی ہے۔ اچھا یہ تو بتایئے کہ آپ کو کچھ معلوم بھی ہوا کہ انہوں نے شادی کے متعلق بھی کچھ گفتگو کی یا نہیں۔"

انند امائی۔ "مجھ کو نہیں معلوم"

مہم۔ "خدا جانے وہ کس وقت جاگتے ہیں۔ کچھ تو ضرور ہی ہُوا ہوگا جبتک شادی نہ ہو جاتے اسی طرح کے موانعات پیدا ہوتے رہینگے۔"

انند امائی نے ہنسکر کہا۔ "روکاوٹیں کیوں پیدا ہوں گی۔ انہیں تھوڑی دیر سو لینے دو۔ وہ آج ہی جاگ اُٹھیں گے۔ اتنے پریشان کیوں ہوتے ہو۔" (باقی باقی)

رباعیات

ہموار ہے گر تو کچھ تجھے باک نہیں — سرکش ہے اگر تو عقل و ادراک نہیں
پاتا نہیں تندخو کدورت کے سوا — دامن میں ہوا کے کچھ بجز خاک نہیں

انیس

انجام غضب کیا ہے پشیمانی ہے — تو شکل بدلتا ہے تو نادانی ہے
غُصّے سے کوئی اور نہ ہو جائیگا تو — پانی کا بخار پھر وہی پانی ہے

شوق

از غصّہ بخود پیچ دوری اینست — حسرت مفروش ناصبوری اینست
باخود در خودی رسیدن سہل است — بیخود در خود رسی حضوری اینست

گرامی

حفیظ

سیرِ دریا

نگاہ لوٹ ہے دریا کی اس روانی پر کسی جبیں پہ شکن ہے کہ لہر پانی پر
بھنور سے گردشِ چشمِ حسیں نظر آئی

ابھی نہ تھے ابھی مینڈھے اچھل پڑے دیکھو اُچھل اُچھل کے سرِ آب چل پڑے دیکھو
ضرور تند ہوا سطحِ آب پر آئی

حباب بنتے ہیں اور مٹتے ہیں ذرا چلکر کبھی چلاتا ہے پانی کبھی ہوا چلکر
ہوا کو نیند میں ڈالا جب اِنکے گھر آئی

جھلک دکھا کے وہ پھر مچھلیوں کا چھپ جانا اُچھل اُچھل کے وہ پھر شکل اپنی دکھلانا
وہ سُرخ رنگ کی مچھلی ذرا اُبھر آئی

سنول نے اُٹھ کے وہ اُوپر سے لی ہوا دیکھو اچھل کے ایک مہاشیر وہ گرا دیکھو
وہ تحتِ آب سے اک گوہ سطح پر آئی

ابھی زمین پہ کچھوا بہت بڑا تھا یہیں وہ دُھوپ لینے کو نکلا تھا اور پڑا تھا یہیں
گیا وہ بھاگ کے عورت جو اک ادھر آئی

وہ پیرتی ہوئی قازیں اُدھر کو جاتی ہیں بطیں وہ تنتی ہیں اور بال و پر ہلاتی ہیں
ہوا پہ جا کے وہ اک کنج پھر اُتر آئی

جو بان ورا ابھی مچھلی کے واسطے ڈوبا تو شک ہوا کہ یہ غوطہ اب اسکو لے ڈوبا
حباب بحر کی آنکھ آنسوؤں سے بھر آئی

چلا جو اُڑ کے تو بگلے پہ آگئی بہری وہ بچ گیا مگر انجن کو پا گئی بہری
جو اس کے سر سے ٹلی بھی تو اسکے سر آئی

چھپے بہت ہیں وہ بائیں طرف کنارے پر سفید اور سیہ اُنکے پیارے پیارے پر
اُدھر سے اُڑ کے وہ اک مرگٹی ادھر آئی

وہ سارس اور پروں کی وہ دودھیا رنگت　　وہ قد دراز وہ چونچوں کی خوشنما رنگت
سروں پہ آئی جو سرخی تو کس قدر آئی

کھلی ہے بیچ میں ریت اور ریت پر سرخاب　　دبائے بیٹھے ہیں اپنے پروں میں پر سرخاب
وہ چونک اٹھے کوئی آہٹ انہیں گر آئی

کنارے سبزہ سوار اس میں کچھ سیاہی ہے　　ردائے آب سفید اور گوٹ کاہی ہے
بلی سوار جو مچھلی کوئی ادھر آئی

نکالا سر کو وہ ناکے نے بیچ دھارے سے　　لیا مگر نے وہ بکری کو اس کنارے سے
وہ آئی پیاس بجھانے جو گھاس چر آئی

کیا ڈرا کے کسی جانور نے اندھیر آج　　تڑپ کے آ گیا کشتی میں اک مہاشیر آج
جو آئی ناؤ میں مچھلی خدا کے گھر آئی

ہر ایک ناؤ پہ سوداگروں کا ریلا ہے　　یہ سب چلے ہیں کہ اس پار ایک میلا ہے
سمٹ کے شہر کی مخلوق گھاٹ پر آئی

وہ ناؤ آئی ہے اس پر کھڑی ہے جو لڑکی　　ہوا نے پھینک دی دریا میں اوڑھنی اسکی
یہ گھاٹ پر وہی لڑکی برہنہ سر آئی

شکاریوں کی وہ ڈونگی ادھر سے آئی ہے　　جو پھینکا جال تو جھٹکے سے ڈگمگائی ہے
کھنچی وہ جال میں مچھلی چمک نظر آئی

شعاع مہر سے پانی ہے آب زر گویا　　ہے مچھلیوں کے رخوں پر نقاب زر گویا
فلک سے دھوپ جو آئی تو لیکے زر آئی

وہ عکس مہر نے جلوہ دکھایا پانی میں　　کسی حسین نے غوطہ لگایا پانی میں
چمک کے سامنے برق آئی موج اگر آئی

چمک ہے ریت کے ذروں پہ دیکھنا انکو　　فلک پہ شب کو ستارے زمین پر دن کو
ہے مہر چرخ پہ ضو خاک پر اتر آئی

یہاں کی سیر نے کھائی ہیں دیر کی اسوقت　　چلو بھی شوق کہ گھبرا گیا ہے جی اس وقت
سحر کو گھر سے جو نکلے تو دوپہر آئی

شوق قدوائی

بہارستان

انتظار:۔ برسات کی کالی گھنگھور گھٹائیں بھی گزر گئیں پہاڑوں کی غاروں سے آنیوالی ندیاں اور نالے بھی چپ ہو گئے لیکن تم ابھی تک نہیں آئے!

سرما کی سرد راتیں جن میں میں تمہارا نام لے لے کر نغموں کی دُنیا بسایا کرتی ہوں۔ ماضی کی ساعتوں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ دُنیا کا کاروباری چکر اُسی طریق سے چل رہا ہے۔ وقت کا نہ تھکنے والا طائر بغیر کسی طرف نگاہ ڈالے تیزی سے اُڑا جا رہا ہے لیکن مجھے احساس نہیں ہوتا کہ تم سچ مچ آ رہے ہو! میں پاگل ہو جاتی ہوں۔ اور پوچھنے لگتی ہوں۔ "پیارے تم کب آؤ گے؟"

میرے گھر سے تھوڑے فاصلے پر درگا کے مندر کا کلس آفتاب کے مانند درخشاں ہے۔ میں ہر صبح وہاں دیوی کی پرستش کے لئے جایا کرتی ہوں۔ جس وقت عبادت کے گھڑیال بجتے ہیں یا ناقوس کا ترنم فضا میں تیرنے لگتا ہے۔ میرے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں بہنے والی محبت کی ندی بیقرار ہو جاتی ہے۔ مندر کے باہر جس وقت میں پیپل کے شاندار تنے سے کچا سوت لپیٹتی ہوں، بربطِ عشق کے زرّیں تار میرے جذبات کی تنگ و دو میں کانپنے لگتے ہیں۔ اور میں سینہ اُبھار کر تمہیں دیکھنے میں سب کچھ بھول جاتی ہوں۔

بسنت کا موسم آ گیا ہے۔ دُنیا پھولوں کی ٹوکری کی طرح بیل بوٹوں سے بھر جائیگی۔ یعنی کائنات اپنا دھانی جوڑا اُتار کر سبز خلعت پہن لیگی۔ - - - - - ساتھ کھیلنے والی سہیلیاں اپنے اپنے محبت کرنے والے شوہروں کے پاس چلی جائینگی۔ اور محبت کے رقص و سرود میں محو ہو کر تکمیلِ راحت سے ہم آغوش ہو جائینگی۔ لیکن میں کب تک تمہاری راہ دیکھتی رہونگی؟"

پیارے! جس طرح پپیہا 'پی کہاں'، 'پی کہاں' کی رٹ لگائے رکھتا ہے۔ اُسی طرح میں بھی تمہاری یاد میں تڑپ رہی ہوں۔ اور تمہارے پاؤں کی چاپ ہی مجھے حاصلِ حیات ہے تمہاری جدائی میں مجھے اپنی تکمیل پر شک سا ہو رہا ہے مجھے اپنے آپ میں ایک خلا کا احساس ہو رہا ہے۔ اور سچ پوچھو تو مجھے خواب میں بھی سُکھ نہیں۔

"کیا تم نہ آؤ گے؟" اے ایشور! مجھے یہی محسوس کرنے دے کہ میں اُن کو دیکھ چکی ہوں۔ اور میرے احساسات اُن کے عکس سے معمور ہیں۔ (ترجمہ ہندی) **گیانچند طالب**

عورت کی فطرت:۔ وہ شکست جو دلفریبیوں سے معمور ہو اس فتح سے برگزیدہ تر ہے۔ جو لطافتوں سے محروم رہے۔ حسن، محبت کو ایسی ہی شکست دیتا ہے۔ عورت کی فتوحات

اس کی قوتیں نہیں۔ بلکہ اس کی وہ دلفریب کمزوریاں ہیں جن سے مرد خود مفتوح ہو جانا چاہتا ہے۔ مرد کی شکست کا راز خود اس کے " ذوقِ شکست " میں مضمر ہے۔ عورت صرف اسی صورت میں فاتح بننا چاہتی ہے۔ جب وہ دیکھتی ہے کہ مرد طالبِ شکست ہے۔ اس کے جور و تغافل کا یہی باعث ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ سمجھ لیتی ہے۔ کہ اس کا محبوب شکستوں سے محفوظ رہنا چاہتا ہے۔ وہ خود مفتوح بن جاتی ہے۔ اور یہ کوشش کرتی ہے۔ کہ اس کا محبوب فاتح بن کر اسے ابدی شکست دیدے۔ اس میں اس کی تمکنت نیاز سے بدل جاتی ہے۔ اور اس کا غرورِ نسوانی عجز و انکسار سے۔

یہ مسلّمہ ہے کہ تخلیقِ کائنات میں عورت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ مقصدِ تخلیق صرف آدمؑ تھے۔ حوّا کو ان مراحل سے کوئی تعلق نہیں۔ جنہوں نے مقاصدِ خلافت کی تکمیل کی۔ مرد ایک ہستیِ مطلق ہے لیکن عورت محض ایک " وجودِ اضافی " البتہ دُنیا میں آنے کا باعث صرف عورت ہُوئی۔ عورت کی یہ فطرت ہے۔ کہ جس امر کی ممانعت کی جائے اس کی طرف لامحالہ دوڑتی ہے۔ شجرِ ممنوع کی طرف پہلا قدم حوّا نے بڑھایا ہوگا۔ آدمؑ کی محبّت نے انہیں مجبور کر دیا۔ کہ حوّا پر نافرمانی کا الزام اور اس کی سزا عاید نہ ہو۔ اس لئے اُنہوں نے ارتکابِ جرم میں تعجیل کی۔ شیطان علم النفس کا ماہر ہے۔ اس نے عورت کی نفسیات سے باخبر ہو۔ کہ شجرِ ممنوع کی ترغیب دی ہوگی۔ وہ جانتا تھا۔ کہ عورت کو گمراہ کر دینے سے مرد خود بخود گمراہ ہو جائیگا۔

لیکن وہ گمراہیاں جن کی ذمہ دار حسن نسوانی کی لطافتیں ہوں۔ اُن ہدایتوں سے بہتر ہیں جو بدمذاق انسانوں کے وعظ و تلقین سے حاصل ہو سکیں۔ (علیگڑھ میگزین)

محبت کا منتظر ۔ مَیں صرف محبت کا منتظر ہوں کہ آخرکار اس کے ہاتھوں میں اپنے تئیں سونپ دُوں۔ یہی سبب ہے کہ اسقدر تاخیر ہوگئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسقدر متروکات کا مجرم ہوں۔ لوگ اپنے قواعد و قوانین لیکر آتے ہیں کہ مجھے پابند کریں لیکن مَیں ہمیشہ ان سے بچتا ہوں۔ کیونکہ مَیں محبت کا منتظر ہوں کہ آخرکار اپنے تئیں اس کے ہاتھوں میں سونپ دوں۔

لوگ مجھ پر الزام رکھتے ہیں۔ لاپرواہ کہتے ہیں مجھے ذرا شبہ نہیں۔ کہ وہ ٹھیک کہتے ہیں۔

بازار کا دن ختم ہوگیا ہے اور ہر ایک مشغول آدمی کا کام انجام کو پُہنچ چکا ہے۔ وہ لوگ جو مجھے یونہی فضول بلانے آتے تھے غُصّہ ہو کر واپس چلے گئے ہیں۔ (اور) مَیں صرف محبت کا منتظر ہوں کہ آخرکار اپنے تئیں اس کے ہاتھوں میں سونپ دُوں۔

(ٹیگور) (حُسن و عشق)

سورداس کے خیالات ۔ خدا کی شان حدِ ادراک سے باہر ہے۔ کیونکہ وہ نہ عقل میں سما سکتا ہے نہ زبان سے بیان ہو سکتا ہے۔ وہ لامحدود اور آنکھوں سے پنہاں ہے اس کی قدرت عجیب ہے۔ مست اور طاقتور شیر بھوکوں مرتا ہے

اور اس کے مقابلہ میں اجگر ایک جگہ بیٹھا ہوتا ہے۔ اور رزق کے لئے دوڑ دھوپ بھی نہیں کرتا۔ مگر اس کی قدرت اس کے پیٹ بھرنے کا سامان کر دیتی ہے۔ کبھی تو تنکا باوجود ہلکا ہونے کے پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ اور کبھی پتھر باوجود گرانی کے پانی پر تیرتا ہے۔ زمین کے خشک حصّے میں کبھی پانی اس کثرت سے ہو جاتا ہے کہ سمندر موج مارنے لگتا ہے۔ کبھی پتھر سے کنول کھلتا ہے۔ گویا پانی میں آگ روشن ہو جاتی ہے۔ راجہ فقیر ہو جاتا ہے۔ اور فقیر چترِ شاہی لگا کر چلتا ہے۔ سورداس اگر اس سے التجا کرتا رہے۔ تو فوراً نجاتِ ابدی حاصل ہو جائے

(زمانہ)

گھر کی ملکہ:۔ گھر ایک چھوٹی سی ریاست کے مانند ہے۔ اس ریاست کی ملکہ ہمیشہ عورت ہوتی ہے۔ جس طرح بادشاہ اپنی رعایا کا ذمہ دار ہے اسی طرح گھر کی ملکہ سارے کنبے کے آرام و آسائش کی ذمہ دار ہے۔

گھر کی ملکہ کا تاج اس کا شوہر ہے۔ شوہر کی اطاعت اس تاج کے نگینے ہیں۔ (حور)

ابوالاثر حفیظ

تبصرہ بہ اشاعات جدیدہ

صحابیات۔ یعنی ازواج النبی صلعم۔ بنات النبی۔ مہاجرات انصاریات۔ سابقات وغرائب النساء العرب کے سوانح زندگی یہ کتاب حال ہی میں ہنڈی بہاؤالدین سے شائع کی گئی ہے اس کے مؤلف ملک کے مشہور فاضل ادیب مولنا نیاز فتحپوری اپنے تبحر علمی اور ادبی کارناموں کی وجہ سے کسی مزید تعارف سے بالاتر ہیں۔ ممدوح نے شروع میں پندرہ صفحات کا ایک قابل قدر دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔ جس میں مسئلہ نسائیت کی اہمیت پر محققانہ و مؤرخانہ تبصرہ فرمایا ہے۔ اور ثابت کیا ہے۔ کہ از منۂ قدیم و جدید کے تمام ملل و ادیان اور تہذیب و تمدن نے مردوں کو صنف نازک کے ساتھ پورا انصاف کرنے کی صحیح تعلیم نہیں دی۔ اسلام اور محض اسلام ہی وہ مذہب ہے۔ جس نے عورت کی حقیقی قدر و قیمت سے دنیا کو روشناس کیا۔ اس کے چھنے ہوئے حقوق واپس دلائے۔ اور اس کے لئے ترقی و تہذیب کا راستہ کھول دیا۔ جس پر گامزن ہو کر عورت مرد کے پہلو بہ پہلو روحانیات و مادیات کی ترقیات کی تکمیل کر سکتی ہے۔ مولانا نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ان ۸۰ خوش نصیب خواتین کے سوانح نہایت خوبی سے جمع فرمائے ہیں۔ جو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت دار، یا باسیا بان دربار تھیں۔

ہمیں یقین ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے ہندوستانی خواتین بہت فایدہ اُٹھائینگی۔ اور صحابیات کے اسوۂ حسنہ کو

اپنی ترقی کی شاہراہ پر چراغ ہدایت بنائینگی۔

طرز تحریر دلچسپ بیان سُلجھا ہُوا، کتابت عمدہ، چھپائی نفیس ضخامت ۲۴۰ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶/۸ قیمت صرف عہ/ صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ پنڈی بہاؤالدین سے طلب فرمائیں۔

حور۔ یہ رسالہ زیر ادارت بیگم صاحبہ جناب صدیق انصاری کلکتہ سے شائع ہوتا ہے۔ ہم نے اس کا مسلسل مطالعہ کیا ہے۔ اور ہماری رائے ہے کہ مضامین اور ترتیب کے لحاظ سے حور زنانہ رسائل میں بہت سربلند ہے۔ خواتین اس سے ضرور فائدہ اُٹھائیں۔ حجم ۴۲ صفحات تقطیع ۲۰×۳۰/۸ کاغذ ہلکا سفید لکھائی چھپائی بہت اچھی، سالانہ چندہ تین روپے منیجر رسالہ حور ۲۲ کولوٹولہ سٹریٹ کلکتہ سے منگوائیے۔

سوزوساز۔ علمی۔ ادبی۔ تاریخی۔ طبی۔ مذہبی۔ قومی اخلاقی تمدنی۔ سیاسی اور معاشرتی، اتنے مضامین کا ایک واحد ماہوار رسالہ ہے۔ جناب ملک الکلام قوی امروہی اس کے مالک اور مدیر ہیں۔ جو پوری تندہی سے اس رسالے کو کامیاب بنانے میں کوشاں ہیں۔ اس کا اوّل نمبر ہمارے سامنے ہے۔ اور فی الحال ہم اس کے متعلق کوئی خاص رائے نہیں دے سکتے۔ اتنا ضرور کہینگے کہ اتنے شعبوں کا التزام و انصرام ایک ایسا ادعا ہے۔ جسے پورا کرنا محال معلوم ہوتا ہے ہمارا ناچیز مشورہ یہ ہے کہ یک در گیر و محکم گیر۔ لکھائی چھپائی اچھی۔ کاغذ ہلکا۔ حجم ۴۸ صفحے تقطیع ۱۸×۲۲/۸ چندہ سالانہ عہ/ ۔ منیجر سوزوساز دہلی سے خط وکتابت کیجئے۔

علم مجلسی۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۱۱۲ صفحات اس کتاب کو جناب عزیزالرحمن صاحب عزیز نے ترتیب دیا ہے حال میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ مختلف عنوانوں کے تحت مختلف شعراء کے عاشقانہ، ناصحانہ اور ظریفانہ اشعار مرتب نے اپنے مذاق کے مطابق جمع فرمائے ہیں شروع میں ۲۶ صفحے کا ایک دیباچہ بھی ہے۔ قیمت عہ/

مجیبیہ کتبخانہ کلاں محل دہلی سے منگوائیے۔

تکبیر:۔ مجلس دارالتصنیف دہلی نے ایک ماہوار علمی رسالہ "تکبیر" کے نام سے جاری کیا ہے۔ جس کا پہلا نمبر تبصرہ کیلئے ہمیں موصول ہوا۔ رسالہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "تکبیر" کے اغراض ومقاصد میں علوم دینیات کی اشاعت اور مسلمانوں کی تمدنی اور معاشرتی اصلاح کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مضامین قابل تعریف ہیں۔ خشک علمی مضامین کے علاوہ رسالہ کو ادبی رنگ کے مضامین غزلیات اور نظموں سے دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس رسالہ کے "جامع" جناب اکبر حیدری صاحب ہیں۔ تقطیع ۱۸×۲۲/۸ حجم ۱۶ صفحے، کاغذ ہلکا سفید۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ قیمت سالانہ دو روپے (عہ/) ملنے کا پتہ:۔

دارالتصنیف و انجمن اشاعت اسلام کٹڑہ مہرپرور دہلی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۴

قیمت سالانہ چھ روپے ۶ عہ

ہزار داستان

قیمت ششماہی ۳/۸ ، فی پرچہ ۱۰/

آنریری ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی اے (علیگ)

ایڈیٹرز:

ابوالاثر حفیظ جالندھری محمد اسمٰعیل نعیم

جلد ۴ اشاعت ماہِ اپریل سنہ ۱۹۲۴ء نمبر ۴

فہرست مضامین

بادۂ خانہ ساز

(از جناب ابو رشید عبدالمجید خاں صاحب سالک)

آج رگوں میں پھر ہے جوش بادۂ جانگداز کا ۔ پھر ہے دل و دماغ میں ولولہ کشفِ راز کا

رخشِ خیال اُڑ چلا سوئے فضائے لامکاں ۔ ہاں مرے اشہبِ قلم وقت ہے ترکتاز کا

دامنِ غم پہ لالہ کار خونِ جگر کا رنگ ہے ۔ قابلِ دید ہے کمالِ اشکِ چمن طراز کا

نغمہ زنِ ازل تھا کیا شعلہ نوا کہ آج تک ۔ قلب ہے لذّت آشنا چاشنیٔ گداز کا

بزمِ سرور میں بھی ہے نغمہ مرا نوائے غم ۔ کہتے ہو سوز تم جسے پردہ ہے میرے ساز کا

طالبِ عشق سرمدی پائیگا اس سے فیض کیا ۔ شیخ تو خود خراب ہے خمکدۂ مجاز کا

سوز میں جانگدازیاں دہر میں سرفرازیاں ۔ ہمنفسو سنو پیام شعلۂ سرفراز کا

اب تو نیازِ عشق کو جنسِ وفا کی ہے تلاش ۔ کب تک اٹھاؤں ناز میں حسنِ جفا طراز کا

چشمِ بتِ فرنگ نے ہوش مرے اڑا دیئے ۔ قبلہ گیا ہوں بھول میں رخ ہو کدھر نماز کا

بزم کو ناگوار ہے کیفِ شرابِ مغربی ۔ دور ہے انجمن میں پھر بادۂ خانہ ساز کا

شاہدِ گل کی خامشی وجہ فسردگی ہوئی ۔ حسن نے پا لیا مزا عشق سے احتراز کا

کوہ سے آج کہہ دیا ہنس کے اک آبشار نے ۔ چھوڑ دے اب سکوں کہ ہے دور خرام ناز کا

تیرا خمیر سرکشی میری سرشت عاشقی ۔ تجھ کو غرور ناز کا مجھ کو شرف نیاز کا

تجھ سے دعا ہے اے خدا سالکِ بے نصیب کی
سرمہ نصیب چشم ہو گردِ رہِ حجاز کا

فریبِ عشق

(۱)

خوبصورت تارا دیکھنے والوں کو اٹھارہ برس کی جوان لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس کی عمر سولہ برس سے بھی چند مہینے کم تھی۔ وہ گلشنِ دلربائی کا ایک ایسا شگفتہ پھول معلوم ہوتی تھی۔ جس کو کھلے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ وہ حسین تھی مگر اس کو یہ خبر نہ تھی کہ اس کا جمال دلوں پر کس طرح بجلیاں گرا رہا ہے۔ الّھڑ مٹھائی اور کھلونوں سے بہل جانے والی بچوں کی طرح کھیل کود کی شائق۔ وہ عام پارسی لڑکیوں کی طرح دیدہ دلیر اور چالاک نہ تھی۔ البتہ اس میں ملنساری اور بے تکلفی کا میلان قدرے زیادہ تھا۔

وہ ابھی ابھی سکول سے تعلیم حاصل کر کے نکلی تھی۔ اور اس خوشی میں اس کے دولتمند باپ مسٹر رستم جی نے اپنے چند بے تکلف دوستوں کو مختصر سی دعوت دی۔ اس دعوت میں نریمان بھی مدعو کیا گیا۔ اور اس کا باپ بھی جو بمبئی کا مشہور کروڑپتی مہاجن تھا۔

کھانا کھانے کے دوران میں تارا مہمانوں سے نہایت بے تکلفی سے گفتگو کرتی رہی۔ اس کی گفتگو کا موضوع سکول کی دلچسپیاں ہمجولیوں کے تذکرے اور قدرتی مناظر کا ذکر تھا۔ مگر اس کی پیاری پیاری باتوں میں لطف یہ تھا کہ ہر چیز کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتی تھی۔

کھانے کے بعد اس نے پیانو بجایا۔ موسیقی کے اثر سے تمام مکان گونج اٹھا۔ ریشمی گلابی ساڑھی باندھے تارا اس وقت پری نظر آتی تھی۔

بس اسی دن سے نریمان کو معلوم ہو گیا کہ وہ تارا پر جان دیتا ہے۔ فدا ہے۔ باتوں باتوں میں عشق اس کی ہستی پر حاوی ہو گیا۔ جوش و خروش کی حدوں سے گزر گیا۔ کمسن تارا کا بے پناہ حسن اس کے دل پر اثر کر گیا۔ وہ اس کی تقدیر کے فیصلے پر حاکم ہو گئی۔ رفتہ رفتہ اس کی آمد و رفت اس مکان میں بہت بڑھ گئی۔ تارا کے والدین نے بھی اس کے ارادے کو غیر مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے کہ دولتمند ہونے کے علاوہ نریمان صورت و سیرت کے لحاظ سے بھی اپنے ہمعصر نوجوانوں میں ممتاز تھا۔ اکیس سال کی عمر میں اس نے بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کر لی تھی۔ اب دو سال سے اپنے باپ کے مہاجنی کاروبار میں شریک تھا۔

وہ ہر شام اپنی موٹر میں تارا کے مکان پر حاضری دیتا اور اس کے لئے پھول اور مٹھائی لیجاتا۔ وہ اکثر [illegible] کے ایک

پھولوں سے بھرے ہوئے کنج میں بنچ پر بیٹھ کر تارا کو کوئی
دلچسپ کتاب سناتا یا پیانو پر اس کا ہم آہنگ بنتا تھا۔
وہ شام کے کھانے پر اس خاندان کی میز کا ایک ضروری
رکن ہو گیا۔

غرضکہ نریمان کی آرزوؤں کے بر آنے میں کوئی امر مانع
نہ تھا۔ مگر اسے اپنی کمسن محبوبہ سے عرض مدعا کی جرأت نہ ہوتی
تھی۔ "شاید وہ عشق کے جذبات کو سمجھ نہ سکے۔ شاید اسے محبت
کا مفہوم معلوم نہ ہو۔ شاید اسے خبر نہ ہو کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ شاید
وہ اپنے میلان کا اندازہ نہ کر سکے۔" یہ خیالات اس کے بڑھے
ہوئے جوش کو پسپا کر دیتے اور وہ اس کے سامنے دوزانو
ہوتے ہوتے رک جاتا تھا۔ پھر وہ خیال کرتا کہ ابھی جلدی
کیا ہے۔ انتظار کا لطف چند روزہ ہے۔ وصال کے بعد
امید و بیم کے لمحے ہوا ہو جائینگے۔ وہ انتظار کی غم انگیز گھڑیوں
میں ایک قسم کی لذت محسوس کرتا تھا۔

مگر اس کا عشق جنون کے درجے تک پہنچ چکا تھا۔ اس
کی راتیں ہجوم خیالات میں کروٹیں بدلتے گزر جاتی تھیں۔ وہ
آدھی رات کو بستر استراحت سے اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے حسین تخیل
میں ڈوبا ہوا کمرے میں ادھر ادھر ٹہلتا۔ حتے کہ صبح ہو جاتی۔
وہ حرف مدعا کی ہزاروں صورتیں صفحۂ دل پر بناتا اور بگاڑ دیتا تھا۔

وفور شوق سے مجبور ہو کر ایک دن اس نے تارا کی والدہ
سے تخلیہ میں ملاقات کی۔ وہ حسب توقع محبت سے پیش آئیں
اور نہایت مسرت سے اس کی درخواست منظور کر لی۔ اور
اجازت دے دی کہ وہ جس وقت چاہے تارا سے اپنی تمنا
کا اظہار کر سکتا ہے۔

یہ موقع بھی اسی شام حاصل ہو گیا۔ تارا اپنے کمرے
میں ایک صوفے پر بیٹھی تھی۔ نریمان اس کے دونوں ہاتھ تھامے
ہمہ تن گویائی بنا ہوا تھا۔

پہلے پہل تو وہ کانپ سی گئی۔ شرم سے اس کا چہرہ
گلابی ہو گیا۔ لیکن پھر نہایت بھولے پن کے ساتھ حیرت
سے نریمان کا منہ تکنے لگی۔ جب وہ اپنی بیتابی کا حال بیان
کر چکا تو ہنسکر بولی۔ "تو کیا آپ واقعی مجھ سے بہت جلد شادی
کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں کیا تم بھی چاہتی ہو۔ کیا تمہاری مرضی بھی ہے؟"
تارا کچھ سوچنے لگی۔ نریمان امید و بیم کی تصویر بن گیا۔
اس کی نبض تیز تیز چل رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے
دھڑک رہا تھا۔ ہزاروں وسوسے اس کے دل میں گزر رہے
تھے۔ "کیا اس نے ابھی تک اپنے دل سے فیصلہ نہیں کیا۔"
"کیا اسے ابھی تک محبت کا احساس نہیں ہوا۔ کیا میں جلدبازی
کر رہا ہوں۔ کیا یہ میرے دل کی اصل حالت کو سمجھ بھی سکتی ہے؟"

لیکن یکلخت اسکے یہ خیالات مسرت بے پایاں سے
بدل گئے۔ کیونکہ تارا کھلکھلا کر ہنسی اور دونوں ہاتھ نریمان کے
شانوں پر رکھ دئے۔ "ارے تم مجھے پیار کرتے ہو تم بہت

نیک ہو۔ ابّا جان تم کو نیک سمجھتے ہیں۔ امّاں جان بھی تمہاری
لیاقت کی تعریف کرتی ہیں۔"

نریمان نے پوچھا "کیا تم بھی ؟"

"ہاں میں بھی تم کو بہت اچھا بہت نیک جانتی ہوں
تم میرے لئے پھول لاتے ہو۔ تم مجھے کہانیاں سناتے ہو
تم بہت اچھے ہو۔

نریمان نے دل کڑا کرکے مکرر کہا۔ کیا تم مجھ سے شادی
کرنے کو تیار ہو۔

تارا بولی میں حاضر ہوں۔

نریمان مسرت کی بیخودی میں غرق ہو گیا۔

(۲)

اس باہمی رضامندی کے بعد تارا کے والد نے ان
دونوں کی منگنی کا اعلان کرنے کے لئے ایک پُر تکلف
دعوت دینے کا سامان کیا۔ اور دوستوں اور رشتہ داروں
کو خطوط لکھے۔

دعوت سے ایک دن پیشتر نریمان کا ایک دوست
جو کالج میں اس کا ہم جماعت تھا اور بیرسٹری پاس کرنے کے
لئے ولایت چلا گیا تھا۔ واپس لوٹا یہ شخص جس کا نام فرامرز
تھا۔ پونا کا رہنے والا تھا۔ ولایت کے دوران قیام میں
اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور اب وہ بمبئی میں وکالت
کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے بشرے سے غیر معمولی ذہانت
کے آثار ہویدا تھے۔ وہ بہت خوبصورت تھا اور اس کی
آنکھوں میں ایک ایسا مقناطیسی اثر تھا۔ کہ جو اسے دیکھتا
تھا اس کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ نریمان کو اس کی دوستی پر حد سے
زیادہ ناز تھا دعوت کے روز وہ اُسے بھی اپنی محبوبہ کے مکان پر
لے گیا۔ اور تارا کے خاندان کے لوگوں سے اس کا تعارف کرا دیا۔

دعوت بہت پُرتکلف اور پُر لطف تھی۔ نریمان کی مسرت
کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب مسٹر رستم جی نے مہمانوں کے سامنے
اس کے ساتھ اپنی دختر کی نسبت کا اعلان کر دیا۔ اور تین
ماہ بعد شادی کی تاریخ بھی مقرر کر دی۔

اس جلسہ میں فرامرز پر خاص نگاہیں پڑ رہی تھیں
اس کی گفتگو اس کے معلومات جدیدہ اس کے زاہد فریب جمال
کی وجہ سے ہر شخص اس سے بہت جلد مانوس ہو گیا۔ فرامرز
کی بات بات سے ذہانت اور علمیت کا اظہار ہوتا تھا مسٹر
رستم جی تو اس کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ملاقات بازدید
کے لئے اصرار کرنے لگے۔

کھانے کے بعد نریمان۔ فرامرز اور تارا تینوں پائیں باغ
میں سیر کرنے لگے گو کچھ زیادہ گفتگو نہیں ہوئی کیونکہ تارا
اس اجنبی کے سامنے کچھ جھینپی ہوئی اور غیر متوقع طور پر
کچھ خاموش معلوم ہوتی تھی۔ اور جب رخصت ہوتے وقت
وہ نریمان کے کوٹ میں گلاب کا پھول لگا رہی تھی۔ اس کے
ہاتھ کانپ رہے تھے لیکن نریمان اس کی دلفریب اداؤں

میں اسقدر محو تھا۔ کہ اس نے اس بات کا خیال تک نہیں کیا۔

دونوں دوست رخصت ہو کر گھر کی طرف چلے۔ راستے میں فرامرز نے تارا کی بہت تعریف کی۔ "آپ کی منسوبہ بالکل فرشتہ ہے۔ اس کے سراپا میں حسن اور عصمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ بیشک آپ خوش نصیب ہیں میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

نریمان نے اس کے جوش تعریف کو دوستی اور بے تکلفی پر محمول کیا۔ اور گفتگو منگنی شادی سے گزر کر تارا کے والدین کے تمول اور وسعت جائداد اور مکانوں کی کثرت تک پہنچ گئی۔

اس وقت مسٹر فرامرز کو یاد آیا کہ اسے اپنے دفتر وکالت کے لئے ایک مکان کی ضرورت ہے۔ نریمان نے وعدہ کیا کہ وہ رستم جی سے دریافت کر کے اگر کوئی اچھا مکان خالی ہوا تو اسے دلادیگا۔

اب تارا کے گھر میں نریمان ایک امتیازی شان رکھتا تھا دوسرے دن جب شام کے وقت تارا اور وہ باغ کے ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔ نریمان دفور شوق سے راز و نیاز کی باتوں میں مشغول ہو گیا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ اس کی منگیتر طول کلام سے اکتا رہی ہے۔ وہ خاموشی اور تعجب سے پوچھنے لگا۔ "کیا تم کچھ تھکی ہوئی ہو؟

تارا دلفریب ادا سے مسکرائی۔ اُسنے ایک انگڑائی لی۔

"نہیں مجھے تمہاری باتوں سے ہول آتا ہے اس طرح کی چاہت خوفناک ہے۔

نریمان اس بھولے پن پر مٹ گیا۔ اور اس نے گفتگو کو طول دینے کے لئے ہنس کر پوچھا "محبت سے ہول۔ ہول کیسا؟"

اس نے کچھ کھسیانی سی ہو کر آنکھیں جھکا لیں۔ اور پھر اپنی ساڑھی سر پر درست کرتے ہوئے بولی۔ "میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے۔ کہ عورتیں مردوں سے بے انتہا محبت کرتی ہیں اور یہ محبت پرستش بلکہ جنون کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟

نریمان کو جیسے بہانہ ہاتھ آ گیا۔ "کیا تم بھی ایسا نہ کرو گی کیا تم نہ چاہو گی؟"

تارا کے چہرے پر ایک خفیف سی غم انگیز زردی چھا گئی۔ وہ سوچنے لگی۔ پھر مسکرائی۔ "کیوں نہ چاہونگی۔ شوہر کی پرستش تو فرض ہے۔ اور تم تو بہت ہی مہربان ہو۔

یہ گفتگو یہیں ختم ہو گئی۔ کیونکہ تارا کا باپ اور مسٹر فرامرز نزدیک ہی باتیں کرتے ہوئے اس طرف آ رہے تھے۔

دونوں اُٹھ کر اس طرف بڑھے۔ مسٹر رستم جی نے مشفقانہ اور بزرگانہ انداز سے کہا۔ دیکھئے آپ کے دوست آپکو ڈھونڈھ رہے ہیں۔

فرامرز نے تارا سے ہاتھ ملانے کے بعد نریمان سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں سمندر کی سیر سے واپس آ رہا تھا خیال آیا کہ

آپ کو ساتھ لیتا چلوں۔ مکان کے متعلق بھی دریافت کرنا
ضروری تھا۔

نریمان راز و نیاز میں مکان دریافت کرنا بھول گیا تھا۔
اب اُسے یاد آیا۔ "مجھے یاد ہی نہ رہا۔ میرے خیال میں اگر
کوئی مکان ہو تو مسٹر رستم جی کو آپ سے بہتر کرایہ دار نہیں
مل سکتا۔"

رستم جی اپنے بھاری شانوں کو ہلا کر ہنسے۔ "میں سمجھا
آپ کو وکالت کے لئے دفتر کی ضرورت ہے۔ ٹھیرئے۔"
پھر کچھ سوچ کر بولے۔ تارا بیٹی کونسا مکان خالی ہے۔
تارا نہ جانے اس وقت کس خیال میں محو تھی۔ وہ اس سوال
پر چونک اُٹھی۔ "ابّا خالی مکان۔"

رستم جی نے جلدی سے کہا مجھے یاد آگیا۔ لیجئے صاحب کل مکان آپکو
مل جائیگا۔ یہاں سے بالکل نزدیک ہے۔ بیس گز کے فاصلے
پر۔ کل تارا آپ کو مکان دکھا دیگی۔

(۳)

شادی کے دن قریب آنے لگے۔ انواع و اقسام کی ریشمی
اور زردوز ساڑھیاں، نئے ملبوس، جواہر زیورات خریدے
جانے لگے۔ دھوم دھام کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دوستوں
کی طرف سے تحفے آئے۔

مسٹر فرامرز کی وکالت کا کام کچھ ایسا نہیں چلا۔ اوّل تو
نیا نیا کام، دوسرے ان کو مسٹر رستم جی کی محبت نے اپنی
طرف مشغول کر لیا۔ اور صبح و شام تارا کے گھر میں جانا ان کا روزانہ
معمول ہو گیا۔ نریمان کا مکان زیادہ فاصلے پر تھا۔ اس لئے
مسٹر فرامرز تیسرے چوتھے وہاں جاتے تھے وہ بھی گھڑی بھر
کے لئے۔

ان کا دل وہاں نہ لگتا تھا۔ اور کام کا بہانہ کر کے جلد اٹھ آتے
تھے۔ نریمان کو اپنی محبوبہ کے سوا اور کسی کا خیال ہی نہ تھا وہ
اپنی تقدیر پہ نازاں تھا۔ جوں جوں شادی کا دن قریب آتا گیا
اس کے شوق و وارفتگی میں ترقی ہوتی گئی۔ وہ خوشی کی بلندیوں
پر پرواز کر رہا تھا۔

لیکن تارا کی حالت کچھ اور تھی۔ کھیل کود ہنسی بھولاپن کی تمام
حالتیں خموشی متانت اور سنجیدگی میں تبدیل ہوگئیں۔ اگلی بشاشت اور
چمک دمک پر اُداسی کا بادل چھا گیا۔

نریمان نے اکثر دیکھا کہ باتیں کرتے کرتے اس کی آنکھوں
میں آنسو ڈبڈبا آتے۔ لیکن اس نے زیادہ پروا نہیں کی۔ خیال
کرتا تھا کہ والدین سے جدائی پر لڑکیوں کو قدرے رنج ہوا ہی
کرتا ہے۔

اتفاق سے ایک دن وہ صبح صبح کسی کام کیلئے فرامرز کے ہاں جاتے ہوئے تارا کے
مکان کے قریب سے گذرا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا اس نے
دیکھا کہ قرمزی ساڑھی پہنے اس کی محبوبہ دوسری طرف سے اپنے
مکان کی طرف جھپٹی چلی آرہی ہے۔ اس کا چہرہ بشاش معلوم
ہوتا تھا۔ اور اپنے خیال میں محو بغیر نریمان کو دیکھے اس کے

پاس سے گزر رہی چلی تھی کہ اُس نے اسے مخاطب کر لیا۔
"یہ صبح صبح کہاں کی سیر ہو رہی ہے۔ میرا تو خیال تھا آپ خوابِ نوشیں سے بیدار بھی نہیں ہوئی ہونگی۔"

تارا چونک اُٹھی اس کے چہرے کا رنگ یکلخت زرد ہو گیا۔ مُنہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

"نہیں ہیں تو ہمیشہ صبح اُٹھنے کی عادی ہوں۔ اور کچھ دنوں سے تو ۴ بجے ہی آنکھ کُھل جاتی ہے۔"

نریمان کو اس کی اس کیفیت سے تعجب سا ہوا۔ اس نے کہا" خوب۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا۔ ورنہ میں بھی اس صبح کی پُرلطف سیر میں شامل ہوا کرتا۔"

"کیوں تم کچھ بیمار ہو؟ تم کانپ رہی ہو۔"

واقعی تارا کانپ رہی تھی۔ مگر اس نے اپنے آپ سنبھالا اور کہا" نہیں کچھ یونہی سر درد ہے۔" پھر بات ٹالنے کے انداز سے پوچھا۔" کہاں جا رہے ہو؟"

"ذرا فرامرز کی طرف جا رہا ہوں۔"

تارا ہنسی اور کہا۔ دوستی بھی جی کا جنجال ہے۔ بہر حال ہو آیئے۔ واپس آکر چائے پیتے جائیے گا۔

نریمان یہاں سے چلا تو دُور سے فرامرز صاحب کے برآمدے پر نگاہ جا پڑی۔ فرامرز اس وقت برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ اور آہستہ آہستہ کچھ گنگنا رہے تھے۔ ہاتھ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا یا کوئی تصویر تھی۔ جسے بار بار دیکھتے جاتے تھے۔ نریمان پر نظر پڑتے ہی کاغذ کا ٹکڑا جیب میں ڈال لیا۔ اور مُسکراتے ہوئے چبوترے سے اُتر کر مصافحہ کرنے کو بڑھے۔ اور تپاک سے بولے۔" اہا صبح صبح کہاں کے ارادے ہیں؟"

" آپ نظر ہی نہیں آتے۔ وہ تو شکر ہے کہ آپ پیاری تارا کے مکان کے قریب ہی رہتے ہیں۔ ورنہ ملاقات ہی نہ ہوتی"

یہ کہتے ہوئے نریمان فرامرز کے ساتھ برآمدے کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ برآمدے میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں دونوں بیٹھ گئے۔

فرامرز نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ غرض تو ملاقات ہی سے ہے۔ آپ کے مکان پر نہ سہی آپ کی محبوبہ کے مکان پر سہی اور سچ پوچھو تو مجھ ایسے نکمے اور عشق و محبت سے بے بہرہ آدمی سے آپ کو ملاقات کا لطف کیا خاک ملتا ہوگا۔

نریمان نے جیسے اس کی بات سُنی ہی نہیں۔ وہ اسوقت غور سے زمین پر پڑی ہوئی ایک جڑاؤ الپین کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اسی طرح کی ایک جڑاؤ الپین کچھ دن گزرے نریمان نے اپنی منسوبہ کی نذر کی تھی۔ جسے تارا ہمیشہ اپنے خوشنما سیاہ بالوں میں لگائے رہتی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر الپین کو اُٹھا لیا اور اپنے دوست سے پوچھنے لگا۔ یہ الپین تارا کی معلوم ہوتی ہے۔

فرامرز نے جلدی سے الپین اس کے ہاتھ سے لے لی۔

اور تعجب سے اُسے دیکھنے لگا۔

"شاید اسی کی ہو۔ کل دوپہر وہ یہاں اس کرسی پر بیٹھی تھی جہاں تم بیٹھے ہو۔ بہر حال مَیں نے اسے دیکھا نہیں۔ اچھا ہُوا آپ نے دیکھ لیا۔ ہیرا بہت خوبصورت ہے۔

نریمان اس وقت سوچ رہا تھا کہ شام کے وقت تو آلپین اس کے بالوں میں چمک رہی تھی۔ پھر اس نے خیال کیا۔ شاید کوئی دوسری ہو۔ اور گم ہوجانے کی زیادہ پروا نہ کرکے تارا نے اس کا ذکر نہ کیا ہو۔

وہ اسی خیال میں غلطاں تھا کہ فرامرز کے قہقہے نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ "کہئے آپ کی شادی میں کتنے دن باقی ہیں یار ہو خوش نصیب۔ تارا جیسی بیوی قسمت سے ملتی ہے"

نریمان نے مسرت سے اپنے دوست کا ہاتھ دباتے ہُوئے جواب دیا۔ بھائی میں واقعی خوش نصیب ہوں میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں۔ اب تو صرف دس دن باقی رہگئے ہیں

"دس دن؟" اوہو۔ فرامرز نے اس تعجب سے کہا۔ کہ نریمان اس کے لہجے سے بہت حیران ہُوا۔

پھر ہنسکر بولا یار معاف کرنا۔ ہم وکالت پیشہ لوگوں کو نسیان کا عارضہ لاحق ہوجاتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ کی شادی میں ابھی ایک مہینہ باقی ہے۔ لو مَیں نے اب تک کوئی تحفہ بھی تمہاری حسین دُلہن کے لئے نہیں خریدا۔

نریمان کو اس وقت ایسا معلوم ہُوا کہ فرامرز بناوٹی باتیں کر رہا ہے۔ مگر اس نے دل ہی دل میں اپنے خیال پر نفرین کی۔ اور جڑاؤ الپین اُٹھاتے ہُوئے جو فرامرز نے کرسی کے بازو پر رکھ دی تھی۔ بولا۔ دن یاد رکھنا۔ لو اب مَیں جانا چاہتا ہوں۔ ابّا جان کئی دن سے باہر گئے ہُوئے ہیں کل وہ آنے والے ہیں۔ اور ان کے آنے سے پیشتر مجھے دفتر کا کام ختم کردینا چاہئے۔ کیونکہ پھر مجھے کئی ہفتہ کے لئے کام سے بالکل علیحدہ رہنا پڑیگا۔

یہ کہکر وہ اُٹھ کھڑا ہُوا اور اپنے دوست سے ہاتھ ملاکر تارا کے گھر کی طرف واپس لوٹا۔

سُورج نکل آیا تھا اور تارا اپنے کمرے میں تنہا تھی۔ وہ بہت تپاک سے ملی۔ اپنے ہاتھ سے چاے بناکر پلائی۔ آلپین کے ذکر پر بہت ہنسی اور کہا یہ کل سے گم تھی۔ شاید آپ کے دوست کے ہاں گرگئی ہو۔ مَیں اکثر جب یہاں سے اُکتا جاتی ہوں۔ تو ان سے ملنے چلی جایا کرتی ہوں۔

نریمان کی بالکل تسلّی ہوگئی اور وہ ہنسی خوشی وہاں سے رُخصت ہوکر اپنے گھر آیا۔

(۴)

اسی دن شام سے کچھ پہلے بہت زور کی گھٹا اُٹھی اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ نریمان کچھ تو کام کی کثرت کے سبب جو باپ کی غیر حاضری کی وجہ سے اسے انجام دینا تھا۔ اور کچھ بارش کے سبب تارا کے ہاں نہ جاسکا پانچ بجے

جب دفتر بند ہوگیا۔ اور کلرک سب چلے گئے تو وہ چپڑاسی سے بہی کھاتے اٹھوا کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ اور حساب کی پڑتال میں مصروف ہوگیا۔ پھولوں اور بیلوں سے لدے ہوئے برآمدے سے باہر ہوا اور پانی باہم جنگ وجدل میں مصروف تھے۔ ہولناک رات تھی۔ رہ رہ کر بجلی چمکتی تھی۔ اور چمک کے ساتھ رعد کی دل ہلادینے والی گرج سنائی دیتی تھی۔ نریمان کا دل نہ جانے کیوں خود بخود بیٹھا جاتا تھا۔ وہ کام کی کثرت سے بار بار اکتا جاتا اور سگرٹ سلگا کر عناصر کے بھوتوں کی چیخ پکار سننے لگ جاتا۔ اسی عالم میں کلاک نے ۹ بجائے اب اس کا دماغ تھک گیا تھا۔ ہندسے اور حروف رجسٹر کے صفحے پر ناچتے دکھائی دیتے۔ اس نے مجبور ہو کر قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور سستانے کے لئے کرسی سے سر ٹیک کر آنکھیں بند کرلیں۔ مگر وہ تعجب سے چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اس کے دروازے پر کوئی شخص آہستہ آہستہ دستک دے رہا تھا۔ یہ سوچنے کے بغیر کہ ایسے وقت میں دستک دینے والا کون ہوسکتا ہے۔ اس نے جلدی سے کواڑ کھولا۔ سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک صدا اس کے کان میں آئی۔ "نریمان" اور دو کانپتے ہوئے نازک ہاتھ اس کی طرف بڑھے۔

"ارے۔ تارا" اور دیوانہ وار۔ وہ اسے گود میں اٹھا کر کمرے کے اندر لے آیا۔

تارا سردی سے کانپ رہی تھی۔ اس کے کپڑے پانی میں شور بور ہو رہے تھے۔

نریمان نے دونوں ہاتھوں سے اس کا بھیگا ہوا کوٹ اتارتے ہوئے محبت سے پوچھا۔

"جان من ایسے وقت میں اتنی دور تکلیف کرنے کی جرأت کیوں کی۔ میں صبح خود ہی حاضر ہو جاتا۔ اور تم تو بالکل ٹھٹھر رہی ہو۔"

سادہ لوح عاشق سمجھا کہ میں آج شام حسب معمول حاضر نہ ہوسکا تھا۔ اس لئے میری باوفا معشوقہ خود آگئی ہے۔ اس کا دل خوشی اور تفاخر کے جذبات سے لبریز تھا۔

لیکن تمہارا چہرہ کتنا اترا ہوا ہے۔ تم ضرور بیمار ہو۔ یہ کہہ کر وہ اپنا گرم کوٹ اسے اوڑھانے کے لئے کھونٹی سے اتارنے لگا۔

تارا نے کانپتی ہوئی آواز سے اسے روک دیا اور کہا۔ آپ تکلیف نہ کیجئے میں اچھی ہوں۔ بہت اچھی ہوں۔ میں آپ سے چند ضروری باتیں کہنے آئی ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے لمبا اور ٹھنڈا سانس لیا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد تھا۔ واقعی وہ بیمار تھی۔

نریمان کے دل میں ایک مبہم سا وسوسہ گزرا۔ "نہ جانے کیوں آئی ہے؟" اس کا دل اس کے حلق میں اٹک گیا۔ اور وہ چپ چاپ اس کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اس کا

مُنہ تکنے لگا۔

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ " یہ کیا کہنے والی ہے ؟"

تارا وحشی ہرنی کی طرح اس کو تک رہی تھی۔ شاید لفظ اس کے خشک گلے میں پھنس رہے تھے۔

نریمان جی کڑا کر کے بولا۔ کہو۔ کہو۔ وہ کونسی ایسی بات ہے جس کے لئے تم نے اس طوفان میں اتنی دُور سے آنے کی تکلیف گوارا کی۔ کہدو کہدو مجھ سے کیا پردہ ہے۔ "کیا گھر میں کسی سے جھگڑا ہوگیا' کوئی تم پر خفا ہُوا۔"

تارا کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔

نریمان کا طائر دل سینہ میں پھڑ پھڑایا۔ "تم رو رہی ہو وہ کونسی ایسی بات ہے سب کچھ کہدو۔ صرف یہ نہ کہنا کہ میں تمہیں پیار نہیں کرتی۔

"آہ یہی تو میں کہنا چاہتی ہوں۔ تم کو معلوم ہو جانا چاہئے تھا۔ افسوس میں نے پہلے کیوں نہ کہہ دیا۔"

نریمان کو ایسا معلوم ہُوا کہ زمین اس کے پاؤں تلے سے نکل گئی۔ وہ بالکل ساکت اس کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔

پھر وہ بولی۔ " نریمان میں نے تمہیں کبھی نہیں چاہا۔ مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ چاہت کیا ہوتی ہے۔"

نریمان یکایک کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑائے۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ تارا کی کرسی پر ٹیک دیا۔ اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔

تارا کا چہرہ بالکل سفید تھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس کی صورت پر مُردنی چھائی ہُوئی تھی۔

نریمان گلوگیر آواز سے بولا۔ کیا یہ سب خواب تھا۔ "تارا" یہ نئی بات ہے۔ کیا یہ سب مذاق تھا۔ یا اب تم مذاق کر رہی ہو۔

تارا نے ملتجی نگاہیں اس کے چہرے پر ڈالیں۔ کچھ بھی سمجھو۔ میں صاف صاف کہہ دینا چاہتی ہوں میرے دل میں تمہارے لئے کبھی وہ محبت پیدا نہیں ہُوئی جو عورت کو مرد سے ہوتی ہے۔ اب مجھے اس کا حال معلوم ہُوا اب مجھے پتہ چلا کہ میں نادانستہ طور پر تم کو دھوکا دے رہی ہوں۔ میری محبت تم سے نہیں۔ بلکہ —— یکایک ایک شبہ نریمان کے دل میں اُبھرا۔ اس نے متجسس نگاہیں ڈال کر تارا سے پوچھا۔ "خوب۔ اب تم کسی اور کو چاہتی ہو۔ وہ کون ہے؟

تارا کے چہرے پر ہلکی سی سُرخی آگئی۔

"کیا تم مجھے معاف کر دو گے۔ کیا تم نسبت توڑنے پر رضامند ہو۔"

نریمان کو غُصہ آگیا۔ تارا تم ظلم کر رہی ہو۔ تم کو اپنی چاہت کا حال بتانا پڑیگا۔ ہاں تم کو بتانا پڑیگا۔ وہ کون ہے اس نے اپنا پاؤں زور سے اس طرح زمین پر مارا کہ تارا کانپ گئی۔

"تمہیں اس کے نام جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ تم سمجھ لو کہ میں تمہارے قابل نہیں رہی تمہیں رنج ہو گا۔ نہیں نہیں میں نہیں بتا سکتی۔

نریمان ہنسا" دیکھو تارا تم میری محبت کو نہیں سمجھیں تم نہیں جانتیں۔ کہ میں تمہیں کس دل سے چاہتا ہوں۔"

پھر تھوڑی دیر ٹھیر کر اس نے پوچھا۔ وہ کون ہے؟ جس نے تم کو میری آغوش محبت سے جدا کرنے کی جرأت کی ہے۔ تم کو بتانا پڑیگا۔

تم اس طرح نسبت کو نہیں توڑ سکتیں۔ یہ مقدس عہد ہے۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔

مجھے اس کا نام جاننا چاہیئے۔

یکایک اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ اور اس خیال نے اس کے اندرونی جذبات کی گہرائیوں میں ہلچل ڈال دی۔

کیا وہ فرامرز ہے؟

یہ نام اس طرح اس کی زبان سے نکلا کہ تارا لرز گئی۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ اس کے منہ سے بے ساختہ ہاں نکل گئی۔ اب نریمان سب کچھ سمجھ گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ زمین گھوم رہی ہے۔ کمرے کی ہر ایک چیز اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر خلا میں گردش کر رہی ہے۔ اب اس پر تارا کی افسردگی غمگینی کا سب حال ظاہر ہو گیا۔ اسے آپین کے واقعہ کے معنی معلوم ہو گئے۔

(۵)

وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پھر یکایک اس نے میز کی دراز کھولی۔ اس میں سے پستول نکالا۔ تارا کی طرف بھیانک نگاہ سے دیکھا۔ اور دفعتہً دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ غیظ و غضب میں اندھا ہو رہا تھا۔

نریمان نریمان۔ تم کیا کرنے چلے ہو۔ اپنے آپ کو سنبھالو تارا بیکار پکارتی رہ گئی۔ اور نریمان بارش اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

تارا بھی اس اندھیری رات میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگی۔ بارش کی بوچھاڑ منہ پر پڑ رہی تھی۔ ہوا اڑائے لئے جاتی تھی۔ بجلی کی چمک میں دور اسے نریمان بھاگتا ہوا جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اور تارا گرتی پڑتی اس کے پیچھے پیچھے چلی جاتی تھی۔ فاصلہ چشم زدن میں طے ہو گیا۔ اپنے مکان کے دروازے پر اس نے نریمان کو جا لیا۔ وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔

"نریمان رحم کرو" اس کا سانس اس کے پیٹ میں نہ سماتا تھا۔" تم کیا کرنے لگے ہو۔ کیا تم دیوانہ ہو گئے ہو۔ جاؤ تم گھر جاؤ۔" نریمان نے زور سے اپنا دامن چھڑایا اور پھر جوش میں بھرا ہوا فرامرز کے مکان کی طرف بھاگا۔ تارا بھی پیچھے پیچھے بھاگتی ہوئی چلی گئی۔

بجلی چمکی اس کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ نریمان

فرامرز کے برآمدے کے چبوترے پر چڑھ گیا۔ وہ چلائی
خُدا کے لئے میری بات سن لو۔ یہ کہتے کہتے وہ بھی چبوترے
پر چڑھ کر برآمدے میں داخل ہو گئی۔ نریمان نے جوش میں
اپنے پاؤں کی ٹھوکر لگائی۔ دروازہ کھل گیا۔

لیکن یہ کمرہ خالی تھا اور دوسرے کمرے میں سے
روشنی شیشوں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ تارا نریمان کے
بازو میں لپٹ گئی۔ اس نے اپنے کمزور اور لرزاں ہاتھوں
سے پستول چھیننے کی ناکام کوشش کی۔

"اس کو نہ مارو۔ قصور میرا ہے۔ میرا کام تمام کر دو۔"
نریمان نے پروا نہ کی اور زور سے دروازہ پر دستک دی۔
اندر سے کسی نے انگریزی زبان میں کہا "کون؟"
مگر یہ آواز فرامرز کی نہ تھی۔ بلکہ کسی عورت کی معلوم ہوتی تھی
نریمان پھر پکارا "دروازہ کھول دو۔"
چٹخنی کے اُٹھنے کی آواز آئی۔ اور دروازہ کھل گیا۔
تارا اور نریمان یکایک دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ یہ ایک
انگریز خاتون تھی۔ جو حیرت سے ان دونوں کا منہ تک رہی تھی
"آپ کون ہیں؟ میرے شوہر مسٹر فرامرز شام سے کسی
نامعلوم جگہ چلے گئے ہیں۔ وہ بتا کر بھی نہیں گئے۔"
نریمان اور تارا دونوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا
"آپ کے شوہر"
ہاں انہوں نے ولایت میں مجھ سے شادی کر لی تھی۔

پھر وہ مجھے چھوڑ کر بغیر اطلاع دیئے وہاں سے چلے آئے ہیں
میں آج شام ہی یہاں پہنچی ہوں۔
عورت کی آنکھوں سے غمگینی اور حسرت ٹپک رہی تھی۔
تارا کے سینے سے ہلکی سی آہ نکلی۔ اور وہ بیہوش ہو کر گر گئی
نریمان نے پستول جیب میں ڈال لیا۔ اور تارا کو
سنبھالتے ہوئے اس نے انگریز خاتون سے کہا۔
"معاف کیجئے گا۔ ہمیں آپ کی شادی کے متعلق کچھ
معلوم نہ تھا میرا نام نریمان ہے۔ کیا آپ مجھے مدد دینگی۔
میں آپ کو حیرت انگیز افسانہ سناؤنگا۔

(۶)

دو دن کے بعد حالات بالکل متغیر نظر آتے۔ "فرامرز"
فیشن اور جذبات کا بندہ فرامرز اپنی انگریزی بیوی
کے اثر سے مرعوب ہو کر کہیں چلا گیا تھا۔ تارا کی آنکھوں
کے آگے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ جب فرامرز کی
ظاہری درخشانی کا ملمع اُترا تو نریمان کی فطری نیکی اور
خالص محبت زیادہ روشن نظر آنے لگی۔
مقررہ تاریخ پر تارا اور نریمان کی شادی
ہو گئی۔

ابو الاثر حفیظ جالندھری

چاند کی سیر

عطر بیز لالہ زار - نغمہ ریز جوئبار
حشر خیز آبشار
کیف موج بیقرار - چاندنی میں کوہسار - تھا بہار در بہار
میں یہ شانِ کردگار دیکھتا چلا گیا

شہر اور بن خموش - دشت اور چمن خموش
تن خموش من خموش
سب جہاز راں خموش کشتیٔ رواں خموش - بحرِ بے کراں خموش
اور میں بھی ہاں خموش - دیکھتا چلا گیا

دُور اور قریب چپ - ہر طرف عجیب چپ
خوشنما مہیب چپ
کائنات پر سکوت - سارا خشک و تر سکوت شور کا اثر سکوت
کچھ نہیں مگر سکوت - دیکھتا چلا گیا

وہ کنارِ آب کی - محفلیں شراب کی
مستیاں شباب کی
خواہشیں ثواب کی - کاہشیں عذاب کی - وہم اور خواب کی
زندگی حباب کی - دیکھتا چلا گیا

حُسن شانِ ناز میں - غرق احتراز میں
عاشقی نیاز میں

اس کی خود فروشیاں۔ اور سخت کوشیاں۔ صبر۔ گرم جوشیاں
اُس طرف خموشیاں۔ دیکھتا چلا گیا

پاک باز نازنیں۔ وقفِ آہِ آتشیں
مرگ و یاس در کمیں
اِک جوانِ خود پرست۔ بادۂ خودی میں مست شوخ اور دراز دست
ہیں یہ سب بلند و پست۔ دیکھتا چلا گیا

رنجشیں کدورتیں۔ برہمی کی صورتیں
زیست کی ضرورتیں
ساری آشنائیاں۔ ظاہری صفائیاں۔ باطنی برائیاں
صلح اور لڑائیاں۔ دیکھتا چلا گیا

دوست کے فراق میں۔ جوشِ اشتیاق میں
پائے چست و چاق میں
گردشوں کو باندھ کر محوِ کلفتِ سفر۔ اِک جوانِ بے جگر
دل بھر آیا۔ ہیں مگر۔ دیکھتا چلا گیا

بادشاہ کا مزار۔ جس سے عبرت آشکار
بیکسی بھی سوگوار
اور گدا کی قبر پر۔ جمع سینکڑوں بشر ہیں یہ فقر کا اثر
اور مالِ مال و زر۔ دیکھتا چلا گیا

ابوالاثر حفیظ جالندھری

راوی

میرے قدم ڈگمگائے میں صحرانشیں حرکت کا دلدادہ سکوت اور لہروں کی خاموشی میں اُترتا گیا۔ اور کہتا گیا۔ تو راوی ہے!
اگر تو واقعی راوی ہے۔ تو یہ اُداسی اور پریشانی کیوں۔ وقتوں اور صدیوں کے پھیر پھیر۵۱ تیری سطح رواں پر آئے اور بہ گئے۔
طائر وقت کھلی پھولی اور جھکی ہوئی ڈالی پر پھڑ پھڑایا اور افسوس افسوس کہتا ہوا اڑا کہ وقت کسی کا ساتھ نہیں دیتا۔ وہ
تھوڑے ہیں جو۵۲ زندہ ہیں۔ شاخ نازک ہانپنے لگی۔ اور کھل پھول ڈب ڈبائی ہوئی آنکھ سے سوز دروں کی طرح گرے اور بہ گئے
اک آوارہ لہر جو لہر نہ تھی۔ بلکہ صرف آہ سرد۔ ہوا کے زور بازو پر کروٹیں لے رہی تھی۔ آئی اور کہتی گئی میں تو آوارہ جنون
ہوں ؎ تم نہ سمجھوگے راز راوی کا۔ شان راوی کی آن راوی کی
میری پشیمانی میری جستجو اور بھی بڑھی۔ میں درد آشنا احساس عبرت کی رو میں کہتا ہی رہا راوی تو راوی ہے۔ کیا تیرا ہی
نام راوی ہے۔ وہ رنگ شباب۔ اُمنگیں۔ ولولے۔ دلسوزی اور جل ترنگ کہاں ہیں۔ کیا شاعروں کے دل۵۳ تیری لہروں
میں آ اٹکے ہیں یا تو شاعروں کے دلوں میں جا ٹھہری ہے۔ کیا تو راوی ہے۔ تیرا ہی نام راوی ہے۔
گلشن نما ویرانہ۔ حیرت فزا سکوت۔ اپنی آشنا مٹی۵۴ کے سامنے ٹمٹماتی ہوئی شمع کی طرح بھڑکا۔ "آہ وہ ہمالیہ اور وہ کلو کے
پہاڑ میں نے چھوڑے۔ میں آبشاروں میں گاتا۔ اُچھلتا کودتا۔ چٹانوں سے ٹکراتا سر پھوڑتا۔ میں امرت امرت میں کھیلتا خوشی
خوشی میدانوں کو چیرتا پھاڑتا۔ سیراب اور فنا کا لقب لیتا۔ پیارے دلنواز۔ حقیقت باز۔ محبت ساز۔ مغل آباد۵۵ کو آیا۔ کہ
آتش محبت کو چھو لونگا۔ مل لونگا۔ اور اک راہگزر کی طرح گزرتا گزر جاؤنگا۵۶۔ وہ کہاں میں کہاں۔ وہ آتش میں ٹھنڈک میں
کس کام آیا۔ اور کیا کچھ لایا۔ آہ میرا جذبہ برباد ہوگیا۔ میں افسردہ میری روح مایوس۔
اک سانس آیا اک سانس گیا۔ پھر بولا آہ میری خاموشی اس ماں کی خاموشی ہے۔ جو لوری دیتے دیتے خود سو گئی
ہو۔ آہ میری آرزو میری جستجو اسی کے لئے مضطرب ہے۔ بسمل راوی کی پرنم آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور خود رفتہ ہو کر اپنے
آنسو نہیں بہاتا گیا اور کہتا گیا۔ ہاں میں راوی ہوں میں راوی ہوں میں آباد و برباد جو کچھ بھی ہوں راوی ہوں بس راوی ہوں میرا نام راوی ہے۔

۵۱ یہ اشارہ مغلوں کے دور کی طرف ہے۔ ۵۲ مغلوں کی ابدی زندگی ۵۳ اکثر پنجابیوں نے اور خاصکر پنجابی زبان کے شاعروں نے راوی کی مدح خوانی کی
ہے۔ ۵۴ جب اس نے مجھے پنجابی دیکھا ۵۵ مقبرہ جہانگیر ۵۶ فاتح

چینی مہنت

گنگ محل

(گزشتہ سے پیوستہ)

موٹر ویسٹ انڈیا ڈاک روڈ پر جا رہا تھا۔ شمال کی طرف سے سرد ہوا چل رہی تھی۔ یہ لندن کا چینی محلہ تھا۔ بادلوں نے چاند کا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔ قریب کی بندرگاہ میں چند جہاز ساکن و جامد کھڑے تھے۔ ایک آدھ سٹیمر متحرک بھی نظر آتا تھا ایک جگہ چند چینی جوا کھیل رہے تھے کبھی کبھی کسی موٹر کے گزرنے کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ان باتوں کے باوجود رات کی خاموشی کا غلبہ زیادہ تھا۔ چینی محلّہ گہری نیند سو رہا تھا۔ موٹر کودی کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اتنے میں قریب کے گرجا سے دو دفعہ ٹن ٹن کی آواز آئی۔ ناکس نے کہا۔

ناکس۔ جو لوگ پہرہ دے رہے ہیں وہ بڑی احتیاط سے چھپے ہوئے ہونگے۔

موٹر رسّی بٹنے والوں کے میدان میں پہنچ گیا۔ ہارلے نے جواب دیا۔

ہارلے۔ ان کا فرض ہے کہ اس طرح چھپے رہیں۔ مجھے وقت ملتا تو بھیس بدل لیتا تعجب ہے کہ جلسہ زدن چاوا کے مکان پر کیوں نہیں ہوا۔

ناکس۔ زدن چاوا کون ہے؟

ہارلے۔ ایک چینی جس کے گھر میں میڈم ڈی میڈیسی مقیم ہے۔ ایک قتل کے معاملہ میں پولیس اسے گرفتار کرنے والی تھی کہ وہ روپوش ہو گیا۔ وہ آج تک روپوش ہے۔ یہ لیمپ ہے وہ سامنے دروازہ ہے۔

موٹر رُکا، ہارلے اور ناکس اُتر کر دروازہ کی طرف گئے ٹیکسی موٹر کو واپس لے گیا۔ دروازہ کُھلا تھا جس میں داخل ہو کر دونوں ایک ڈیوڑھی میں پہنچ گئے۔ ڈیوڑھی کے اندر کا دروازہ بند تھا۔

ناکس۔ اگر دربان نے ہمیں دیکھ لیا۔ تو بُرقعے لانے کی کیا ضرورت تھی۔

ہارلے۔ شاید ہمیں بُرقعے اوڑھے جاتے ہوں۔ آؤ پہن لیں۔

ناکس اور ہارلے نے بیگ سے بُرقعے نکالے اور ٹوپیاں اس میں بند کر دیں۔ دونوں نے بُرقعے اوڑھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ سیاہ برقعوں سے دونوں کی صورت ڈراونی بن گئی تھی۔

ہارلے۔ کیا خوفناک بھوت ہے۔ ناکس تم ہوا بن گئے اپنا کارڈ تیار رکھو۔

ہارلے نے دروازہ پر دستک دی گھنٹی پر ٹمٹمل منڈھی۔

ہوتی تھی۔ اس لئے گھنٹی نہ بجی۔ ہارلے حیران رہ گیا۔
اتنے میں اُوپر سے ایک چھوٹی سی ٹوکری اُتری جس کے ساتھ ڈوری بندھی ہوئی تھی۔ ناکس نے ہارلے کا بازو پکڑ کر اسے ٹوکری دکھائی۔ ٹوکری شانوں کے قریب آکر ٹھیر گئی۔ ہارلے نے اسے پکڑ کر دیکھا تو خالی تھی۔ ناکس تو اس ٹوکری کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ لیکن ہارلے نے وہی کارڈ جس پر مہنت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ ٹوکری میں ڈال دیا۔ اور ناکس کی طرف دیکھا۔ ناکس بھی سمجھ گیا۔ اس نے دوسرا کارڈ ٹوکری میں ڈال دیا۔ ہارلے نے رسّی کو ہلایا اور ٹوکری اُوپر اُٹھ گئی۔

ہارلے اور ناکس دم بخود ہو کر انتظار کر رہے تھے کہ کیا ہوتا ہے۔ چند منٹ اسی انتظار میں گزر گئے۔ یہ لمحے ان پر بہت شاق تھے۔ اتنے میں ایک چینی نے دروازہ کھولا جو سیڑھیوں کا دروازہ تھا۔ اس نے دونوں برقعہ پوشوں کو غور سے دیکھا۔ اور واپس چلا گیا۔ ہارلے اور ناکس گھبرائے انہیں خیال ہوا۔ کہ چینی کو ان پر شبہ ہو گیا ہے۔ ناکس اکیلا ہوتا تو شاید واپس لوٹ جاتا۔ ہارلے بھی اگرچہ خوفزدہ ہو رہا تھا۔ لیکن وہیں کھڑا رہا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اور قریب تھا۔ کہ سیڑھیوں پر چڑھ جاتے۔ کہ وہی چینی لوٹ کر آیا۔ اس نے جھک کر سلام کیا۔ اور اشارہ سے کہا۔ کہ تشریف لائیے۔

ہارلے اور ناکس دونوں چینی کے پیچھے پیچھے سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ سیڑھیوں پر قالین منڈھی ہوئی تھی۔ اس لئے پاؤں کی آہٹ پیدا نہ ہوتی تھی۔ ہارلے اور ناکس کے دل سینوں میں دھڑک رہے تھے۔ اُوپر پہنچ کر تینوں ایک برآمدہ میں پہنچ گئے۔ چینی نے پردہ ہٹایا اور ہارلے اور ناکس یکے بعد دیگرے کمرہ میں داخل ہو گئے۔

اس کمرہ میں دس اشخاص کی ایک جماعت بیٹھی تھی۔ نو تو اسی قسم کے برقعوں میں ملفوف تھے۔ جیسے برقعے ہارلے اور ناکس پہن کر آئے تھے۔ دسواں شخص ایک عورت تھی۔ ان کے داخل ہونے پر دسوں اشخاص کھڑے ہو گئے۔ اور سب نے ہاتھ اس طرح اٹھا دیے کہ ان کی ہتھیلیاں ہارلے اور ناکس کے سامنے تھیں۔ یہ دیکھ کر اور یہ خیال کر کے کہ شاید ان کے سلام کا طریقہ یہی ہو۔ ہارلے اور ناکس نے بھی ہاتھ اسی طرح اُٹھا دیے۔ کہ ان کی ہتھیلیاں اس جماعت کے سامنے ہو گئیں جس پر برقعوں میں سے ایک بے معنی سی آواز نکلی۔

دس برقعہ پوش اشخاص کے درمیان عورت کچھ اس انداز سے کھڑی تھی کہ ہارلے اور ناکس کی نگاہیں بے ساختہ اس پر گڑ گئیں۔ ہارلے نے پہچان لیا تھا۔ کہ میڈم ڈی مینڈلیی یہی ہے ناکس نے بھی خیال کیا کہ یہی وہ عیار عورت ہے جس کی نسبت ہارلے نے تذکرہ کیا تھا۔ عورت گول میز کے سرے پر کھڑی تھی۔ دونوں نے خیال کیا۔ کہ اس جلسہ کی صدر وہی ہے لیکن دفعتاً ان کی نظر ایک خالی کرسی پر پڑی۔ جو اپنے مسند ہونے کا حال مُنہ سے کہہ رہی تھی۔ اس کرسی کے قریب ایک دوسری

کرسی خالی پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر دونوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مائیکل یا جولین دونوں میں سے ایک اس جلسہ کا صدر ہونے والا تھا۔ جب تمام اشخاص نے ہاتھ نیچے گرا لئے۔ تو ہارلے مسند کی طرف طرف بڑھا۔ ناکس بھی دوسری کرسی کی طرف چل دیا۔ برقعہ پوشوں نے عورت کی طرف دیکھا۔ جس نے سر جھکا دیا۔ سب لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ ہارلے اور ناکس بھی اپنی کرسیوں کے قریب پہنچ گئے تھے وہ بھی بیٹھ گئے۔

ناکس میڈم ڈی میڈیسی کے حسن سے اس قدر متاثر ہو رہا تھا کہ اس کی نگاہیں اس کے چہرہ پر جم گئیں۔ وہ میڈم کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی کشش پاتا تھا کہ اسے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ میڈم ڈی میڈیسی اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ ہارلے اور ناکس نے اسی عطر کی خوشبو بھی محسوس کی۔ جو ارغوانی لفافہ میں سونگھی گئی تھی۔

اس عورت کی فسوں ساز نگاہیں دفعتاً ہارلے کی طرف منعطف ہو گئیں۔ جس کے ساتھ ہی تمام اہلِ جلسہ کی نظریں ہارلے پر جم گئیں۔ ناکس نے بھی ہارلے کی طرف دیکھا۔ اور خیال کیا کہ ہارلے اندر ہی اندر دانت پیس رہا ہے۔ کیونکہ اب ان پر صاف روشن ہو گیا تھا کہ اہلِ جلسہ کو انکی نسبت شبہ ہو گیا ہے۔ اتنے میں میڈم ڈی میڈیسی نے مہرِ سکوت کو توڑا۔ اور نہایت لوچدار ترنم ریز شیریں اور موسیقی سے لبریز آواز میں بولی۔

"میرے دوستو! ہماری جماعت مکمل ہو گئی ہے"

اس فقرہ پر برقعوں سے ایک بے معنی سی آواز نکلی۔ اور ناکس نے سنا کہ اس کے قریب کا آدمی زور زور سے سانس لے رہا ہے۔ اس نے خیال کیا کہ نہ صرف وہ اور اسکا ساتھی خوفزدہ ہو رہے ہیں۔ بلکہ دوسرے اشخاص بھی خائف ہیں۔ میڈم ڈی میڈیسی نے اس آواز کا خیال نہ کیا۔ اور بے پروا ہو کر کہا۔

"میں تحریک کرتی ہوں۔ کہ رسم کے مطابق ہم دوسرے کمرہ میں چلیں"

میڈم نے تو یہ الفاظ کہہ دیئے لیکن برقعہ پوشوں کے انداز سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ اس چلتے فقرہ کے معنے نہیں سمجھے۔ میڈم نے کہا۔

"میرے پیچھے آؤ۔ میں راستہ بتاتی ہوں"

میڈم ڈی میڈیسی شاہانہ انداز کے ساتھ ایک دروازہ کی طرف چلی۔ باقی اشخاص نے بھی اس کی پیروی کی۔ ہارلے اور ناکس کے سوا تمام اشخاص اس دروازہ سے دوسرے کمرہ میں چلے گئے۔ اور دروازہ بند ہو گیا۔

اب ہارلے اور ناکس دونوں اس کمرہ میں تھے۔ ہارلے نے کہا۔

ہارلے۔ ناکس! تم نے دیکھا یہ لوگ ہماری ہتھیلیوں کو غور

سے دیکھ رہے تھے۔

ناکس۔ ہاں مگر اب کیا کرنا چاہئے۔

ہارلے۔ انہیں معلوم ہوگیا۔۔۔ ہم نے غلطی کی ۔۔۔

بُرقعے اتار دو۔

ہارلے اور ناکس نے برقعے اتار کر فرش پر پھینک دئیے اور پستول ہاتھ میں لیکر کھڑے ہوگئے۔ اتنے میں میڈم ڈی میڈیسی کمرہ میں داخل ہوئی۔

اس کی آنکھیں شعلہ فشانی کر رہی تھیں۔ اس کے لبوں پر مُسکراہٹ تھی۔ اور اس کا حُسن غضب ڈھا رہا تھا۔

شاید ہارلے اور ناکس کو اپنی ہزیمت کا احساس ہوگیا تھا۔ یا اس کے غیر معمولی حُسن کا افسوں تھا۔ کہ دونوں نے اپنے پستول چھپا لئے۔

میڈم نے آتے ہی اسی ترنم ریز آواز میں کہا۔

"ہاں مسٹر ہارلے کیا آپ مجھے اپنے دوست کے تعارف سے محروم رکھینگے۔ جسے اپنے ساتھ لائے ہو"

زربفت کمرہ

میڈم ڈی میڈیسی نے سیگار سلگایا۔ اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ ہارلے اور ناکس متحیر و سرگرداں کھڑے تھے انہیں سمجھ نہ آتی تھی کہ ان حالات میں کیا کریں۔ اور کیا کہیں انجمن کے ارکان جا چکے تھے۔ انہیں تسلّی تھی تو اس بات سے کہ قریب ہی پولیس کا دستہ تیار ہے۔ اور پہرہ والے ان لوگوں کا تعاقب کرینگے۔ وہ دیکھتے تھے کہ میڈم ڈی میڈیسی بلا کا دل گردہ رکھنے والی عورت ہے۔ وہ ان کی اس مداخلت بیجا سے کچھ بھی پریشان نہیں۔ دونوں اس پریشانی کے عالم میں خاموش و مبہوت ہوکر میڈم کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جو تھوڑے وقفہ کے بعد بولی۔

میڈم ڈی میڈیسی۔ مسٹر ہارلے! مجھے معلوم ہے کہ آپ یہاں کس لئے تشریف لائے ہیں۔ کیا ضرورت ہے کہ میں آپ کی تشریف آوری پر تعجب کا اظہار کروں اور پوچھوں کہ کیسے آنا ہُوا؟ آپ مُدت سے میری نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے تھے۔ کیونکہ میں شہر کے اس غیر مہذب حصہ میں رہتی ہوں۔ شاید آپ کو اس امر پر تعجب ہوگا۔ لیکن آپ کا یہ اقدام حد سے زیادہ ہے۔ یہ سراسر حماقت ہے۔

میڈم باتیں تو ہارلے سے کر رہی تھی۔ لیکن اسکی نگاہیں ناکس پر گڑی ہوئی تھیں۔ ہارلے نے جواب دیا۔

ہارلے۔ بلکہ حماقت سے بھی کچھ زیادہ سراسر گستاخی ہے۔ میں معذرت کرتا ہوں۔

میڈم کے لبوں پر شرارت آمیز تبسّم تھا۔ اسکی فسونساز نگاہیں ناکس پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس نے مُسکرا کر کہا۔

میڈم ڈی میڈیسی۔ مسٹر ہارلے! سوسائٹی میں تو آپ ہمیشہ مجھ سے کترایا کرتے ہیں۔ لیکن میرے گھر بے بُلائے مہمان ہوگئے۔

ہار لے (دانت پیس کر) ــــــ اور آپکو ایک عجیب و غریب جماعت کے ساتھ دیکھ لیا۔

میڈم ڈی میڈیسی (ناکس کی طرف دیکھ کر اور مسکرا کر) یہ ایک خفیہ انجمن ہے۔ جس کے اجلاس میرے گھر پر ہوا کرتے ہیں۔

ناکس اپنی جگہ پر دم بخود کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں میڈم کی آنکھوں میں گڑی تھیں۔ ہار لے نے دیکھا کہ میڈم ناکس کی طرف عجیب نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ اس لئے اس نے کہا۔

ہار لے۔ ناکس! کیا پتہ تھا میڈا ریل نمبر؟

ناکس چونک پڑا۔ اس نے محسوس کیا کہ میں خواب سے بیدار ہو رہا ہوں۔ لیکن اس میں اتنی طاقت نہ تھی۔ کہ ہار لے کی طرف دیکھتا۔ وہ اس حسین عورت کے حسن کی دولت لوٹ رہا تھا۔ اسے اتنی فرصت کہاں تھی۔ کہ ہار لے کی طرف دیکھتا اس نے دل ہی دل میں خیال کیا کہ اس وقت دماغ پر کون زور ڈالے۔ بلکہ وہ ہار لے کے سوال کو بھی اچھی طرح نہیں سمجھا ہار لے نے پھر کہا۔

ہار لے۔ ناکس! یاد کرو اس کی سخت ضرورت ہے۔

ناکس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ چاہتا بھی نہ تھا کہ اس پر کوئی اثر ہو۔ خوف اس کے دل سے دُور ہو گیا تھا۔ اسے خیال پیدا ہو گیا۔ کہ میڈم ڈی میڈیسی کو انہیں نقصان پہنچا کر کوئی فایدہ نہ ہو گا۔ اس لئے وہ انہیں کچھ نہ کہیگی۔ رفتہ رفتہ اس کی نظروں کے سامنے کا نظارہ وہم و خیال کی صورت اختیار کرنے لگا۔ اسے تمام اشیا مبہم سی نظر آنے لگیں۔ اسے خیال آیا کہ میں عالم رویا میں ہوں۔ اسے ہار لے کی آواز سُنائی دی۔ لیکن اس نے خیال کیا۔ کہ ہار لے بہت دُور ہے اور آواز کسی کنوئیں سے آ رہی ہے۔

ناکس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ نشہ میں ہے۔ اُس نے دیکھا کہ میڈم کی کرسی اس کے قریب آ گئی۔ پھر دفعتہً اندھیرا ہو گیا۔ اسے ایک چیخ سُنائی دی۔ ہار لے کی چیخ۔ لیکن وہ اسے بھی واہمہ سمجھا۔ پھر اسے ایک آواز سُنائی دی۔ کسی چیز کے گرنے کی آواز۔ وہ اسے بھی اہمیت نہ دے سکا پھر اس نے لگاتار آوازیں سُنیں۔ کہ ہار لے اسے مدد کیلئے بُلا رہا ہے۔ لیکن اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اپنی آنکھیں پھیر سکتا اس نے خیال کیا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ اس نے محسوس کیا کہ میں بیہوش ہو رہا ہوں۔ ایک دفعہ سنگاپور میں اُس نے بیہوشی کی دوائی سُونگھی تھی۔ اس نے اب بھی محسوس کیا کہ میرے دماغ پر پھر وہی اثر ہو رہا ہے۔ سنگاپور میں اس کی تمامتر توجہ سول سرجن کے بٹن پر تھی۔ لیکن یہاں بٹن کی جگہ میڈم کی روشن آنکھیں تھیں۔ جو اس کی نگاہوں اس کی تمام طاقتوں کا مرکز بن رہی تھیں۔ اس نے رفتہ رفتہ محسوس کیا کہ میں نیچے گر رہا ہوں۔ اور میڈم کی آنکھیں آسمان کی طرف بلند ہو رہی ہیں۔ پھر اسے میڈم ڈی میڈیسی کی لوچدار آواز سُنائی دی۔

اب اس نے دیکھا کہ روشنی سے کمرہ جگمگا رہا ہے۔ اور وہ ایسے کمرہ میں ہے۔ جس کے فرش چھت اور دیواروں پر زربفت منڈھا ہوا ہے۔ میز اور کرسیاں بھی زربفت سے منڈھی ہوئی ہیں۔ پھر اس نے بدھ کو ایک طلائی کرسی پر بیٹھے دیکھا۔

اب اس کے دماغ میں چین کا ملک ہمالیہ کی برفانی چوٹیاں دمشق کے مینار۔ گنگا کی وادی۔ وغیرہ کے نقشے پھرنے لگے

پھر اس نے دیکھا کہ زرد اقوام کی روح اس کے سامنے کھڑی ہے جس کے ہاتھ میں چمکدار تلوار پکڑی ہے۔ اس کے دیکھتے دیکھتے اس تلوار کا قبضہ آسمان پر پہنچ گیا۔ اور نوک زمین پر آ رہی یکدم اس کے سامنے فوجیں آگئیں۔ زرد رنگ کے لوگوں کی فوجیں کالوں کی فوجیں جو اس تلوار کے ایک طرف جم گئیں۔ اب سفید رنگ کے لشکر آئے اور اپنی تلوار کے دوسری طرف جم گئے۔ یہ نقشہ بھی اس کی نظروں سے محو ہوگیا

اب اس نے زرد روح کو مائیکل ہیبرن کی صورت میں دیکھا۔ اُس نے دیکھا کہ اس روح کا لباس جلد جلد بدل رہا ہے۔

اس کو طرح طرح کے گیت سنائی دیتے۔ اسے عجیب و غریب آوازیں سنائی دیں۔ اس نے دیکھا کہ مائیکل ہیبرن انگریزی قطع کا لباس پہنے اس کے قدموں میں مردہ پڑا ہے۔ گیتوں کی آواز دفعتاً دردناک ہوگئی اور گیت اور مائیکل ہیبرن کی لاش دور ہوتی چلی گئی حتے کہ گم ہوگئی۔ پھر اس نے وہی زربفت کا کمرہ دیکھا۔ میز اور کرسیاں دیکھیں۔

اسے ایک کرخت آواز سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوا۔ کہ کسی نے اسے پکارا۔ تاریکی دور ہوگئی۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ ہارلے کی آواز بھی جو اسے بلا رہا تھا۔ "ناکس ناکس" اس نے دروازہ پر دستک بھی سنی

تلاشی

تاریکی میں شمع ٹمٹماتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک شخص نظر آیا۔ ناکس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ تو ہارلے برقی لیمپ لئے نظر آیا۔ اُس نے لیمپ کی روشنی ڈال کر پوچھا "ناکس تم کہاں ہو؟"

ناکس ضعیف اور متحیر ہوکر اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ خود بھی حیران تھا کہ میں یہاں کیسے آگیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی سخت نشہ سے ہوش میں آیا ہے۔ یا عالم خواب سے عالم بیداری میں داخل ہوا ہے۔ ہارلے بولا۔

ہارلے۔ کاش میں تمہیں آگاہ کر دیتا۔

ہارلے بہت پریشان تھا۔ وہ مضمحل اور آزردہ خاطر ہو رہا تھا۔ ناکس اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ ناکس نے سُنا کہ جسے وہ دستک سمجھا تھا وہ کسی دور کے دروازہ کے توڑے جانے کی آواز تھی۔ جس پر بار بار کلہاڑے پڑ رہے تھے۔ آخر اس نے پوچھا

ناکس۔ ہارلے کیا ہوا۔ خدا کے واسطے بتاؤ کیا ہوا؟

ہارلے۔ ہوا کیا بہت کچھ ہوا۔ پہلے تو مکان کی برقی روشنیاں

گل کر دی گئیں۔ دوسرے جب تم میڈم ڈی سیڈیسی کے
حسن فسوں ساز کی خوشہ چینی کر رہے تھے کسی نے پیچھے سے
میری مشکیں کس لیں۔
ناکس (چونک کر) ہائیں! لیکن خدا کی قسم مجھے علم تک
نہیں ہوا۔
ہارلے۔ تمہیں کس طرح علم ہوتا۔ تمہاری کیفیت ہی اور تھی۔
کاش تمہیں آگاہ کیا ہوتا۔
ناکس (متعجب ہو کر) آگاہ کیا ہوتا کس بات سے آگاہ
کیا ہوتا؟
ہارلے۔ اس عیار عورت کی غیر معمولی طاقتوں سے آگاہ
کیا ہوتا۔ جس نے ہمارے ساتھ عیاری کی دیکھیں اس کا
چلتر کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ ناکس! ہوش کرو سارا
اثر زائل کر دو۔
ناکس۔ میں ایسا کر رہا ہوں یہ آواز کیا آ رہی ہے۔
ہارلے۔ ریسکس پولیس لیکر آ رہا ہے۔ دس منٹ تک پو
پھٹیگی۔ غالباً اس نے خیال کیا ہوگا۔ کہ ہم دونوں قتل ہو گئے
ناکس۔ پو پھٹیگی ہم کتنا عرصہ ــــ؟
ہارلے۔ تین یا چار گھنٹے۔ اسے بہت موقع مل گیا شاید وہ
نکل گئی ہو۔ افسوس وقت نکل گیا
ناکس۔ یہ خواب ہے یا بیداری۔ تمہاری مشکیں کس لی گئیں
لیکن ایسا کیوں کیا۔ وہ ہمیں گرفتار کرا سکتی تھی۔ کہہ دیتی کہ
ہم چور ہیں۔
ہارلے۔ وہ ایسا کر سکتی تھی لیکن اُسے معلوم کرنا تھا کہ
جولین اور بیٹرن کیا ہو گئے۔ اس لیئے جو ذرائع اس نے
مناسب خیال کیئے استعمال کر لیے۔
ناکس۔ کونسے ذرائع استعمال کیئے؟
ہارلے۔ سنو میرا دماغ چکرا رہا ہے زیادہ تشریح کا وقت نہیں
تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے میڈم ڈی سیڈیسی کے سامنے تم
سے ایک پتہ پوچھا تھا۔
ناکس۔ ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔
ہارلے۔ مجھے پتہ معلوم تھا میں نے عمداً ایسا کیا تھا تاکہ
تمہاری توجہ اس اثر سے منعطف ہو جائے جو تم پر ہو رہا تھا
ناکس۔ لیکن مجھ پر کیا خاص اثر ہو رہا تھا۔
ہارلے۔ تم پر مسمریزم ہو رہا تھا۔
ناکس۔ مسمریزم!!؟
ہارلے۔ ہاں مسمریزم ہو رہا تھا۔ اور تم پر وہ عورت مسمریزم
کر رہی تھی۔ جو حسین ہونے کے علاوہ دنیا کی بہترین مسمرائزر
ہے۔ ناکس یہ عورت بلا کی ہے۔ تم حیران ہو رہے ہو۔
ناکس۔ میں نہیں مانتا کہ مجھ پر مسمریزم کیا گیا۔ مجھ پر مسمریزم
کا اثر ہوا۔
ہارلے۔ نہیں مانتے تو اچھا بتاؤ کہ جب میری مشکیں کس
لی گئیں اور تم نے میری مدد نہ کی تو کیا ہوا؟

ناکس۔ خدا کے واسطے اس ذکر کو چھوڑو۔ مجھے معلوم ہوا کہ مجھ پر کوئی غیر معمولی اثر غالب تھا۔

ہارلے۔ بہت خطرناک اثر غالب تھا۔ اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس پر بھی یہی جادو چل جاتا۔ کئی اشخاص تم سے زیادہ قوت ارادی رکھنے والے اس کا شکار ہو چکے ہیں۔ اچھا بتاؤ تم پر کیا گزری۔

ناکس نے ان تمام امور کا ذکر کیا جو اُس نے عالمِ رویا میں دیکھے تھے۔ ہارلے نے کہا۔

ہارلے۔ میرا خیال یہی تھا ناکس! اب اسے بھی تمام باتیں معلوم ہو گئیں۔ تمام سراغ اس کے پاس پہنچ گئے۔ جو ہم نے حاصل کئے تھے۔ اس کو معلوم ہو گیا کہ اس خفیہ انجمن کے دو ارکان مارے گئے۔ اب تھانہ میڈم ڈسی میڈیسی کی تشریف آوری سے محروم رہیگا۔ وہ کسی دوسری جگہ چلی جائیگی۔

ناکس۔ لیکن اسے کس طرح خبر ہو سکتی ہے ؟

ہارلے۔ اسے تمام باتیں معلوم ہو گئیں۔ اس نے تمام باتیں تم سے معلوم کر لیں۔

اتنے میں دروازہ ٹوٹا۔ ہارلے بولا۔ "دروازہ ٹوٹ گیا۔ ادھر آؤ۔"

ہارلے برقی شمع لیکر آگے چلا ناکس اس کے پیچھے تھا۔

ایک طرف سے آواز آئی۔ "ہارلے"

یہ انسپکٹر ریسیکس کی آواز تھی۔ جو پولیس کو لیکر اندر گھس آیا تھا۔ ہارلے پکارا۔

ہارلے۔ ریسیکس! ہم دونوں خیریت سے ہیں۔

ریسیکس۔ شکر ہے آپ خیریت سے ہیں۔

ہارلے (قریب جاکر) کیا خبر ہے؟ جو لوگ یہاں سے نکلے ان کا تعاقب کیا گیا۔

ایک سپاہی۔ تعاقب! یہاں سے کون نکلا۔ کوئی باہر نہیں گیا۔ نہ اس گھر سے کوئی نکلا۔ اور نہ زون چاوا کے گھر سے۔

ہارلے۔ کوئی باہر نہیں گیا تو ابھی موقعہ ہے۔ زون چاوا کے گھر پر بھی ایک جماعت بھیج دو۔ دروازوں پر پہرے بٹھا دو۔ دونوں گھروں کو چھان مارو۔ برقی روشنی کا بٹن تلاش کرو۔

دونوں گھروں کی تلاشی ہونے لگی۔ پولیس نے کونہ کونہ اور گوشہ گوشہ چھان مارا۔ فرش فروش میز کرسی الغرض ہر چیز کی اچھی طرح دیکھ بھال کی گئی لیکن وہاں کیا تھا۔ ایک متنفس بھی نظر نہیں آیا۔ دونوں گھروں سے ناکامی ہوئی۔ اتنے میں پو پھٹی۔ ہارلے نے کہا۔

ہارلے۔ وہ کسی چور دروازہ سے نکل گئے۔

ریسیکس۔ زون چاوا کا مکان بھڑوں کا چھتا کہلاتا ہے۔

ہارلے (مسکراکر) خیر جس مقصد میں اینڈ موکیب جیسے مایوس ہو گئے۔ اگر میں کامیاب نہ ہوا تو شرمساری کی بات نہیں۔

ناکس۔ لیکن آپ تو مایوس نہیں ہوتے۔

ہارلے۔ مایوس تو نہیں ہوا۔ لیکن موقع نکل گیا۔

ہارلے ناکس اور پولیس کے آدمی لائم ہاؤس کے تھانہ میں چلے گئے۔ ناکس دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ کہ اس نے دشمن کو اہم اطلاعات دیدیں۔ لیکن وہ اس خیال سے اپنے دل کو تسلی دیتا تھا کہ ایک حسین عورت کی غیر معمولی طاقت نے اس سے ایسا کرایا۔ تھانہ میں پہنچ کر ریسیکس نے کہا۔

ریسیکس۔ مسٹر ہارلے مجھے یاد آگیا۔ رات آپ کے سکرٹری نے کئی دفعہ ٹیلیفون پر آپ کو دریافت کیا تھا۔ آخری گھنٹی دو بجے ہوئی۔

ہارلے۔ کیا کہتا تھا؟

ریسیکس۔ کہتا تھا کہ دفتر خارجہ سے ایک نہایت ضروری خط آیا ہے۔ مَیں نے اسے کہہ دیا۔ کہ اس وقت نہایت ضروری کام ہے۔ جب آئینگے تو تمہیں ٹیلیفون پر بلاؤنگا۔

ہارلے۔ ٹیلیفون پر بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ موٹر تیار ہے چلتے ہیں۔ ہم ننگ ٹری کورٹ پر اتر کر محل واردات پر چلے جانا۔ مَیں دفتر ہو کر وہاں پہنچ جاؤنگا۔

ہارلے نے ریسیکس کو قتل کی وادات کا حال سنایا تھانہ کی کتابوں پر معمولی اندراج ہوا۔ اور ناکس ہارلے ریسیکس اور خفیہ پولیس کا سارجنٹ پارٹسن چاروں موٹر پر سوار ہو گئے۔ صبح ہو رہی تھی۔ موٹر لندن کے بازاروں میں سے اڑا چلا جا رہا تھا۔ چاروں آدمی خاموش بیٹھے تھے۔ شاید وہ دل ہی دل میں اپنی ہزیمت اور ناکامیابی پر تاسف کر رہے تھے کیونکہ اس پر اسرار خفیہ انجمن کی نسبت اسقدر کاوش کے باوجود بھی فدہ بھر علم نہ ہو سکا۔ چینی مہنت اب بھی ویسا ہی تھا۔ جیسا پہلے۔ میڈم ڈی میڈیسی کے سوا انہیں اس انجمن کے کسی زندہ کارکن کے نام کا سراغ نہ ملا۔ موٹر سینٹ پال کے گرجا کے قریب سے گذرا۔

پیکن کا پیغام

ناکس اور ہارلے دفتر میں پہنچ گئے۔ ریسیکس اور پارٹسن راستے میں اتر گئے تھے۔ ہارلے نے وسکی کے دو گلاس تیار کئے۔ اتنے میں ہارلے کا سکرٹری اینوس دفتر خارجہ کا خط لیکر آ پہنچا۔ ہارلے نے لفافہ کھولا۔ اور ایک نظر ڈال کر بولا۔

ہارلے۔ آہا! اشارات میں لکھا ہے۔ ناکس مَیں ذرا عبارت بنا لوں۔

ہارلے قلم لیکر عبارت بنانے میں مشغول ہو گیا۔ ناکس اینوس سے رات کے غیر معمولی واقعات بیان کرنے لگا۔ ہارلے پھر بولا۔

ہارلے۔ چینی مہنت کی شناخت کا پہلا سراغ یہ خط پیکن کے انگریزی سفارتخانہ سے آیا ہے۔

ناکس اور اینوس ہارلے کی طرف دیکھنے لگے۔ ہارلے

اپنے کام میں مشغول تھا۔ اگرچہ کمرہ کا برقی لیمپ روشن تھا۔ لیکن باہر صبح کی روشنی بھی کافی ہوگئی تھی۔ ہارلے نے لکھا۔

ہارلے۔ غیر معمولی — انیوس ذرا دیکھو تو کون ہے؟

انیوس دوڑ کر دوسرے کمرہ میں گیا۔ جہاں ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ہارلے اپنے کام میں مشغول رہا۔ یکایک اُس نے قلم رکھ دیا۔ اور پائپ اُٹھا کر بولا۔

ہارلے۔ ناکس سُنا کوئی ٹیلیفون پر بلا رہا تھا۔ اتنے سویرے کون ہو سکتا ہے۔

ناکس۔ خُدا جانے کون ہو۔

ہارلے اپنے سکرٹری کا انتظار کر رہا تھا۔ کہ اس نے دوسرے کمرہ سے آواز دی۔

انیوس۔ میڈم ڈی میڈیسی آپ کو بلا رہی ہے

ہارلے۔ میڈم ڈی میڈیسی!!!

انیوس۔ آواز تو عورت ہی کی ہے۔

ہارلے اٹھا اور ٹیلیفون کی طرف گیا۔ ناکس بھی جا پہنچا۔ ہارلے نے ٹیلیفون کا آلہ اپنے ہاتھ میں لیا۔ ناکس نے ٹیلیفون کا دوسرا کان اپنے کان سے لگایا۔ کیونکہ اس آلہ کے دو کان تھے۔ آواز آئی۔

"میں ہوں میڈم ڈی میڈیسی معاف کیجئے میں نے آپکو اس وقت تکلیف دی لیکن آپ نے بھی میرے ستانے میں کیا کسر باقی چھوڑی ہے۔ میں ابھی ابھی لندن سے روانہ ہو جاؤنگی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی تشریف آوری کا معاوضہ ادا نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی تواضع کرنے سے قاصر رہی۔ رات ہماری انجمن کو بہت نقصان پہنچا مجھے تمام باتیں معلوم ہو چکی ہیں۔ جب آپ اور آپ کے دوست لائم ہاؤس میں تھے۔ میں اس دردناک سانحہ کا نظارہ کر رہی تھی۔ میں اتنا کھو گئی۔ کہ آپ کی اس ہوشیاری اور چالاکی کے باوجود ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا۔ میں اب جا رہی ہوں۔ شاید پھر کبھی ملاقات کا موقع مل جائے۔ ممکن ہے کہ اس وقت ہم ایک دوسرے کو زیادہ صحیح طور پر سمجھ لیں۔"

آواز بند ہوگئی۔ ہارلے سکتہ کی حالت میں کھڑا تھا۔ ناکس ششدر تھا۔ ہارلے نے ٹیلیفون کا آلہ میز پر رکھ دیا۔ اور دوسرے کمرہ میں آگیا۔ تھوڑے توقف کے بعد بولا۔

ہارلے۔ مجھے ہزیمت کا سامنا ہوا۔ اس عورت کا اس وقت مجھے بلانا میری شکست کا مضحکہ اُڑانا تھا۔ ناکس یہ عورت بڑی ہوشیار ہے۔ خُدا جانے کیوں لیکن باوجود اس مخالفت کے میں دل سے اس کی قدر کرتا ہوں۔

ناکس۔ ابھی تک تمام واقعات مخفی ہیں۔

ہارلے۔ انسپکٹر ریکس کی تحقیقات تمام واقعہ کو صاف کر دے گی اوہو جب ہم تھانہ پر تھے۔ تو میڈم ڈی میڈیسی مائیکل ہیبرن کے مکان پر تھی۔ ہمیں اس کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ ناکس! کچھ سمجھے یہ عورت کس قوم کی ہے کیا ہو

اٹلی کی معلوم ہوتی ہے؟

ناکس۔ اٹلی کی تو معلوم نہیں ہوتی۔

ہارلے۔ اٹلی میں رہ چکی ہے۔ ایک اٹلی کیا تقریباً تقریباً دنیا کے ہر ملک میں رہ چکی ہے لیکن میں سمجھ گیا ہوں۔ کہ وہ کون ہے۔

ناکس۔ یعنی کس ملک کی باشندہ ہے۔

ہارلے۔ ہاں اور اس سے ان واقعات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ چین کی رہنے والی ہے۔

ناکس۔ کیا؟

ہارلے۔ وہ چین کی رہنے والی ہے۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ ایک ایک جام، اور۔ پھر ریکس کی طرف چلیں۔

ہارلے نے پیکن کے پیغام پر ایک اور نگاہ ڈالی دونوں موٹر میں سوار ہوکر مائیکل ہیبرن کے مکان کی طرف گئے وہاں پہنچنے پر سارجنٹ پارٹس نے دروازہ کھولا۔ دونوں ڈیوڑھی میں چلے گئے۔ انسپکٹر بھی وہیں آگیا۔

ہارلے۔ ریکس! کیا معلوم کیا؟

ریکس۔ میرا خیال ہے کہ میں تمام واقعہ کو سمجھ گیا ہوں۔ یعنی میں آپ کو بتا سکتا ہوں۔ کہ اس مکان میں کیا ہوا۔

ہارلے۔ ہاں کہو۔

ریکس (دوسرے کمرے کا دروازہ کھولکر) یہاں آجایئے۔ میں تمام واقعہ سمجھا دیتا ہوں۔ اور آپ اعتراض بھی کریں۔

چاروں شخص دوسرے کمرہ میں چلے گئے۔ ریکس اپنی نوٹ بک لیکر یوں گویا ہوا۔

ریکس۔ ابھی تک ڈاکٹر نہیں آیا۔ اس کے آنے پر میرے بیان کی تصدیق ہو جائیگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شام کے وقت جولین مائیکل ہیبرن کی ملاقات کو آیا۔ میڈاویل سے تحقیقات کرنے پر معلوم ہو جائیگا۔ کہ اصلی وقت کیا تھا۔ وہ شام کے لباس میں تھا۔ اس کے پاس ایک چرمی بیگ تھا جس میں آپ کے بیان کے مطابق سیاہ برقعہ تھا۔

ہارلے۔ ہاں چرمی بیگ میں برقعہ تھا۔ ایسا ہی برقعہ مجھے مائیکل ہیبرن کی خوابگاہ سے ملا۔

ریکس۔ جولین ہیبرن کے کمرہ میں گیا۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھے باتیں کرتے رہے میں نے سگرٹ کے ٹکڑے گن کر اندازہ کیا ہے۔ کہ دونوں تقریباً نصف گھنٹہ گفتگو کرتے رہے اثنائے گفتگو میں جھگڑا ہو گیا۔ ہمیں معلوم نہیں ہو سکتا کہ جھگڑا کس بات پر ہوا۔

ہارلے۔ خیر میں سوچ سکتا ہوں۔

ریکس۔ آپ سوچ سکتے ہیں! یعنی وہ کس بات پر جھگڑے۔

ہارلے۔ یہ جھگڑا نہ تھا۔ کہو پھر کیا ہوا۔

ریکس۔ پھر ہیبرن نے اپنی میز کے دراز میں سے پستول نکالا۔ میز کی دراز ابھی تک کھلی پڑی ہے۔ پستول ایسا تھا جس کے چلنے سے دھماکا نہیں ہوتا۔ غالباً جولین نے ہیبرن کو پستول نکالتے نہیں دیکھا۔ ہیبرن نے پستول نکالکر جولین

پہ فائر کر دیا۔ جو اس کے سامنے آرام کرسی پر لیٹا تھا نشانہ دل کا کیا گیا لیکن گولی دل کے ذرا اوپر لگی۔ ایک انچ اوپر۔

ہارلے۔ مجھے معلوم ہے۔

ریکس۔ جولین گولی کھا کر اُٹھا۔ راکھ کی طشتری جو کرسی کے بازو پر دھری تھی فرش پر گر پڑی۔ جولین کے اچھلنے پر غالباً پستول ہیبرن کے ہاتھ سے گر پڑا۔ جولین نے ہیبرن کا گلا پکڑ کر اسے نیچے گرا لیا اور زخمی ہونیکے باوجود اُسکا گلا گھونٹ کر مار دیا۔

ہارلے۔ ہاں ہاں میں تمہاری تفتیش کے ساتھ متفق ہوں۔

ریکس۔ میرے خیال میں یہ ممکن ہے کہ زخمی آدمی دوسرے کو گلا گھونٹ کر مار دے۔ کیونکہ اس نے اپنے حملہ آور کی جان لینے کا عزم کر لیا تھا۔ ڈاکٹر اس پر مزید روشنی ڈالیگا۔ یہانتک تو مجھے اپنی تفتیش پر یقین ہے۔ اور اس کی شہادت میں آپ کو بہت سی چیزیں دکھا سکتا ہوں۔ اس کے بعد کے واقعات کی نسبت میں نے محض خیال سے کام لیا ہے۔ کہ جولین اپنے حملہ آور کا کام تمام کر کے دوسرے کمرہ میں گیا۔ تاکہ ٹیلیفون کرے اس نے کتاب بھی کھول لی۔ اس نے ٹیلیفون کے آلہ پر ہاتھ بھی ڈالا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ گھنٹی کرنے سے بیشتر اس کی جان پرواز کر گئی۔

ہارلے۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا۔ بلکہ اس نے دنیا کو امن کے چند اور سال بخش دیئے۔ جو جنگ کے خطرہ میں مبتلا ہو رہی تھی۔

سیاہ نشان

ریکس۔ اب ہمیں دوسرے کمرہ میں جانا چاہیئے۔ جہاں لاش پڑی ہے۔ میں نے لاش کو صرف اسی قدر ہلایا ہے۔ جسقدر مجھے اپنی تحقیقات کے لئے ضرورت تھی۔

ہارلے۔ اچھا چلو۔

چاروں اس کمرہ میں پہنچے۔ جہاں مائیکل ہیبرن کی لاش فرش پر چت پڑی تھی۔ یہاں پہنچکر ریکس ان تمام اشیاء کا حوالہ دینے لگا۔ جن سے اس نے اپنا بیان مرتب کیا تھا۔ ہارلے نے کہا۔

ہارلے۔ تم نے اس شخص کی قومیت کا اندازہ کیا؟

ریکس۔ ہم اسے بین الاقوامی کہہ سکتے ہیں۔ غالباً وہ ایشیائی تھا۔

ہارلے۔ ایشیائی یعنی چینی

ریکس۔ جیسا آپ خیال کریں۔ کیونکہ آپ کے قول کے مطابق وہ چینی مہنت کے رفقا میں سے تھا۔

ہارلے۔ ناکس! دیکھو تو پیشانی کس قدر بلند ہے یہ شخص بہت ہوشیار دانا اور مدبر معلوم ہوتا ہے۔

ناکس نے لاش کے چہرہ کو دیکھا۔ جس کی صورت گلا گھونٹ کر مرنے سے بہت متغیر ہو رہی تھی۔

ہارلے۔ دیکھا! یہ کوئی معمولی آدمی معلوم نہیں ہوتا اس کی

مٹھیاں اچھی طرح بند ہیں۔

ریکس۔ ہاں بند ہیں۔ غالباً نزع کی تکلیف سے بند ہو گئی ہوں گی۔

ہارلے۔ شاید

ہارلے بہت جوش کی حالت میں تھا۔ اس نے "شاید" کا لفظ کچھ ایسے انداز سے کہا کہ سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ سارجنٹ پارٹسن بھی جو کمرہ کے سامان کی فہرست تیار کر رہا تھا ہارلے کی طرف دیکھنے لگا۔ ہارلے نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور کہنے لگا۔

ہارلے۔ یہ ہیکن کا پیغام ہے۔ میں پورا پڑھ کر نہ سناؤں گا۔ اس میں چینی مہنت کی شناخت کا ایک سراغ لکھا ہے۔

ریکس۔ تو کیا آپ کو معلوم ہو گیا کہ وہ کون ہے؟

ہارلے۔ نہیں اس سراغ سے اس کی شناخت ہو سکتی ہے۔ اس خط میں لکھا ہے۔

"بعض مخفی وجوہ کی بنا پر اس انجمن کا افسر جسے آئی کہا جاتا ہے۔ (ناکس سے یہ چینی مہنت کا ذکر ہے) ایک خصوصیت کا نشان رکھتا ہے تاکہ انجمن والے اس کی شناخت کر سکیں۔ اس کے داہنے ہاتھ کی ہتھیلی پر ایک سیاہ داغ سا ہے جس کی چوڑائی دو انچ کے قریب ہو گی۔"

ہارلے نے کاغذ جیب میں ڈال لیا اور ناکس کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

ہارلے۔ ناکس! معلوم ہو گیا کہ وہ لوگ ہماری ہتھیلیوں کو کیوں غور سے دیکھ رہے تھے۔ غالباً ہماری ناکامی کی بڑی وجہ یہی تھی دیکھا کس طرح تمام معاملات کا ایک قلم خاتمہ ہو گیا۔

ناکس۔ اللہ! آپ کا کیا مطلب ہے ــــ

ہارلے۔ شاید میں غلط نتائج اخذ کر رہا ہوں لیکن ہم مشاہدہ اور معائنہ کر سکتے ہیں۔

ہارلے لاش کے قریب گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اس نے مائیکل ہیبرن کی داہنی مٹھی کو زور سے کھولا۔ اور پکار اٹھا۔

ہارلے۔ میرا خیال درست نکلا۔

سب نے دیکھا کہ مقتول کی ہتھیلی پر سیاہ نشان موجود ہے ہارلے کھڑا ہو گیا۔

ریکس (متعجب ہو کر) کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ چینی مہنت ـــ

ہارلے۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ چینی مہنت مقتول سے اس مکان میں مائیکل ہیبرن کے نام سے رہتا تھا۔ اور کل شام مارا گیا۔ اب اس کی لاش ہمارے سامنے پڑی ہے۔

ریکس۔ یا للعجب۔

ناکس اور پارٹسن خاموش کھڑے رہے۔

ہارلے۔ ناکس! ہمیں اب بہت پہلے یہ اندازہ کر لینا چاہیے تھا۔ رات کا جلسہ خود چینی مہنت سے ملنے کے لئے منعقد ہوا

تھا۔ صدارت کی کرسی اسی کے لئے خالی پڑی تھی۔ میں تو معمولی کارکن کی حیثیت سے گیا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ میں چینی مہنت کی جگہ جا رہا ہوں۔ خود اس انجمن کے کارکن اس کی صورت سے آشنا نہ تھے۔

ناکس۔ لیکن ان میں سے ایک تو ضرور اس کے راز سے آشنا تھا

ہارلے۔ یعنی، جولین

ناکس۔ یقیناً

ہارلے (ریبیکس سے) قبل اس کے کہ ہم دوسرے کمرہ میں جائیں۔ آپ نے دوسرے شخص کی نسبت کیا رائے قائم کی ہے۔

ریبیکس۔ میرا خیال ہے۔ کہ اس کے بال رنگے ہوئے ہیں۔ مگر مجھے یقین نہیں۔

ہارلے۔ آہا! ابرو اور پلکیں

ریبیکس۔ اگر میرا خیال درست ہے تو وہ بھی رنگی ہوئی ہیں۔

ہارلے۔ تمہارا مطلب ہے کہ اس شخص کا قدرتی رنگ اور ہے۔

ریبیکس۔ ہاں یہی

ہارلے۔ کچھ اور بتاؤ

ریبیکس۔ بس یہی کہ وہ ایشیائی معلوم نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ وہ چینی مہنت کا ساتھی تھا۔

ہارلے۔ درست! غالباً تم نے دیکھا ہوگا۔ کہ ڈائرکٹری کا وہ صفحہ کھلا ہے۔ جس پر میرا نام اور نمبر ہے۔

ریبیکس۔ میں نے اس بات کا خیال نہیں کیا۔ اس میں بھی کوئی راز ہے۔

ہارلے۔ بہت بڑا راز

چاروں اس کمرہ کے دروازہ میں کھڑے ہو گئے۔ جس میں جولین کی لاش پڑی تھی۔

ہارلے۔ ریبیکس جب تم میڈاویل میں اس کے یہاں آنے کا وقت دریافت کرنے کے لئے جاؤ گے تو میں بھی تمہارا ساتھ دوں گا۔

ریبیکس۔ ضرور چلئے اس کے کاغذات نہایت اہم ہونگے۔

ہارلے۔ غیر معمولی طور پر اہم ہونگے۔ میں سکاٹ لینڈ یارڈ میں ٹیلیفون کرنے والا ہوں۔ کہ وہاں پہرہ لگا یا جائے۔ کہیں میڈم ڈی مہیڈیسی ہم سے پہلے وہاں نہ پہنچ جائے۔ اور ممکن ہے کہ وہ پہنچ بھی گئی ہو۔ ریبیکس ان کمروں کی پوری حفاظت کی جائے۔ ان میں اکثر کاغذات ایسے ہونگے۔ جو نہ صرف سلطنت برطانیہ کے لئے مفید ثابت ہونگے۔ بلکہ وہ امریکہ کے لئے نہایت اہم اور ضروری ہونگے۔

ناکس ریبیکس اور پارٹس ہارلے کی باتیں سن کر سرتاپا حیرت بن رہے تھے۔ وہ اس کی باتیں سمجھنے سے قاصر تھے۔ ہارلے آگے بڑھا اور اس نے جھک کر لاش کے چہرہ کو دیکھا۔ وہ افسوس کے لہجہ میں بولا۔

ہارلے۔ کاش مجھے علم ہوتا۔ کاش مجھے علم ہو سکتا۔

ناکس کس بات کا علم ہوتا؟

ہارلے۔ کاش مجھے علم ہوتا کہ اس کے بال رنگے ہوئے ہیں۔ کاش مَیں سمجھ سکتا کہ مجھ سے بہتر آدمی نے اپنے وطن کے لئے جان دیدی ناکس! مَیں تو اس کا پاسنگ بھی نہیں ہوں۔

ہارلے ان کی طرف رُخ کر کے کھڑا ہوگیا۔ اور بولا۔

مَیں اور تم اور ہزارہا اشخاص جورات کے واقعات کا تذکرہ بھی نہ سُنیں گے۔ مَیں اور تم ان لوگوں کا احسان کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ جنھوں نے ہمیں جرمنی کے پنجہ سے نجات دلائی، چاہیے کہ ہم سفید نسل کے تمام مردوں عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ ملا کر اس شخص کی عزّت کریں جس نے سفید نسل کو جرمنی کے خطرہ سے بھی زیادہ بڑے خطرہ سے بچا لیا۔"

ناکس ریبیکس اور پارٹسن خاموش کھڑے تھے۔ اور ہارلے کی باتوں سے متاثر ہو رہے تھے لیکن سمجھ نہ سکتے تھے۔ کہ ہارلے کس چیز کو اسقدر اہمیّت دے رہا ہے۔ آخر ناکس پکار اُٹھا۔

"ہارلے! ہارلے!! مَیں سمجھ گیا"

ہارلے نے ریبیکس کی طرف دیکھا اور پُوچھا۔

ہارلے۔ تم سمجھے؟

ریبیکس۔ افسوس! مَیں قاصر ہوں

ہارلے۔ اچھا مَیں بتاتا ہوں سُنو۔

یہ ہیں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بہترین جاسوس مسٹر ریمنڈ موکیب۔ م ی ک ش

پروانے کا گیت

شب کہ تھی اِک شمع نور افشاں فروزاں بزم میں
اور اِک پروانہ گردِ شمعِ سوزاں بزم میں

تھا وہ از خود رفتہ روئے شمع تاباں دیکھ کر
جل رہا تھا اس کا دِل شعلے کو رقصاں دیکھ کر

کہہ رہا تھا جوش میں گردِ لگن وہ گھوم کر
حرف زن تھا شوق سے شعلے کے مُنہ کو چوم کر

دیکھنے والو نہ پُوچھو مجھ سے کیا ہوں کون ہوں
اِک سراپا سوز ہوں یا ایک تصویرِ جنوں

اِک پتنگا ہوں مگر سوزِ نہانی دِل میں ہے
آتشِ دوزخ کی گرمی میرے آب و گِل میں ہے

روئے روشن شمع کا غم ہو گیا میرے لئے
حُسن کا جلوہ جہنّم ہو گیا میرے لئے

درد ہے میرے لئے رنج و الم میرے لئے
سوزِ غم کے واسطے مَیں سوزِ غم میرے لئے

شمع آئی بزم میں جل جل کے رونے کے لئے ‏— اور مَیں آیا یہاں برباد ہونے کے لئے

میرا ننھا سا جگر ہے اِک شرارا آگ کا ‏— صرف دل ہی کیا، بدن میرا ہے سارا آگ کا

شمع پر مرتا ہوں میری زندگی ہے شمع سے ‏— شمع کا پروانہ ہوں مَیں لَو لگی ہے شمع سے

اُس کا جلوہ ہے نظر میں اُس کی اُلفت دل میں ہے ‏— اس کے ہر آنسو پہ مر مٹنے کی حسرت دل میں ہے

ہے وبالِ جسم اب میرا ہی جی میرے لئے ‏— موت کا آنا ہے گویا زندگی میرے لئے

جل کے مرجانا مجھے مرغوب تر جینے سے ہے ‏— دم میں جل بجھنا مناسب رات بھر جینے سے ہے

خوب ہے اے شمعِ سوزاں شکلِ نورانی تیری ‏— دل کو روشن کر رہی ہے نور افشانی تیری

شعلۂ اُلفت سے میری جان و تن کو پھونک دے ‏— پھونک دے اے شمع ساری انجمن کو پھونک دے

اور صورت کون ہے جس سے علاجِ غم کروں ‏— شمع مَیں تجھ سے لپٹ کر سوزشِ دل کم کروں

ہمتِ مردانہ شعلے کی گریباں گیر ہو ‏— سوزشِ دل جوش کر تجھ میں اگر تاثیر ہو

حسرتیں دل میں تڑپتی ہیں نکلنے کے لئے ‏— سوزِ غم رخصت کہ مَیں جاتا ہوں جلنے کے لئے

گرد پھر کر شمع کے پروانہ اتراتا رہا ‏— مثلِ موسیقار دیپک راگ وُہ گاتا رہا

شمع کے شعلے پہ گرتا تھا لپک کر چاہ سے ‏— چپ تھا وہ آتش بجاں ناآشنا تھا آہ سے

آرزوئے وصل سے آخر ہُوا بے چین وُہ ‏— شمع کی جانب نظر کی تاکہ کچھ دے چین وُہ

گرمیِ سوزِ نہاں سے اُس کو بیہوشی ہُوئی ‏— بڑھ گیا جوش اور شعلے سے ہم آغوشی ہوئی

یوں میسر اُس کو وصلِ جلوۂ جاناں نہ تھا ‏— یعنے اِک شعلہ ہی شعلہ تھا کہاں پروانہ تھا

خاک ہو کر جان کے ساتھ اُس کا سوزِ دل گیا ‏— جل بجھا وہ سوزِ اُلفت کا نتیجہ مل گیا

جل بجھا ایسا کہ پھر اُس کا نشاں کچھ بھی نہ تھا ‏— ایک چٹکی خاک تھی، باقی وہاں کچھ بھی نہ تھا

آفریں تجھ پر پتنگے رُوح تیری شاد ہو

پھر سُنا جا رُوح سے "دیپک" جو تجھ کو یاد ہو

احسن سہمی

طلسمی دھنک

پہلا رنگ دھانی

حکیم بطلیموس۔ مَیں چاہتا ہوں۔ کہ تم میری سکتر بنو۔ ذمہ داری سے کام کرو۔ اپنے فرائض سمجھ لو۔ غور کرکے رائے قائم کرو۔

مَیں۔ (انکسار سے) مجھے کچھ نہیں آتا۔ بھلا مَیں کیا خدمت کرسکونگی۔ سوائے اس کے کہ کچھ پڑھ کر سنا دوں۔ کچھ نقل کردوں

حکیم صاحب۔ تم جانتی ہو کہ مَیں علمِ قیافہ شناسی کی اصولی شاخ میں مصروف ہوں۔ مجھے دارالعلوم کے فرائض سے ذرا مہلت نہیں ملتی۔ رہا سہا وقت میری ایک خاص تصنیف کے نذر ہوجایا کرتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ موجودہ تجربات اور انکے نتائج بھی قلمبند ہوتے رہیں۔ مختصر یہ کہ اب سے تم بھی میرے تجربات میں شریک رہو۔ اور شاہد و ناظر بنکر انہیں اپنے مطمع نظر کے اعتبار سے، میرے واسطے لکھتی جاؤ۔ تجربات میرے ہوں، تصنیف تمہاری۔

مَیں۔ مجھ میں ایسی قابلیت کہاں کہ خود سے کچھ لکھ سکوں نا ممکن ہے۔ پھر بھی اپنی سی نہ اٹھا رکھونگی۔ کاش ۔ ۔ ۔ ۔

حکیم صاحب۔ کوشش کروگی۔ تو سب کچھ آسان ہوجائیگا پہلے یہ سمجھ لو کہ مَیں تم سے کیا کام لیا چاہتا ہوں۔ ذرا غرفے سے باہر دیکھو اور بتاؤ کیا نظر آرہا ہے۔

مَیں اُٹھی کھڑکی کے پاس گئی۔ باہر کی طرف نظارہ بالکل معمولی تھا۔ مَیں حیران ہوگئی۔ کیا بتاتی بول اُٹھی۔ کوئی خاص چیز تو نہیں ہے۔ پائیں باغ ہے اور اس کے پہلو میں ایک مکان ہے۔

حکیم صاحب۔ یہی تو مَیں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ لو اس علم کی الف۔ بے سے ابتدا کرو۔ پہلا سبق یاد کرلو۔ تم اس مکان کو دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ آجتک کسی آنکھ والے نے کوئی مکان دیکھا ہی نہیں جس وقت تم کسی عمارت کو پہچانتی ہو، تو اس کی سیر میں محض حسِ لامسہ اور حافظہ ہوتی ہیں نہ کہ قوتِ باصرہ پھر دیکھو۔

مَیں (گھبرا کر) توبہ! اب تو ساری عمارت ایک رنگین دھندلکے میں لپٹ کر غائب ہوگئی ہے۔

حکیم صاحب (اطمینان سے) یہی چیز تھی جو تم نے پہلے دیکھی تھی۔

مَیں (بضد ہوکر) مگر وہاں کوئی نہ کوئی مکان ضرور ہے جس نے

خود دیکھا تھا۔

حکیم صاحب۔ نہیں تو تم نے محض رنگین شکلوں کی ایک زنجیر دیکھی تھی تشریحی نقطہ سے۔ تم نے فطرت ثانیہ کی بنا پر ان شکلوں کو دیواریں سمجھ لیا۔ کھڑکیاں، دریچیاں اور دروازے سبھی کچھ نظر آ گئے۔ اور اس سے ایک قطعی جداگانہ قوت ذکر شمیہ کی مدد سے تم نے طے کر لیا کہ مکان دکھائی دیتا ہے۔ اصل میں تمہیں صرف رنگین صورتوں کا ایک سلسلہ نظر آیا تھا۔ جسکی خارجی سطح کو تمہاری حس لامسہ جسم منجمد بتا چکی تھی۔ تمہیں تعلیم دی گئی ہے۔ کہ اس طرح کی چیزیں جب ایک ساتھ جمع ہو جائیں تو ان کا مجموعی نام عمارت یا مکان ہے۔ پھر دیکھو۔

میں۔ (اچنبھے کر) مکان تو صاف دکھائی دے رہا ہے۔ وہ دھندلکا کیا ہوا؟ کہاں سے آیا تھا۔ کہاں غائب ہو گیا؟

حکیم صاحب۔ دھندلکا بھی نہ تھا محض ایک لمحہ کے لئے تمہاری قوت باصرہ بیکار ہو گئی تھی

میں۔ یہ کیوں؟ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا۔

حکیم صاحب۔ یہی تو میرا خاص موضوع ہے۔

میں۔ مسمریزمی خواب؟ (ایسی نیند جو کسی مصنوعی طریقہ سے طاری ہو جائے)

حکیم صاحب۔ نہیں یہ تو میرے خواب وخیال میں بھی نہیں (ہنس کر) تمہاری بھی کیا بھولی باتیں ہیں۔ یہ بھی ایک قسم کا نہایت سادہ اور بہت کم توجہ خیز انکشاف تھا اس سے

کہیں بڑھ کر محیر العقول تجربات ضبط تحریر میں لانے ہونگے یہ تو سہل سی ابجد ہے۔ وہ تجربات "علم الالوان" کا خالص عطر ہونگے تمہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہم اس دنیا کی کوئی چیز بجز رنگ کے نہیں دیکھ سکتے۔ جہانتک قوت باصرہ کا تعلق ہے سوائے رنگ کے اور کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہم کسی منجمد یا غیر رقیق چیز کو مطلق نہیں دیکھ سکتے۔ خوب سمجھ رکھو۔ جب ہم سبزہ زار آبشار۔ پہاڑ، جھاڑی یا اور کسی چیز کو پہچانتے ہیں تو اصل میں ہمیں صرف الوان سلسل یا رنگین مجسمے دکھائی دیتے ہیں۔ حقیقتاً یہی بیان اصل اصول ہے۔ نہایت صاف سادہ بھی پھر بھی علم النفس اور تمام دنیا کی بنیاد اسی پر ہے۔ مرنج علم الانفعال غلط بنیوں سے شروع کیا گیا محض اس لئے کہ کس نقطہ سے ابتدا کی جائے۔ قیاس خود فریبی مناسب سمجھا گیا۔ اگر کسی کا معیار قیاس صحیح ہو تو وہ شخص دنیا کی ہر بات مدلل ومکمل طور سے ثابت کر سکتا ہے۔ ایک مسلمہ قوت (قوت متخیلہ) ہے اور اصل قوت متخیلہ محض رنگ ہے۔ انسانی دماغ میں سب سے کم ترقی یافتہ سب سے زیادہ فراموش کردہ اور ساتھ ہی ساتھ سب سے زیادہ ضروری حصہ اس کا دماغ ہے۔ اور صرف اسی چیز کا انفرادی وجود ہمیں اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ میں اپنی زبان میں اس چیز کو خیالات کا ایک رنگین گلدستہ کہتا ہوں۔ رنگ کا وجود ہرگز کسی ایسی چیز میں نہیں جسے ہم رنگین کہتے ہیں۔ بلکہ اس کا وجود محض ہمارے دماغ میں ہے۔ یعنی

خیالات کے اسی رنگین گلدستہ میں موجود ہے۔ جو علوم نظری و رُوحانی کا سرچشمہ ہے۔ نابینا انسان کو بھی رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ ہم تم آنکھیں بند کر کے بھی اندھیری کوٹھڑی میں بھی طرح طرح کے رنگ دیکھتے ہیں۔ وہی رنگین قوت متحرکہ اس مغزی اہتزازی دور کو مدد دیتی رہتی ہے۔ جو دماغ کا روحِ رواں ہے سمجھیں؟

میں۔ جی ہاں سمجھ رہی ہوں۔ نہایت دلچسپ چیز ہے۔

حکیم صاحب۔ یقینی ہے (مسکرا کر) اور میں اس کے ابتدائی اصول بول چال میں سمجھا رہا ہوں۔

علمی اصطلاحیں کہیں نہیں صرف کرتا تاکہ مبادا تمہاری نفیس مزاج طبیعت پریشان ہو جائے۔ دیکھو میں نے سب سے ہوش سنبھالا اپنے آپ کو محض علم الارواح کے لئے وقف کر رکھا ہے اور اب میں اس نتیجہ پر پہنچ ہوں کہ انسان کا تمام ہر خیال ہر حرکت چاہے بیداری و ہوشیاری میں ہو یا بیخودی و سرشاری میں صادر ہو سب کا اصل منبع متصورہ انسان کی اخلاقی پھلواری ہے۔ اسی اصول کو مدِ نظر رکھ کر میں نے یہ بھی ثابت کر لیا ہے کہ اگر خیالات کا رنگین گلدستہ باقاعدہ طور سے تعلیم دیا جائے تو نہایت آسانی و عمدگی سے خیالات و حرکات کا دفتر بنایا جا سکتا ہے یعنی متحرکہ قوتیں اور ان کے نتائج کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔ اور غیروں کے غیر تعلیم یافتہ و بیقاعدہ گلدستے ہرگز ہرگز مقابلہ کی تاب نہ لا سکینگے۔ اور صرف یہی نہیں کہ قابل گلدستہ محض قوت باصرہ کی مدد سے کام انجام دے۔ بلکہ ہر ناقابل گلدستہ کو اپنی مرضی کے موافق دُور و نزدیک سے کام کرنے کے واسطے مجبور کر سکتا ہے۔ تمام بچے بوڑھے مرد عورت اپنے اپنے گلدستہ میں ایک نہ ایک مخصوص رنگ کا پھول رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ اس ترکیبی دنیا میں کوئی ہستی کامل نہیں ہے۔ کمال ایک ناممکن الحصول وہم ہے مخصوص رنگ دماغی اضطراب یا باولے پن کا نتیجہ ہے۔ اب سمجھیں کہ نہیں

میں۔ کیا دماغی اضطراب اور باولا پن ایک ہی چیز کے لئے دو مختلف و متضاد اصطلاحیں نہیں ہیں۔

حکیم صاحب۔ ہرگز نہیں باولا پن بلاشبہ دماغی اضطراب کا دوسرا نام ہے۔ مگر اس کا عکس اس کے خلاف ہے۔ دماغی اضطراب معمول کو اضطراب سے باخبر رکھتا ہے۔ اور باولا پن صاف بتاتا ہے کہ معمول اپنے اضطراب سے بے خبر ہے۔ گو اپنے آپ کو باہوش و باخبر سمجھتا ہے اول الذکر میں ایک یا دو سے زیادہ قوائے متحرکہ اس طرح ٹکراتے کہ دوسروں کے نسبتی وزن و قیمت میں کوئی فرق نہیں آنے پایا۔ اور موخر الذکر میں دو یا دو سے زیادہ قوائے متحرکہ اس شدومد سے ٹکراتے ہیں کہ بقیہ ساری قوتیں نہ ہونے کے برابر پہنچ گئی ہیں۔

میں (پر جوش کے ساتھ) میرے سپرد کیا خدمت ہوتی ہے۔ یہ تو میری امیدوں سے زیادہ دلکش ہے حکیم صاحب جیب جناب

اُٹھے اور مجھے اشارہ کر کے کتب خانہ کے محاذ والے دروازہ میں داخل ہو گئے۔ مَیں ان کے ساتھ ہولی۔ ایک لغوسی نسوانی جھجک پیدا تو ہُوئی، مگر موصوف کی بزرگانہ مسکراہٹ آڑے آگئی۔ سوچی کہ کچھ سہی اب تو اس کام میں ہاتھ ڈال چکی۔ فوری جھجک دو ہی قدموں کے بعد اشتیاق سے بدل گئی۔ ایسے کمرہ میں پہنچی جس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ہم ایک چھوٹے سے ڈھلوان دروازہ سے داخل ہُوئے۔ اندر اندھیرا گھپ تھا۔ حکیم صاحب نے مجھے ایک آرام کرسی پر بٹھا دیا۔ یکایک سلا کمرہ جھکا جھک منوّر ہو گیا۔ اور اب ہم ایک محمودی بیضاوی گنبد میں بیٹھے ہُوئے تھے۔ جسے لغت والے کرۂ استبرقی کہہ لیں اس حیرانی نے مجھے تصویر بنا دیا۔ کہ ہماری کرسیاں گنبد کی سطحی بنیادی کرسی پر نہ تھیں۔ بلکہ نصف دیوار کی بلندی پر اس طرح نصب تھیں کہ ہر کہیں بالائے سر زیر پا پہلوؤں میں، سامنے حدِ نظر تک جدھر بھی آنکھیں اُٹھ گئیں محض صاف و شفاف سفید دیواریں نظر آتی تھیں۔ عین بالائے سر دو برقی گیند آفتاب و ماہتاب کی طرح بالکل اسی قد و قامت اسی شان و شوکت کے ساتھ جانے کیسے ہوا میں معلق تھے۔ جن کے اندر سے پُوری طاقت والی خیرہ کن برقی روشنی گنبد مذکور کو کرۂ نور بناتے ہُوئے تھی۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ مصنوعی آفتاب و ماہتاب کے چاروں طرف برابر کا فصل دیگر برابر کی قوت رکھنے والے مقناطیسی پتھروں کی دیواریں قائم ہیں۔

ہر قوت اس کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ مگر کھینچ نہیں سکتی مَیں نے عمر بھر کبھی ایک ساتھ دھوپ اور چاندنی کا سے کو دیکھی تھی۔ وہ گنگا جمنی روشنی نظر آتی۔ کہ آنکھوں کو اب تک خیال کرنے سے لطف حاصل ہوتا ہے۔

حکیم صاحب (شوق انگیز لہجہ میں) اس مقام کا رنگ کیا ہے۔

مَیں (حاضر جوابی سے) سفید۔

حکیم صاحب سپیدی کا تو کہیں نام بھی نہیں پھر دیکھو، رائے بدل لے۔ تب بتاؤ۔

مَیں (جوش بھری سرگوشی میں) دہانی۔ اور وہ بھی شگفتہ سیال۔ نرمل دہانی رنگ ہے۔ میرے پہلو سے بھی وہی لفظ بازگشت بنکر سُنائی دیا۔ دہانی، دہانی، دہانی۔

مَیں اپنی کرسی پر صبر و سکون کی دیوی بن کر بے اختیار بیٹھ رہی۔ رگ و پے میں ایک کیفیت محسوس ہُوئی صاف و شفاف الوان کا ایک ذخیرہ نظر آیا جس کی ابتدا اور انتہا کچھ نہ معلوم ہوتی تھی۔ کانوں میں ترنّم ریز صدائیں محسوس ہوئیں۔ روشنیاں مدھم ہوتی گئیں۔ مَیں مسحور ہو کر جھک پڑی۔ کسی نامعلوم جذبہ اضطرار نے رگوں میں کپکپی سی دوڑا دی محض شگفتہ دہانی رنگ کے دو ہلکے سے دھبّے دیدہ ہائے مخمور کی طرح قائم تھے۔ جن کی روشنی بتدریج بڑھ رہی تھی۔ چاروں طرف کی دھندلک گہری سیاہی سے بدلتی گئی۔ یکایک ایک ہلکی سی حرارت آمیز چمک دھبوں کا ہالہ

بن گئی۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ مگر دہانی دھبے، اب بھی رہے۔ ان کی چمک بڑھتا بھی بڑھتی گئی۔

میں (چلا کر) یہ تو چہرہ ہے انسانی چہرہ، الحذر۔ الامان۔

اے تو بہ میرے روبرو ایک گربہ چشم نوجوان کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ اتنے میں ٹھنڈی ہوا کا ایک بھرپور سرد جھونکا میرے چہرے پر سے مس کرتا ہوا گزر گیا۔ اور میں اپنے آپ میں آگئی۔ آنکھیں بھر کر دیکھنے لگی۔ یہ عجیب نظارہ رفتہ رفتہ زیادہ واضح ہوتا گیا۔ گربہ چشم نے اپنا سر ہلایا۔ اب معلوم ہوا کہ بھورے ٹسر کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ مجھے آوازوں کی بھنک سی محسوس ہوئی۔ میں ایک عالیشان کمرے میں کھڑی تھی۔ کھلے ہوئے آتشدان کے سامنے کمرہ کے اس سرے پر ایک معمر بزرگ زربفتی شال میں لپٹے لپٹائے بیٹھے تھے۔ پہلو میں وہی گربہ چشم موجود تھا۔ معمر کے ہونٹ ہلے۔ میں نے گفتگو سننے کے اشتیاق میں سانس روک لیا۔ آگے جھک پڑی۔ یکایک یہ لفظ سنائی دئے۔ . . . . میں لب گور ہوں۔ مگر تم مجھ پر دباؤ نہیں ڈال سکتے۔ یہ کہتے کہتے معمر نے اپنا ہاتھ جیب سے نکالا۔ جس میں کاغذ کا ایک پرچہ تھا۔ گربہ چشم نوجوان نے جھک کر معمر کے گھٹنوں پہ جاذب کا ٹکڑا رکھ دیا۔ تمہیں لکھنا ہوگا (مسکاری بھر کر حقارت آمیز لہجہ میں) تمہیں لکھنا ہوگا۔ معمر بزرگ کے دانت بج گئے۔ آنکھیں تڑپ اٹھیں۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے قلم لے لیا۔ کچھ لکھنا ہی چاہتا تھا کہ بار الہا حکیم بطلیموس کی صورت یکایک معمر کے پہلو میں ظاہر ہوئی۔ قلم چھن گیا۔ گربہ چشم نے ایک مہیب چیخ ماری۔ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ یکایک اس نے الماری کھولی۔ تمنچہ نکالا۔ بائیں ہاتھ سے معمر کا گلا اس زور سے گھونٹ دیا کہ نگاہیں ان دھنس گئیں۔ بزرگ کی آنکھیں ابل آئیں۔ بوڑھے جسم کو ایک خفیف سی حرکت ہوئی۔ اور بس فیصلہ ہوگیا۔ ظالم نوجوان قاتل گربہ چشم نے اب بھی بایاں ہاتھ وہیں رہنے دیا۔ داہنا ہاتھ مع تمنچہ کے کنپٹیوں تک بلند ہوا اور پھر . . . . . .

حکیم صاحب ۔ بازغہ خانم۔ تمہارا شکریہ۔ آؤ اب نشستگاہ میں واپس چلیں۔

میری زبان بند ہوگئی۔ میں آئینہ صفت حیران رہ گئی۔ دیکھا تو گنبد کے چبوترہ پر کھڑی ہوں۔ نصیب اچھے تھے۔ موصوف نے مجھے اس کشمکش سے فوراً نجات دے دی۔

"جرجی سے کہہ دو۔ کہ مجھ سے کتبخانہ میں مل جائیں میں فوراً ہی تم سے آملونگا۔"

اب میں نشستگاہ میں اکیلی تھی۔ وہ کیفیت تھی۔ کہ گویا میں کسی دوسری دنیا میں ہوں۔ روح میں نئی قوت دماغ میں نئی فرحت آنکھوں میں نئی بصارت قلب و جگر میں نئی لذت محسوس کر رہی تھی۔ ہارمونیم کے پاس بیٹھ گئی۔ سامنے حکیم صاحب کی معرکتہ الآرا نظم "رقص روح فطرت" کھلی تھی میں نے

باجہ کی کنجیاں کھولیں۔ نظم دیکھ کر گنگنائی۔ اور یونہی پردوں پر انگلیاں دوڑانے لگی۔ دھن ایسی ٹیڑھی کہ خود بجانا کیسا کبھی سُنی بھی نہ تھی۔ اب کیا کرتی۔ سوچنے بھی نہ پائی تھی کہ جادو بھری مدہوشی سے ترنّم نوازی میں محو ہو گئی۔ انگلیوں اور کلائیوں کی طلسمی چلت پھرت زبان بے زبانی سے بتا رہی تھی۔ کہ ان میں برقی تاثیر دوڑتی پھر رہی ہے۔

حکیم صاحب (جیسے ہی میں ختم کر چکی) شاباش۔ کتنے ستھرے طریقہ سے بجایا ہے۔ کیا پاکیزہ دھن تھی۔

جواب میں میں نے آنکھیں اٹھائیں۔ اور جریدہ کو اپنے اُوپر جھکا ہوا پایا۔ چہرہ سے انتہائی مسرت جھلک رہی تھی "کیا تم نے ایک سرسری نظر ڈال کر ساری نظم زبانی الاپ دی ہے"

میں (ہنسکر) نہیں تو۔ نظم یہ کیا کھلی ہوئی سامنے رکھی ہے جریدہ کھلی ہوئی تو ہے مگر صفحہ بھی پہلا ہی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا۔ تم نے ایک بار بھی نہیں اُلٹا۔

حکیم صاحب۔ میرے خیال میں اب بازغہ کو گھر جانے کی لگی ہوئی ہوگی (بولنے کی نوبت بھی نہ آئی کہ موصوف مجھے برآمدہ تک لیتے چلے آئے) میں فی ہفتہ چار اشرفیاں نذر کرونگا اگر قبول ہو تو کلام البرق (نون) کی زبانی کہہ دینا۔

فی ہفتہ چار اشرفیاں! اور میری انتہائی ہوس محض دو تھیں!

میں اپنی اسی کیفیت میں ڈوبی ہوئی گھر پہنچی۔ جو گنبد سے نکلنے کے بعد برابر محسوس ہو رہی تھی۔ بستر پر دراز ہو کر سہ پہر کے تجربہ کو سوچنے لگی۔ آخر میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا کہ سب خواب و خیال تھا محض وفورِ تصور و ہیجانِ فکر کا نتیجہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ جوانی کی نیند مشہور ہے میں سوئی اور ایسی کہ کروٹ بدلنا بھی یاد نہیں۔ صبح ہوئی ناشتہ کرنے بیٹھی۔ اور جریدہ سحری اُٹھا کر دیکھنے لگی تو چونک پڑی اخبار انگلیوں سے چھوٹ کر میز پر جا پڑا۔ دو عکسی تصویریں سامنے پڑی ہوئی مجھے گھور رہی تھیں۔ ایک تو اسی گربہ چشم نوجوان کی تھی اور دوسری معمر بزرگ کی جسے میں نے آتشدان کے پاس بیٹھا ہوا دیکھا تھا۔ ذیل میں یہ عبارت درج تھی۔

نواب ثریا قدر کی اچانک موت

عجیب توام سانحے

ہم کو ابھی ابھی دار الاخبار سے نواب ثریا قدر کی اچانک موت اور ان کے چھوٹے صاحبزادے مرزخ مزاج کی عبرتناک خودکشی کی اطلاع موصول ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گذشتہ شب میں ایک پیش خدمت نے گولی چلنے کی آواز سنی بے تحاشا کمرہ میں دوڑ گیا۔ جہاں موصوف اپنی کرسی پر مردہ تھے۔ اور صاحبزادے تھوڑے فاصلہ پر فرش زمین تھے۔ گولی ان کی کنپٹی سے ہوتی ہوئی دماغ کو

پارہ پارہ کر کے نکل گئے ہیں حیرت افزا بات یہ ہے کہ نواب صاحب کے ہاتھ میں ایک وصیت نامہ کا بلا دستخطی نامکمل مسودہ تھا جس کی رو سے انہوں نے پہلے کل دستاویزات کو منسوخ فرما کر اپنی ساری منقولہ و غیر منقولہ جائداد اپنے چھوٹے بیٹے یعنی انہیں صاحبزادے مرنج مزاج کے نام چھوڑی ہے۔ حالانکہ عام طور سے مشہور ہو چکا تھا۔ کہ یہ صاحبزادے عاق و محروم کئے جا چکے ہیں۔ زیادہ تفصیلی حالات آئندہ اشاعتوں میں درج کئے جائینگے۔

دوسرا رنگ زعفرانی

ہفتہ کی صبح تھی۔ منہ بولی بہن صورت نگار سے سیر شام طے ہوئی تھی۔ کام بہت سا تھا۔ میں سست بیٹھی ہوئی بغیر کسی خاص خیال کے کاغذ کو دیکھے جا رہی تھی۔ یکایک میں نے چاہا۔ کہ تنکر بیٹھ جاؤں مگر ہل نہ سکی۔ آنکھیں کاغذ پر سلی رہیں فطرت لوریاں دے رہی تھی کہ اس میں کاہلی کا راز مرقوم ہے۔ مگر اب کاغذ سفید نہ تھا۔ بیچ میں گہرے زعفرانی رنگ کا دھبہ آ چکا تھا۔ جو بتدریج کناروں کے قریب ہلکا ہوتا گیا۔ میں مسحور ہو کر دیکھنے لگی۔ بیچ والا زعفرانی رنگ پھیل پھیل کر پھیلتا گیا یہاں تک کہ دھندلے کنارے دھواں دھار ہو گئے۔ زعفرانی دھبہ پھر ایک بار سفید ہو گیا۔ لمحہ بھر میں سپیدی نے ہلکے نارنجی رنگ سے کروٹ بدلوائی جو اپنی باری سے شوخ و شگفتہ ہو کر خالص کندن کی طرح دمکنے لگا۔ سانس بند سا ہو گیا۔ داغ طلا میں بھورے ہلکے خطوط ظاہر ہوئے۔ آس پاس کی سنہری زمین مختلف رنگ کے نقش و نگار سے بھر گئی پھر اچانک ایک منبت و منقش سنہرا دروازہ سنگ مرمر کی شفاف دیوار میں نصب دکھائی دیا۔ میں ساری جان سے کانپ اٹھی۔ وہی منظر جاتا رہا۔ گھبرائی۔ دیکھا کہ صورت نگار خاکے تیار کرنے میں سراپا محو ہے۔ بارش ہونے لگی۔ میں بھی ایک طرف چپ چاپ بیٹھ گئی۔ سفید کاغذ کا ایک بیداغ ٹکڑا لیکر سوئی کے سہارے سے دیوار میں لٹکا دیا۔ نگاہیں جما دیں۔ اور اتنی دیر تک دیکھا کی کہ آنکھیں دکھنے لگیں مگر کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔

صورت نگار (فارغ ہو کر) پیاری آؤ۔ چاء بناؤ ہمیں بھی دو۔ جاگو بہت سو چکیں۔

میں اٹھ کر میز پر بیٹھ گئی۔ سوچا کہ اب کوشش بیکار ہے وہاں سے اٹھی ٹہلتی ہوئی آگ کے پاس پہنچی۔ جھک کر پتیلی سے کیتلی میں گرم پانی انڈیلا۔ اور یونہی نگاہ اس کاغذ پر پڑ گئی۔ جو ابتک سوئی میں چھدا ہوا لٹک رہا تھا۔

کیتلی چٹاخ سے انگیٹھی میں گر گئی۔

صورت نگار (گھبرا کر) کہیں چوٹ تو نہیں آئی

میں (جلدی سے) نہیں تو۔ میں بالکل اچھی ہوں۔

گو اس وقت اچھی ہونے سے کہیں دُور تھی۔ کاغذ پر پہلی نگاہ میں ایک غیر معمولی دلفریب خاتون کی پوری تصویر نظر آگئی تھی۔ جو سر سے پاؤں تک زرق برق زردوز پیراہن میں ملبوس تھی۔ خیالی تصویر چشم زدن میں جاتی رہی۔ مگر وہ پیارا مکھڑا بھولی صورت نشیلی آنکھیں اب تک میرے دل و دماغ میں نقش ہیں اس وقت تو عجیب کیفیت تھی۔ جدھر نگاہ اُٹھ جاتی اُدھر وہی نظر آتی تھی۔

مَیں۔ بہن خُدا کے لئے مجھے ایک تصویر کھینچ دو۔

صورت نگار (سارا سامان درست کرکے) فرمائیے کیا حکم ہے۔

مَیں۔ صرف یہی کہ ایک ایسی دلفریب خاتون کی تصویر کھینچ دو۔ جسے تم نے کبھی نہیں دیکھا۔

یہ کہتے ہی کہتے مَیں نے بٹن دبا دیا ساری برقی روشنی بُجھ گئی۔ صرف ایک لیمپ روشن رہا۔ میری مُنہ بولی بہن چپ ہو کر محو تصوّر ہو گئی۔ مَیں بھی آرام کُرسی کے بازو پر بیٹھ گئی۔ اور داہنا ہاتھ صورت نگار کے نرم و گداز گلے پر رکھ کر اپنی وہی مورت کے خیال میں ڈوب گئی۔ تھوڑی دیر بعد صورت نگار نے ایک پوری سانس لی۔ ابروؤں پر اُنگلیاں پھرائیں اور کہنے لگی۔

" تمہارا ہاتھ تو میری گردن جلائے دے رہا ہے۔ (خمار آلود لہجہ میں) میں پھنک ہی ہوں۔ جل رہی ہوں۔

پھر یکایک میرا ہاتھ جھٹک کر کوچی سنبھالی اور دیوانیوں کی طرح کام میں محو ہو گئی۔ چشم زدن میں کیا دیکھتی ہوں کہ میری ذہنی تصویر کھنچی کھنچائی موجود ہے۔

صورت نگار۔ (حواس درست ہونے کے بعد) ہے کیسی؟ ذری مجھے بھی دکھانا۔

مَیں۔ (دب کر) نہایت عمدہ۔ بالکل اصل معلوم ہوتی ہے۔

صورت نگار (دیکھ بھال کر) چہرہ تو واقعی دلفریب ہے۔ مگر مَیں نے زرق برق زردوز پیراہن کیوں پسند کیا؟ شاید۔ سرخ سفید گالوں اور سنہرے بالوں کی مناسبت سے یہی رنگ مزیّن تھا۔

دوسری صبح کو مَیں اپنی تصویر لئے ہُوئے جرجی کے پاس پُہنچی۔ اور سارا واقعہ دوہرا کر پُوچھنے لگی۔ کہ آپ کیا فرماتے ہیں؟

جرجی۔ چہرہ نہایت پاکیزہ ہے۔ مجھے خیال ہوتا ہے۔ کہ مَیں نے صاحبِ تصویر کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔

مَیں (چلّا کر) کیا آپ کو ٹھیک ٹھیک یاد ہے۔

جرجی یقینی۔ مگر یہ یاد نہیں کہ کب اور کہاں دیکھا ہے۔ خیر یہ تو کوئی بڑی بات نہیں آج شام تک ضرور پتہ لگا لونگا۔

سہ پہر میں حکیم بطلیموس صاحب اپنے لمبے سفر سے واپس ہُوئے۔ مَیں بیٹھی پیانو بجا رہی تھی کہ پاؤں کی آہٹ معلوم ہُوئی۔ پھر یہ آواز سُنائی دی۔

" خوش باش۔ بازغہ۔ مَیں نے سُنا ہے۔ کہ تم اس ہفتہ میں بہت جی توڑ کر محنت کرتی رہی ہو۔ جرجی آواز دہل کہتا ہے کہ تمہیں تفریح کی ضرورت ہے۔

(باقی باقی)

نوائے مہجور

موہوم امیدوں کو بیٹھا ہوں ابھی رو کے
پھر یاد تری آتی دیگی مجھے پھر دھوکے

ہے سوزشِ پنہاں میں اندازِ دل آویزی
چبھنے لگی پھر دل میں نغموں کی غم انگیزی

ناکامیِ مقصد کا ہے خوف مرادوں میں
قوت نہ رہی باقی پھر میرے ارادوں میں

مانوس ہوں کچھ ایسا پھر میں غمِ الفت سے
گھبرانے لگا پھر دل احباب کی صحبت سے

آنکھوں میں تبسم کا اظہار نہ کرنا تھا
پھر میری امیدوں میں یوں رنگ نہ بھرنا تھا

اے کاش نہ آنے دے مجھ تک تو خیال اپنا
دیکھا نہیں جاتا ہے خود مجھ سے بھی حال اپنا

جب اس سے مرے دل کو تسکین نہیں ہوتی
کیا تیرے تصور کی توہین نہیں ہوتی

مانا غمِ الفت کا قصہ نہیں بھانا ہے
پھر کیوں کوئی آ آ کر نظروں میں سمانا ہے

اللہ رے بے ہوشی جب ہوش میں ہوتا ہوں
خود ہی کبھی ہنستا ہوں خود ہی کبھی روتا ہوں

میرے دلِ وحشی کی اللہ رے تنہائی
معلوم یہ ہوتا ہے دنیا ہے تماشائی

حالت یہ وطن میں ہے مایوسِ تمنا کی
انجان سا پھرتا ہو جیسے کوئی پردیسی

ناکامِ محبت کی اللہ رے مجبوری
ہر قرب کے پردے میں پوشیدہ ہے اک دوری

افسر غمِ الفت میں خاموش ہی رہنا تھا
اس درد کے قصہ کو اس طرح نہ کہنا تھا

حامد اللہ افسر

حسرتِ عنوان

کو نامہ، چہ پیغام، چہ اشوق، چہ مضمون
بیتابیم از حسرتِ عنوان گلہ دارد

از شرم چہ بکشاید و از توبہ چہ خیزد
زا لودگیم تہمتِ عصیاں گلہ دارد

گرامی

وادی کی محبّت

میرا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جو اپنی وسیع النظری اور "جوشِ جذبات" کے لئے مشہور ہے۔ دنیا مجھے دیوانہ کہتی ہے لیکن یہ مسئلہ ابھی طے نہیں ہوا کہ دیوانگی پہلے سرے کی فرزانگی ہے یا نہیں" اور وہ حالتیں جو پرشکوہ کہلاتی ہیں۔ یا وہ کیفیتیں جنہیں عمیق ترین کہتے ہیں۔ سب کی سب تھکے ہوئے تخیل اور اس دماغ سے جو معمولی عقل کھو کر حاصل ہوتا ہے۔ پیدا ہوتی ہیں یا نہیں۔ بیشک یہ معمہ آج تک حل نہیں ہوا "دیوانے" یعنی وہ لوگ جو دن کے وقت بیداری کی حالت میں خواب دیکھتے ہیں۔ ان پر ایسے اسرار کا انکشاف ہو جاتا ہے جو رات کے وقت نیند کی حالت میں عالمِ رویا کی سیر کرنے والوں کو نصیب نہیں انہیں اپنے دھندلے نظاروں میں "نورِ ازل کی خیرہ کن شعاعیں نظر آتی ہیں۔ اور جب وہ اس خوابِ بیداری سے جاگ اٹھتے ہیں تو اس خیال سے کانپنے لگتے ہیں کہ وہ سرِ عظیم سے کتنے قریب تر تھے۔

میں فی الحال دیوانہ سہی۔ اتنا تو میں بھی مانتا ہوں کہ میرے احساسِ حیات کی دو جداگانہ کیفیتیں ہیں۔ "عقل" جس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اور جو ان کوائف کی یاد سے وابستہ ہے۔ جو میری زندگی کا حصہ اولیں تھے۔ دوسرے "تذبذب اور شکوک" جو زمانہ حال اور ان واقعات سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں میری ہستی کا دوسرا حصّہ کہہ سکتے ہیں۔

لہٰذا جو کچھ میں گزشتہ کے بارے میں عرض کروں۔ اس پر یقین کر لو۔ اور جو کچھ بعد کے واقعات سے متعلق بیان کروں ان پر اتنی توجہ مبذول کرو جن کے وہ مستحق ہوں یا انہیں بالکل غلط سمجھو۔ اور اگر غلط بھی نہیں سمجھ سکتے۔ تو اس معمے کو حل کر دو۔

"وہ جسے میں عالمِ شباب میں پیار کرتا تھا۔ جان و دل سے فدا تھا۔ جس کے لئے اب میں اس ٹھنڈے دل سے یہ بیان سپردِ قلم کر رہا ہوں۔ میری حقیقی خالہ کی اکلوتی لڑکی تھی میری خالہ زاد کا نام "ایلی نورا" تھا۔ ہم دنیا کے ایک گرم طبقے میں ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے۔ جسے "وادیِ گیاہ بوقلمون" کہتے تھے۔ اس وادی میں کبھی کوئی بھولا بھٹکا مسافر بھی نہیں آیا کیونکہ وہ بہت دُور بلند پہاڑوں کے سلسلہ کے درمیان واقع تھی۔ یہ پہاڑ پاسبانوں کی طرح وادی کے چاروں طرف گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ اور اس کے دلکشا پرفضا گوشوں تک حدتِ خورشید کا راستہ باندھے کھڑے تھے۔ اس کے نواح میں کوئی شاہراہ نہ تھی۔ اور ہمارے جھونپڑے تک پہنچنے کے لئے درختوں کے پتوں اور جھکے ہوئے پھلوں کو زور سے پیچھے ہٹانا اور ہزاروں

خوشبودار پھولوں کو پامال کرنا پڑتا تھا۔اس طرح "ہم تینوں" یعنی میں، میری خالہ اور "ایلی نورا" اس وادی میں دُنیا سے بے خبر اور دُنیا داروں سے دُور زندگی بسر کرتے تھے۔ہماری پہاڑوں سے گھری ہوئی دُنیا کے اس طرف سلسلہ کوہ سے پرے دھند لکے میں گھرا ہُوا ایک خطہ زمین تھا۔جہاں سے ایک چھوٹا مگر عمیق دریا نکلتا تھا۔جو ایلی نورا کی آنکھوں کے سوا دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ چمکدار تھا۔یہ دریا ایک روانی خاموش کی طرح نامعلوم راستوں سے گزرتا درختوں سے گھری ہوئی ایک تنگ وادی میں ہوتا ہُوا پہاڑوں کی گہرائیوں میں چلا جاتا تھا جو اس کے منبع سے بھی زیادہ تاریک تھیں۔

ہم اس دریا کو دریائے خاموشی کہتے تھے کیونکہ اسکے بہاؤ میں ایک سکوت زا اثر تھا۔اس کی گزرگاہ سے کوئی صدا بلند نہ ہوئی تھی۔اور ایسی آہستگی سے رواں تھا کہ خوشنما اور چمکیلے کنکر جو اس کی تہ میں تھے بالکل متحرک نہ ہوتے تھے اور ہر ایک اپنی اپنی جگہ نہایت سکون اور شان سے چمک رہا تھا۔

دریا اور اس کی معاون ندیوں کے اردگرد کی زمین اور وہ خطے جو ندیوں کے کناروں سے لیکر ساحل دریا تک پھیلے ہُوتے تھے۔اور تہ میں پڑے ہُوئے کنکروں سے جا ملتے تھے۔ہماری وادی کی بقیہ سرزمین کی طرح جو دریا اور سلسلہ کوہ کے درمیان واقع تھی۔نرم اور سبز گھاس سے ڈھکے ہُوئے تھے یہ گھاس بہت گھنی۔چھوٹی۔بالکل ہموار اور نہایت خوشبودار تھی اور ہر قسم کے رنگین پھولوں سے اس طرح پٹی پڑی تھی کہ اس کی غایت درجے کی دلفریبی اور خوبصورتی ہمارے دلوں کو خدائے قدوس کی محبت اور بزرگی کے ترانے نہایت اُونچے سروں میں سُنا رہی تھی۔

گھاس کے گرداگرد اکثر جگہ عجیب وغریب درختوں کے جھنڈ تھے جن کے نازک تنے سیدھے کھڑے ہونے کی بجائے پر شکوہ انداز سے اس روشنی کی طرف جھکے ہُوئے تھے۔جو دوپہر کے وقت وادی کو منور کیا کرتی تھی۔ان درختوں کی چھال کہیں آبنوس کی طرح سیاہ اور کہیں چاندی کے مانند سفید تھی۔جو ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔اور "ایلی نورا" کے رخساروں کے سوا دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ نرم تھی ان درختوں کی چوٹیوں پر چمکدار سبز اور گھنے پتے لمبی لمبی متحرک قطاریں بنا رہے تھے۔گویا "سیریا" کے قد آور سانپ اپنے آقا سورج دیوتا کو تعظیم دے رہے ہیں۔

دلوں میں محبت کے جذبات پیدا ہونے سے پیشتر میں اور "ایلی نورا" پندرہ سال تک ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دئے اس وادی کی سیر کرتے رہے۔ایلی نورا کے پندرھویں اور میری عمر کے بیسویں سال کے اختتام پر ایک دن شام کے وقت ...... ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے ان سانپ جیسے درختوں کے نیچے بیٹھے

دریا سے خاموشی میں اپنے عکس دیکھ رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس متبرک دن کے باقی حصے میں ہم نے کوئی بات چیت نہیں کی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دوسرے دن بھی ہمارے کانپتے ہوئے لبوں پر صرف چند الفاظ آتے ۔ ہم نے دریا کی لہروں سے محبت کے دیوتا کو کھینچ لیا تھا ۔ اور اس نے ہمارے اندر ہمارے بزرگوں کی پرجوش روحوں کو روشن کر دیا تھا ۔ وہ جذبات جن کے لئے ہمارا خاندان صدیوں تک مشہور رہا ۔ ان خیالات سے ملکر جو اسی مقدار میں اس کی شہرت کا باعث تھے پے در پے آنے لگے ۔ اور تمام وادی کو مسرت بے پایاں سے معمور کر دیا ۔ تمام اشیاء میں ایک گونہ تبدیلی پیدا ہوگئی ۔ جن درختوں پر کبھی نام کو بھی پھول نہ آیا تھا ۔ ان پر ستاروں کی طرح درخشاں پھول کھل گئے ۔ سبز بچھونے کا رنگ اور بھی گہرا ہوگیا ۔ سفید پھول ایک ایک کرکے چھپ گئے ۔ ان کی جگہ لعل جیسے سرخ پھول ایک ایک کی جگہ دس دس پیدا ہوگئے ۔ ہمارے راستے بھی آباد ہوگئے ۔ کیونکہ وہ خوشنوا پرندے جو پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھے گئے تھے ۔ نظر آنے لگے ۔ طلائی اور نقرئی مچھلیاں دریا میں اچھلنے پھرنے لگیں ۔ دریا سے ایک مدھم سی صدا نے اٹھ کر ایک خواب آور لوری کی صورت اختیار کرلی ۔ جو دیوتاؤں کے بربط سے زیادہ سریلی اور ایلی نورا کی آواز کے سوا دنیا کی ہر شے سے میٹھی تھی ۔ ایک بادل بھی جسے ہم مدت سے زہرہ کے علاقہ میں دیکھتے تھے وہاں سے اپنے بھڑکیلے سنہری اور قرمزی رنگ میں آہستہ آہستہ ہمارے سروں پر چھا گیا ۔ اور روز بروز نیچے اترتا گیا ۔ حتیٰ کہ اس کے کناروں نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر ٹھیر ٹھیر کر تمام دھندلکے کو نور میں منتقل کر دیا ۔ اور ہمیں ہمیشہ کے لئے شان و شکوہ کے طلسمی قفس میں بند کر دیا ۔

ایلی نورا کا حسن ایک ساحرہ کا حسن تھا لیکن وہ معصوم اور بے ریا لڑکی تھی ۔ کیونکہ اس نے اپنی چھوٹی سی عمر پھولوں میں بسر کی تھی ۔ محبت کا جوش جو اس کے دل کو ابھارتا تھا کسی قسم کے پردے میں پنہاں نہ تھا جس وقت ہم وادی کی سیر کرتے وہ میرے ساتھ پوشیدہ سے پوشیدہ گوشے کا مشاہدہ کرتی اور اس تغیر کے متعلق جو حال ہی میں واقع ہوا تھا گفتگو ہوتی ۔

آخر کار ایک دن اس نے بادیدۂ تر اس آخری غمناک تغیر کا تذکرہ چھیڑا جس سے کسی آدم زاد کو چارہ نہیں ۔ اور اس کے بعد وہ ہمیشہ اسی افسوسناک موضوع پر گفتگو کرتی رہی جب کبھی ہم بات چیت کرتے ، وہ گفتگو کے اسی پہلو پر آجاتی تھی جس طرح بلبل شیراز کے اشعار میں فقروں کے ہر موثر تغیر میں وہی مشابہت بار بار آتی ہے ۔

اسے معلوم ہوگیا تھا کہ موت کی تلوار اس کی گردن پر لٹک رہی ہے ۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کوتاہ عمر تیتری کی طرح جو جولائی کے مہینے میں پیدا ہوتی ہے ۔ اور چند دن جی کر مر جاتی ہے ۔ وہ صرف مرجانے کے لئے مکمل خوبصورت بنائی گئی ہے ۔

لیکن اس کے موت سے ڈرنے کا باعث ایک اور صرف ایک خیال تھا۔ جو اس نے ایک دن شام کو شفق پھوٹتے وقت مجھ پر ظاہر کیا۔ اس کے غم و اندوہ کا سبب محض یہ تھا۔" وہ ڈرتی تھی کہ اُسے وادیٔ گیاہ بوقلمون" میں دفن کرنیکے بعد میں اس خوشنما جگہ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ جاؤنگا۔ اور وہ محبت جو اس وقت تک اس کی اور صرف اس کی ملکیت تھی بیرونی اور عام دنیا کی کسی چھوکری کی طرف منتقل ہو جائیگی۔

میں اسی وقت "ایلی نورا" کے قدموں پر گر گیا۔ خدا اور اس کے روبرو قسم کھائی کہ میں ہرگز کبھی مادرگیتی کی کسی بیٹی کو عقد میں نہ لاؤنگا۔ اور کسی طرح بھی اس محبت بھرے انداز کی جس سے اُس نے مجھے آخری دُعا دی تھی۔ اور اس کی یاد سے بیوفائی نہ کرونگا۔ اور میں نے خدائے عزّوجل کو اپنی قسم کی سنجیدگی کا گواہ ٹھیرایا۔ اس بددعا میں جو میں نے خدا اور ایلی نورا کی طرف سے اپنے لئے تجویز کی تھی ایسی سزا شامل تھی۔ جو نہایت خوفناک ہونے کی وجہ سے میں بیان نہیں کر سکتا۔

یہ سُنکر ایلی نورا کی روشن آنکھیں اور بھی روشن ہو گئیں۔ اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ گویا اس کے سینے سے ایک بڑا بھاری بوجھ اُتر گیا۔ وہ کانپنے اور زار زار رونے لگی۔ لیکن اُس نے میری قسم پر اعتبار کر لیا۔ کیونکہ وہ ابھی کمسن تھی۔ اس کا آخری وقت اطمینان سے گزرنے لگا۔ اور چند دنوں بعد جب وہ بالکل اطمینان کی حالت میں دم توڑ رہی تھی۔ اس نے مجھے کہا۔" تو نے میری رُوح کو آرام دیا ہے۔ مجھے تسلّی دی ہے۔ اس لئے میں مرنے کے بعد تیری نگہبان رہونگی۔ اور ہو سکا تو رات کے وقت تیرے خواب میں آؤنگی۔ لیکن اگر یہ امر جنّت کی روحوں کی طاقت سے باہر ہو تو میں ہر شام کے وقت بادِ نسیم میں تیرے ساتھ سانس لونگی۔ یا اس ہوا کو جسمیں تو سانس لیگا بہشتی خوشبوؤں سے معطر رکھونگی۔ اور تو ہر طرح میری موجودگی کو محسوس کریگا۔"

یہ کہتے کہتے اس نے اپنی معصوم جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اور میری کتاب زندگی کا پہلا باب ختم ہو گیا۔

(۲)

یہاں تک میں نے سب کچھ صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ لیکن جب میں وقت کے راستے میں اس حد سے گزرتا ہوں۔ جو میری محبوبہ کی موت سے پیدا ہو گئی تھی تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے دماغ پر پردہ سا چھا گیا ہے۔ اور مجھے واقعات کی درستی پر شک سا ہونے لگتا ہے لیکن سُنئے۔

یہ وقت مجھ پر بہت بھاری تھا۔ کئی سال نہایت سُست رفتاری سے گزرے۔ میں ابھی تک "وادیٔ گیاہ بوقلمون" ہی میں تھا۔ لیکن تمام چیزوں پر پھر ایک مرتبہ تغیّر واقع ہو گیا۔ ستاروں کی شکل کے پھول پنہاں ہو گئے اور پھر کبھی نہیں دیکھے

گئے۔ سبز گھاس کے بچھونے کی چمک مدھم پڑ گئی۔ بعض جیسے خوشنما سُرخ پھول ایک ایک کر کے مرجھا گئے۔ اور ان کی جگہ آنکھوں کی شکل کے سیاہ پھول ان میں نکل آئے۔ جو ہر وقت شبنم سے ڈھکے رہتے تھے۔ ہماری رات پھر غیر آباد ہو گئے بیونہ فلیمنگو اپنے خوشنما پروں سے کہیں اُڑتا نظر نہ آتا تھا۔ بلکہ وہ نہایت غمناک حالت میں ان خوبصورت پرندوں کو ہمراہ لیکر جو اس کے ساتھ آتے تھے۔ وادی سے پہاڑوں کی طرف ہمیشہ کے لئے کوچ کر گیا تھا۔ طلائی اور نقرئی مچھلیاں ہمارے علاقے سے نچلے حصے کی طرف چلی گئی تھیں۔ اور پھر کبھی رینت افزائے دریا سے خموشی نہیں ہوئیں۔ اور وہ سُریلی نوری جو دیوتاؤں نے ہوائی بربط سے زیادہ سُریلی اور "اپنی نورا" کی آواز کے سوا سب چیزوں سے زیادہ میٹھی تھی آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی۔ حتٰے کہ دریا نے بیشتر کی سنجیدگی اور خاموشی اختیار کر لی اور آخر کار وہ بادل بھی پہاڑوں کو اپنی ابتدائی دھندلک میں چھوڑ کر زہرہ کی نیا مگاہ کی طرف واپس لوٹ گیا۔ اور وادی گیاہ بوقلمون کی سُنہری اور بھڑکیلی شان و شکوہ کو اپنے ساتھ لیتا گیا۔

لیکن اپنی نورا کے وعدے فراموش نہیں کئے گئے کیونکہ میں فرشتوں کی مقدس منقش سے کے تھرتھرانے کی صدائیں ہوا میں سُنتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ عرفانی خوشبو کی ندیاں وادی میں لہرا رہی ہیں۔ اور جب میں تنہائی کی حالت میں اپنے بے چین اور زور سے دھڑکتے ہوئے دل کو تھامے کسی چٹان پر بیٹھتا تو ہوا کے وہ خوشگوار جھونکے جو میری پیشانی کو مس کرتے تھے۔ دھیمی دھیمی آہوں سے لدے ہوتے تھے۔ رات کے وقت ہلکی مترنم آوازیں سُنائی دیتیں۔ اور ایک بار "آہ! صرف ایک بار" روحانی لبوں نے میرے مرتعش ہونٹوں پر بوسہ دیکر مجھے موت کی گہری نیند سے جگا دیا تھا۔

لیکن افسوس میرے دل کا خلا اس طرح نہ بھرا۔ مجھے اس محبت کی طلب تھی جس سے میری عمر کی ابتدائی گھڑیاں بھری تھیں۔ پایانِ کار اپنی نورا کی مغموم یاد نے وادی کو میرے لئے تکلیف دہ بنا دیا۔ میں نے اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا۔ اور دُنیا کی نمائشوں اور مصنوعی خوشیوں کے سیلاب میں کود پڑا۔

میں نے اپنے آپ کو ایک عجیب و غریب شہر میں پایا جہاں تمام چیزیں ان شیریں خوابوں کی یاد کو صفحۂ دل سے مٹا رہی تھیں۔ جنہیں میں وادی گیاہِ بوقلمون میں مدت تک دیکھتا رہا تھا۔ شاہانہ درباروں کی دھوم دھام۔ اسلحۂ جنگ کی مجنونانہ جھنکار اور عورتوں کا ضیا پاش حسن مجھے مسحور کرنے کی دھمکی دیتے رہتے تھے۔ میں سرشار ہوتا چلا تھا۔ لیکن ابھی تک اپنی قسم پر قائم تھا۔ اور رات کی خاموشیوں میں اپنی نورا کی موجودگی کے آثار مجھ پر عیاں تھے۔

یکایک ان سب کا ظہور بند ہو گیا۔ اور دنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔

میں ان پر جوش جذبات اور خوفناک ترغیبوں کی طرف

سے جو مجھے چاروں طرف سے گھیرے تھیں۔ متعجب اور خوفزدہ تھا۔ کیونکہ میں جس بادشاہ کی سرکار میں ملازم تھا اس کے دربار میں کسی دور دراز ملک سے ایک حسین لڑکی آئی جس کے بے پناہ حسن کے آگے میرا پست ہمت اور بے وفا دل فی الفور جھک گیا۔ محبت کے زبردست ہاتھ نے مجھے عاجز کر دیا اور میں اس کے سامنے سربسجود ہو گیا۔ حقیقت میں وہ محبت جو مجھے وادی کی لڑکی سے تھی۔ اس موجودہ جوشش عشق اس جنون اور اس دل کو ابھار دینے والی پرستش کے مقابلے میں ہیچ تھی۔ میں نے اپنی روح آنسوؤں کی شکل میں اس حور اراضی یعنی "ارمن گارڈی" کے پاؤں پر بھینٹ چڑھا دی۔

ہاں ارمن گارڈی حور تھی اور میرے دل میں اس کے سوا کسی کے لئے جگہ نہ رہی۔

وہ ایک فرشتہ تھی۔ میں اس کی پیاری آنکھوں کے نظارہ میں محو ہو گیا۔ مجھے صرف ان آنکھوں اور اس حور کا خیال رہ گیا۔

میں نے شادی کی۔ میں نے اس بددعا کا خیال تک نہ کیا جو خود اپنے لئے تجویز کی تھی لیکن اس کی خوفناک سزا مجھ پر کبھی نازل نہیں ہوئی۔

ایک دفعہ ہاں صرف ایک دفعہ پھر اندھیری رات کی انتہاہ خاموشی میں میرے مکان کے جالی دار کٹہرے سے ہلکی ہلکی آہیں سنائی دیں۔ جو مجھے چھوڑ چکی تھیں۔ اور ایک جانی پہچانی سُریلی موسیقی میں منتقل ہو کر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ "آرام کر۔ دلجمعی سے آرام کر۔ کیونکہ محبت کا دیوتا حکمران ہے۔ تو ارمن گارڈی کے لئے آزاد کر دیا گیا۔ ہاں اُن وعدوں سے آزاد کر دیا گیا جو تو نے ایلی نورا سے کئے تھے۔ اس کا سبب تجھے آسمان پر بتایا جائیگا

ہری چند شرما اختر

غزل

تڑپ اُٹھتا ہوں جب ذکرِ مئے گلفام آتا ہے
دلِ خوں گشتہ کا آئینہ بن کر جام آتا ہے

اسی کا نام جینا ہے تو میں جینے سے باز آیا
کہ اب ہر ہر نفس سے موت کا پیغام آتا ہے

مرا ذوقِ تماشا حشر میں رسوا نہ ہو جائے
قیامت ہے وہ سوئے جلوہ گاہِ عام آتا ہے

فنا کے بعد بھی کیا سامنا ہے اس مصیبت کا
تڑپ اُٹھتا ہے دل جب زندگی کا نام آتا ہے

رہینِ بیکسی ہوں نازبردارِ تمنّا ہوں
اسیرانِ محبّت کو کہیں آرام آتا ہے

لبالب ہے مرا پیمانۂ دل خونِ حسرت سے
تکلف سے مری بزمِ طرب میں جام آتا ہے

شب غم کچھ انہیں مایوسیوں سے جی بہلتا ہے
مصیبت میں یہی ٹوٹا ہُوا دل کام آتا ہے

دلِ مرحوم کل تک شمع بزمِ زندگانی تھا
بڑی حسرت سے لب پر آج اس کا نام آتا ہے

کلیجہ منہ کو آتا ہے نہ پوچھ انسے ہمنفس مجھ سے
کہ میری داستانِ غم میں ان کا نام آتا ہے

تمناؤں کی قسمت میں ہے شاید مرگِ مایوسی
چھری بیکر خیال کوششِ ناکام آتا ہے

یہ ذوقِ کیفِ غم یہ رُوح کی افسردگی احسن
ترے دل میں کبھی اندیشۂ انجام آتا ہے

احسن سیمبی

افاداتِ شاد

شبِ غم کی جفائیں ہوگئیں بیکار کیا باعث؟
کراہا اور نہ تڑپا یہ دلِ بیمار کیا باعث؟

ازل میں کلکِ قدرت نے بنا دی ایک سی صورت
نہ رکھا امتیازِ کافر و دیندار کیا باعث؟

جو ساقی ایک ہے خُم ایک ہے اور ایک سی مے ہے
تو پھر اے میکشو آپس میں کیوں تکرار کیا باعث؟

اپنی جانب اے نگاہِ یار کھینچ
دیر کیسی میان سے تلوار کھینچ

صحن میں کرتے ہیں میکش مے کشی
سائبان اے ابرِ دامن دار کھینچ

کچھ تو لے آخر تصور سے بھی کام
صفحۂ دل پر شبیہِ یار کھینچ

ہم صورتوں کی جان کا دشمن ہے آفتاب
تارو! سفر بخیر کہ رہزن ہے آفتاب

حاصل ہو کیوں نہ چشم نمائی کا حق اسے
جب اے خزاں مربّیِ گلشن ہے آفتاب

آتی ہے یہ صدا لحد بو تراب سے
مَیں آفتاب ہوں مرا مدفن ہے آفتاب

ہے اپنی چوٹ سے بڑھ کر کہیں پرائی چوٹ
ادھر نظر سے گرے غیر مجھ پہ آئی چوٹ

دل اپنا سینہ میں رہ رہ کے گدگدانے لگا
کسی خیال سے ہم نے اگر چھپائی چوٹ

دل اس مصیبتِ تازہ سے خوں ہُوا اے شاد
اخیر چوٹ نے پہلے کی بھی بھلائی چوٹ

شاد عظیم آبادی

سٹیج کے باہر سٹیج

تھیٹر اور سنیما نواز حضرات نے بیسیوں دفعہ سٹیج کے ڈراموں اور سنیما کے فلموں میں سٹیج کے اندر سٹیج دیکھے ہونگے۔ ڈراما کے دوران میں ایک اور ڈراما کی تمثیل کرنا اب ایک پامال چیز ہو گئی ہے۔ ہمارے یہاں اوّل اوّل حضرتِ احسن لکھنوی نے اپنے مقبولِ عام ڈراما "خونِ ناحق" میں سٹیج کے اندر سٹیج دکھایا۔ یعنی اس ڈراما میں شہزادہ جہانگیر (ہملیٹ) اپنے غاصب چچا اور بیوفا ماں کو ایک ڈراما دیکھنے کی دعوت دیکر اس سٹیج کی آڑ میں ان کی تمام سیاہ کاریوں کا مرقع انہیں دکھا دیتا ہے۔ اس ڈراما کے بعد بھی دو ایک ڈراموں میں جناب احسن کے رنگ کو اڑانے کی کوشش کی گئی۔ مگر نقش ثانی کا روغن پھیکا رہا۔ حال میں محبی حکیم احمد شجاع صاحب کی جدت طراز طبیعت نے اس پرانی شراب کو نئی بوتل میں ارباب نظر کی ضیافت طبع کے لئے پیش کیا ہے۔ اور اس لئے "باپ کا گناہ" اس طرز کا جدید ترین نمونہ ہے۔ مغرب میں شیکسپیر سے بھی پہلے سٹیج کے اندر سٹیج دکھائے جانے کا پتہ ملتا ہے۔ دورِ حاضرہ کے ڈراموں میں اب بھی کبھی کبھار اس کی شکل دیکھنے میں آجاتی ہے۔ لیکن سٹیج کے باہر سٹیج بالکل نئی بات ہے۔ جس کی مثال ہندوستان میں معدوم اور مغرب میں مفقود ہے۔ تھیٹر جانے والی دنیا پر مخفی نہیں کہ سٹیج کے باہر تھیٹر میں تماشائیوں میں جو گلچھپ ہوا کرتی ہے وہ بجائے خود ایک ڈراما ہوتا ہے۔ جو باعتبار دلچسپی کے کسی صورت میں سٹیج پلے سے کم نہیں ہوتا۔ حیرت ہے کہ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ ورنہ اس کا مطالعہ سٹیج کی ہزار تنقیدوں کی ایک تنقید پر نظر ڈالتا ہے۔ آج ہم اس کا ایک باب پیش کر کے متمنی ہیں کہ اہلِ ذوق اس عنوان کی بابت اپنے مشاہدات پیش کر کے سٹیج کی اصلاح میں حصہ لیں۔

سین تھیٹر کا درجہ دوم

کریم (دھاری بھرکم لحیم شحیم) اب کیا کہوں جس نے یہ لوہے کی کرسیاں ایجاد کیں۔ کمبخت نے کرسی کا تمام ڈھانچ کھڑا کیا مگر بیٹھنے کی جگہ

بنانا ہی بھول گیا۔بے ایمان کی قبر کا نمونہ ہے بالکل۔ داخلہ کی زحمت ٹھنڈے دل سے برداشت کی اس امید پر کہ یہاں پہنچتے ہی چین کا پہلو نصیب ہوگا۔ مگر مَیں تو آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گیا۔ کہئے آپ تو آرام سے بیٹھے ہیں نا ؟

رحیم (دُبلا پتلا شخص ہڈیوں کا ڈھانچ) کوئی ایسی تکلیف تو نہیں نشست کافی فراخ ہے۔ ہاں سخت ہونے کے لحاظ سے یہ سمجھ لیجئے کہ چٹان پر بیٹھا ہوں۔ لاکھ پہلو بدل بدل کر بیٹھتا ہوں مگر کیا مجال جو چین آنے پائے۔

نعیم (۱۴ سال کا لڑکا) اس سے تو سکول بہتر تھا بورڈ پر جو لکھتے تھے نظر تو آتا تھا۔

کریم۔ دیکھا رحیم! لاکھ کہا، بچّہ تھیٹر جا کر کیا کریگا کوئی تماشہ تھوڑی ہے۔ علمی۔ ادبی فلسفیانہ بحث ہوتی ہے۔ سٹیج پر۔ یہ کیا سمجھیگا۔ بس یہی ہوگا کہ سو جائیگا۔ مگر وہ کب مانتی تھیں آخر اُسے میرے ساتھ بھیجکر ہی دم لیا۔ اب دیکھئے یہ رنگ لایا ہے۔(لڑکے سے مخاطب ہو کر) ابھی دیکھنے کے قابل کوئی چیز نہیں پردہ اُٹھیگا تو سب کچھ نظر آئیگا۔

(پردہ اُٹھتا ہے۔حسب معمول دربار کا سین)

کیوں نعیم دیکھا۔ کیسی دلفریب سینری ہے اور تاج بھی بالکل جدید ہے۔ واہ وا۔ آجتک ایسا ناچ اور سینری مَیں نے نہیں دیکھی۔

نعیم۔ مَیں نے نہ پہلے دیکھی نہ اب نظر آتی ہے۔

کریم۔ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہے بس چپکے بیٹھے رہو۔

رحیم۔ ارے میاں سچ تو کہتا ہے۔ ذرا اس بھلے مانس کی پگڑی تو دیکھو کس گھیر میں ہے۔ یہ دیوار سامنے کھڑی ہو تو خاک دکھائی دے۔

کریم۔ کیا چاہتے ہیں آپ۔ مَیں اس کی پگڑی اچھال دوں؟

رحیم۔ نہیں اسکی ضرورت نہیں۔ کرسی بدل لیجئے (کچھ سے) بس۔

کریم۔ اس کا ہر جگہ یہی حال ہے۔ نہ خود چین سے بیٹھے گا نہ کسی کو بیٹھنے دیگا۔ ان سے کہا بھی مگر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر (کرسی بدلتا ہے) اب تو خوش ہو۔

(کریم سٹیج کی طرف رُخ کرتا ہے مگر پگڑی کے حائل ہونے کے باعث کچھ نظر نہیں آتا۔ اِدھر اُدھر سے جھانکنے کی کوشش بے سود ثابت ہوتی ہے)

کریم۔ بھئی توبہ یہ کمبخت پگڑی ہے یا مقبرہ کا گنبد

رحیم۔ بچّہ سچّا تھا۔ جب آپ کا یہ حال ہے تو بھلا اسے کیا سوجھتا۔ کہہ دیجئے نا، ذرا پگڑی اُتار کر گود میں رکھ لیں۔

کریم (پگڑی کا دامن ہلا کر) جناب۔ اجی جناب۔ بھائیصاحب ذرا پگڑی اُتار نہ لینگے آپ۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

(پگڑی والا ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ کریم ذرا بگڑ کر)

جناب مَیں کمال احسان مانونگا۔ سارا کھیل غارت جا رہا ہے۔(کوئی نتیجہ نہیں) شاید آپ نے نہیں سُنا۔ مَیں پکار پکار عرض کر رہا ہوں کہ ذرا عمامہ سر سے ہٹائیے اور مجھے تماشہ

دیکھنے کا موقع دیجئے۔ میں دیر سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہوں۔
بس حضرت مذاق ہو چکا۔

(کوئی جواب نہیں ملتا)

رحیم۔ میں کہتا ہوں کہ اتنی بڑی پگڑی والے کو تھیٹر میں گھسنے کیوں دیا۔ شریف ہیں۔ تھیٹر میں یہ بڑی پگڑی باندھ کر آتے ہیں۔ اور لاکھ سر مارو کیا مجال جو جواب دیں۔ واہ صاحب وا۔

پگڑی والا (اپنے رفیق سے) جمال میاں کہنے دیجئے جو کہتے ہیں ان سے کون بحثے۔ یہ تماشہ دیکھنے تھوڑی آتے ہیں۔ انہیں تو باتوں میں مزا ملتا ہے۔

کریم۔ شرافت بڑی چیز ہے۔ عزت انسان کے اپنے ہاتھ میں ہے سب کو چاہیے۔ کہ اُسے بچانے کی کوشش کریں

رحیم۔ بھائی لاتوں کے بھوت باتوں سے کب مانتے ہیں۔ (پگڑی والے سے) او میاں پگڑی پوش اُتارتا ہے یا اُچھال دوں اس قطب مینار کو، بڑا وہ بن کر آیا ہے۔

پگڑی والا۔ جمال میاں یہ چخ چخ بند نہیں ہوگی کیا؟

جمال۔ یہ کیا انسانیت ہے۔ جب آپ اس طرح اودھم مچائینگے تو کوئی کیا دیکھے سُنیگا۔

کریم۔ جس بدنصیب کے سامنے یہ پگڑی سد سکندری بنی ہوگی۔ فرمایئے اس کا کیا حال ہوگا۔ حضرت معاف فرمایئگا میں نے روپیہ آپ کی پگڑی کا معائنہ در زیارت کرنے کیلئے خرچ نہیں کیا۔ بھائی رحیم قسم لیلو جو کچھ بھی دکھائی دیتا ہو۔ نعیم تم اس کرسی پر آجاؤ۔ اور اگر یہ پگڑی نہ اُتاریں تو کرسی پر کھڑے ہو جاؤ۔

(نعیم بادلِ ناخواستہ کرسی بدلتا ہے اور کھڑا ہو جاتا ہے)

آواز (نچلے درجہ سے) موٹے میاں لڑکے سے کہو بیٹھ جائے ورنہ اس دیوار کو ڈھانا پڑیگا۔

کریم۔ شور کرنے سے فایدہ، یہ نہیں ہٹیگا جبتک یہ پگڑی نہ اُتریگی۔ نعیم ڈٹے رہو۔

آواز۔ تو میں بھی کھڑا ہو جاتا ہوں۔ دیکھوں کون روکتا ہے

(کھڑا ہو جاتا ہے)

آواز (پچھلی صف سے) اگر یہی دستور ہے تو لیجئے بندہ بھی حاضر ہے۔ (کھڑا ہو جاتا ہے اور دس پندرہ تماشائی تقلید کرتے ہیں)

آوازیں۔ بیٹھو۔ بیٹھو۔

(سٹیج کے ایکٹر خاموش ہو جاتے ہیں۔ نعیم کے سوا سب بیٹھ جاتے ہیں)

نعیم۔ ابا کوئی پیچھے سے میری ٹانگ کھینچ رہا ہے۔ اور چٹکیاں لیتا ہے۔

کریم۔ دیکھو جی بچے کو دق نہ کرو آخر کیا بگاڑ رہا ہے تمہارا

تماشائی۔ تو اسے بٹھا کیوں نہیں دیتے۔

کریم۔ تو پگڑی کیوں نہیں اُتروا تے۔

مختلف آوازیں۔ چپ کرو۔ خاموش۔ لونڈے کو بٹھادو۔ پگڑی کو اُڑا دو۔ نکال باہر کرو بے شرموں کو۔

جمال۔ (پگڑی والے کے کان میں) یار بہت ہوئی۔ اب اسے اُتار ہی دو تو خیر ہے۔

پگڑی والا۔ واہ ابتو پگڑی سر کے ساتھ ہے۔

(منیجر آتا ہے)

منیجر۔ صاحبان خاموش۔ اگر شور بند نہ ہوا تو مجبوراً آپ کو نکال باہر کرنا پڑیگا۔ کرسیوں پر کوئی کھڑا نہ ہو بھیں کا ستیاناس ہو رہا ہے۔

(نعیم کو بیٹھنا پڑتا ہے۔ پگڑی والا خوش ہوتا ہے)

کریم۔ بیٹا روتے کیوں ہو۔ آؤ یہاں بیٹھو۔ پگڑی والا بھی بیچارا کیا کرے۔ کوئی کیا جانے کہ پگڑی کے نیچے کیا ہے۔

رحیم۔ بجا ہے۔ بھرے مجمع میں گنجا سر نکال کر بیٹھنا کہاں کی وضعداری ہے۔

پگڑی والا (پگڑی اُتار کر) میرا سر اور گنجا۔ لو دیکھ لو۔ اب تو تسلی ہوئی۔

کریم۔ یہ بال پگڑی میں چھپانا ظلم ہے۔ تمام منڈوے میں ایسے خوبصورت بال کسی کو نصیب نہیں ہوئے۔ جناب دکھائیے سب کو دکھائیے۔ یہ اللہ کی دین ہے۔ یہ چھپائیے کیوں بھائی رحیم۔

رحیم۔ اس میں کیا کلام ہے۔

پگڑی والا (خوش ہوکر) جمال بھیا۔ ذرا ان سے پوچھنا بچہ مٹھائی کھائیگا۔

(یہ صلح کی سفید جھنڈی تبسم اور ہنسی کی کلبد ثابت ہوتی ہے۔ چند پرتکلف الفاظ صلح آشتی کا شیرازہ باندھ دیتے ہیں اور تماشہ شور و غل کے بغیر ہوتا رہتا ہے)

(ڈراپ گرتا ہے)

کریم (اپنے پاس بیٹھنے والے سے) جناب ہم تو اس جھنجھٹ میں پڑے رہے۔ تماشہ نہ دیکھ سکے۔ آپ بتائینگے کیا دیکھا آپ نے۔

ہمنشیں۔ حضرت کیا تجاہل عارفانہ ہے۔ آپ نے کچھ سننے ہی نہیں دیا۔ اب بتاؤں کیا اپنا سر۔ ہاں ان سے پوچھتا ہوں۔ رضا۔ رضا! کیا پوچھ رہے ہیں آپ۔ تم تو غور سے سن رہے تھے۔ ذرا بتادو انہیں۔

رضا۔ یہ کہتے دیکھنے اور سننے کی کوشش کی مگر کیا عرض کروں۔ آوازیں سننے کا ضرور گنہگار رہوں۔ مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اور کیوں ہو رہا ہے۔

کریم۔ بھئی واہ۔ اچھے رہے۔ اچھا کسی اور سے پوچھتا ہوں۔ (کریم اٹھ کر اگلے درجہ میں جاتا ہے اور سنجیدہ صورت شخص سے دریافت کرتا ہے)

کیوں جناب ابتک تماشہ میں کیا ہوا۔

سنجیدہ وضع۔ خوب سینری تھی۔ ناچ لاجواب تھا اور

لباس بھی بُرے نہ تھے۔

کریم - مَیں ڈراما کا پوچھ رہا ہوں۔

سنجیدہ وضع - ہاں ڈراما۔ تو اُس کی طرف مَیں نے توجہ نہیں کی۔

(اگلے درجہ میں جاتا ہے اور ایک خوش پوش نوجوان سے مخاطب ہوتا ہے)

کریم - کیوں جناب آپ کے عندیہ میں ابتک کھیل کیسا رہا۔

نوجوان - مَیں تو سو گیا تھا۔ نہ کچھ دیکھا نہ سُنا۔

کریم - تعجب ہے آپ کو اپنے روپیہ کا دریغ نہ آیا۔

نوجوان - جی نہیں۔ مَیں اعزازی تماشائی ہوں۔

کریم - یعنی

نوجوان - مجھے خود مدعو کیا جاتا ہے۔ بجائے ٹکٹ لینے کے مجھے تماشہ دیکھنے کا معاوضہ ملتا ہے۔

کریم - وہ کیوں (حیران ہوکر)

نوجوان - مَیں ڈراما کا نقاد ہوں۔

کریم - مَیں نہیں سمجھا۔

نوجوان - مَیں ڈراما دیکھنے کے بعد اپنی رائے لکھا کرتا ہوں (انداز تفاخر سے مُسکرانے لگتا ہے)

کریم - مگر آپ نے دیکھا ہی کچھ نہیں تو رائے کیسے لکھینگے۔

نوجوان - کل کا اخبار ملاحظہ فرمائیے گا۔

(پھر سو جاتا ہے۔ کریم ایک دوسرے شخص کے پاس جاتا ہے)

کریم - حضرت کہئے ابتک کھیل کیسا رہا۔

صاحب خود حیران ہوں کہ کیا ہو رہا ہے کچھ سر پیر ہو تو کہوں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈراما تو ہے نہیں فقط سینری اور لباس کی نمائش ہے۔ اور بس۔

(سٹیج کا پردہ اُٹھتا ہے۔ باہر کے سین پر ڈراپ پڑتا ہے)

نور الٰہی
محمد عمر

ایڈیٹر کی توجہ

ایڈیٹر صاحب دفتر میں آکر بیٹھے تو منشی نے ایک خط جو ابھی موصول ہوا تھا۔ لاکر میز پر رکھا۔ ایڈیٹر صاحب لفافہ میں سے خط نکال کر پڑھنے لگے۔ پڑھ چکے تو ایک خاص انداز سے گردن اُٹھائی۔ ناک کو سکوڑ کر اس میں سے ایک عجیب حقارت آمیز آواز نکالی۔ اور خط کو پھاڑ کر کاغذ کے پرزے ردی کی ٹوکری میں پھینک دئے۔ پھر ابرو در شانوں کے درمیان ایک بارعب زاویہ بنا کر منشی سے گویا ہوئے۔ "اور کوئی چیز ہماری توجہ کے قابل؟"

منشی - جی نہیں اور تو کچھ نہیں۔ صبح دو خط آئے تھے۔ سو وہ میں نے خود پھاڑ ڈالے تھے۔

اختر

پروانہ

اے عاشق دل خستہ، اے سوختۂ الفت
تو راہِ محبت کا اِک سالک یکتا ہے

رگ رگ میں نہاں تیرے ہے آگ محبّت کی
تو عشق مجسّم ہے، تو حُسن کا بندا ہے

~~~~~~~~~~~~

رونق ہے ترے دم سے کا شانۂ اُلفت کی
سینہ میں ترے روشن اِک شمع محبت ہے

محفل میں محبت کی تو گرمیِ مجلس ہے
یہ سوز نہاں تیرا سرمایۂ عشرت ہے

~~~~~~~~~~~~

تو رہبرِ کامل ہے اس عشق کی منزل میں
ہر نقش قدم تیرا اِک شمع ہدایت ہے

تقلید تیری واجب ہے رہروِ الفت پر
یعنی ترا جل بُجھنا اِک درس محبت ہے

~~~~~~~~~~~~

ظاہر میں ہے پروانہ شمع سرِ محفل کا
باطن میں مگر تیرے جلوے ہیں حقیقت کے

کیوں رکھتے ہیں سب تجھ پر الزام ہوسنا کی
معلوم نہیں شاید اسرار محبت کے

~~~~~~~~~~~~

آدِل میں تجھے رکھ لوں اے شیفتۂ اُلفت
تیری ہی طرح مَیں بھی بیمار محبّت ہوں

بیخود بھی ہوں، مضطر بھی، دیوانہ و رسوا بھی
مستِ مئے اُلفت ہُوں، سرشار محبت ہوں

~~~~~~~~~~~~

تو شمع کا عاشق ہے، مَیں شمع حقیقت کا
تو اُس کا ہے شیدائی، مَیں اس کا ہوں پروانہ

آ جان فدا کر دیں جل بُجھ کے سرِ محفل
رہ جائیگا دُنیا میں دونوں کا اِک افسانہ

ابوالفاضل سیّد رازؔ چاندپوری

~~~~~~~~~~~~

ریڈیم کی مخلوق

ہیرا بڑھئی صنعت و حرفت میں اپنے کمال فن پر بڑا نازاں تھا۔ اور واقعی الماریاں، صندوق اور قبضے نہایت خوبی سے بنایا کرتا تھا۔ اسی سلسلہ میں اس نے دولتمندوں کے گھروں میں چپکے سے داخل ہو جانے اور بند صندوقوں کے تالے کھولنے میں بھی کامل دسترس حاصل کر لی تھی۔ وہ تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی تھا۔ اس نے اپنی علمی معلومات کو اپنے جدید پیشے کی ترقی و تکمیل میں لگا دیا تھا۔ وہ دن کے وقت ادھر اُدھر پھر کر کوئی نہ کوئی گھر تاک رکھتا تھا۔ اور رات کو چپکے سے اُس میں داخل ہو کر کامیاب نکل آتا۔ اُس کا یہ قول تھا کہ "قبل از وقت کسی گھر کے رازداروں سے خفیہ طور پر حالات دریافت کرنا اور مواقع کی تلاش میں سرگرم جستجو ہونا اکثر شکوک و شبہات پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اور صاحب فن چابکدست کو پولیس کے شبہ کا مرکز بنا دیتا ہے۔"

اُس نے تازہ ترین ڈاکہ ایک ساہوکار کے مکان میں ڈالا۔ جہاں اس کی دور رس طبیعت کے سوا اور کوئی ماہر فن داخل ہونے کا خیال نہ کر سکتا۔ مگر اُسے ساہوکار کا پوشیدہ خزانہ مل گیا۔ جس سے اُس نے کئی مہینے عیش و عشرت میں گزارے۔

وہ سادہ اور شریفانہ لباس پہنتا تھا لیکن فطرتاً وہ حریص اور کفایت شعار نہ تھا۔ اس لئے چند روز میں اُس کا تمام اندوختہ ختم ہو گیا۔ اور اُسے پھر کام میں ہاتھ ڈالنا پڑا۔ چنانچہ ایک دن وہ سہ پہر کے وقت گھر سے باہر نکلا۔ اور چند گھنٹے ادھر اُدھر پھر کر ایک مکان بھانپ آیا۔ جب غماز فلک نہاں خانہ مغرب میں روپوش ہو گیا۔ تو ہیرا زاہد شب زندہ دار کی طرح گھر سے نکلا اور منزل مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ چاروں طرف پُرسکون اندھیرا تھا۔ سنتری روند لگا کر واپس جا رہے تھے۔ مکان کے قریب ایک بانس کا زینہ کھڑا تھا جس کے ساتھ ایک مٹی کی ہنڈیا لٹک رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں معمار دن بھر نقش و نگار کرتے رہے ہیں۔

سنتری دوسری گردش کے لئے آیا تو اندھیرا زیادہ ہو چکا تھا۔ جب اس نے بالاخانے کی طرف نظر دوڑائی تو اسے ایک معزز شخص کی صورت نظر پڑی۔ جو نیلگوں لباس پہنے کھڑا تھا۔ سنتری بے پروائی سے گزر گیا۔ جونہی اس نے پیٹھ پھیری۔ ہیرا نے جلدی سے کھڑکی کا معائنہ شروع کیا۔ یہ کھڑکی ایک تاریک کمرے میں کھلتی تھی۔ ساتھ کی کھڑکی سے روشنی کی مدھم شعاعیں نکل کر کسی بیدار انسانی ہستی کی موجودگی

کا پتہ دے رہی تھیں۔ ایک لمحہ میں ہیرا کھڑکی سے نیچے اُتر کر دبے پاؤں کمرہ سے ہوتا ہُوا برآمدہ میں پہنچ گیا۔ اور وہاں سے ملحقہ کمرے میں داخل ہُوا۔ یہاں اُس نے جیب سے ایک موم بتی نکال کر روشن کی۔ اور دل میں کہا۔ "یہاں بہت کچھ مل جائیگا۔ اور اس نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔" مگر نہیں یہ تو کوئی کتب فروش معلوم ہوتا ہے۔" کیونکہ کمرہ میں الماریاں کتابوں سے سجی ہی تھیں۔ اور میزوں پر چند اخبارات شیشے کی نلکیاں وغیرہ بکھری پڑی تھیں۔ اُس نے چند کتابوں کے نام پڑھے کوئی سائنس کی کتاب تھی۔ کوئی فلسفے کے مضامین کا مجموعہ تھا

"یہ تو کوئی کتابوں کا کیڑا ہے"۔ ہیرا نے دبی زبان سے کہا۔ "مگر یہ اپنا روپیہ کہاں رکھتا ہوگا؟"

اس سوچ میں وہ کتبخانہ سے نکلا۔ کیونکہ اُسے علماء حکما سے خاص نفرت تھی۔ وہ برآمدہ سے ہوتا ہُوا چند قدم آگے بڑھا اور ایک کمرے کے پاس کھڑے ہوکر کواڑ کی آڑ سے اندر جھانکا۔ اندر ایک سفید ریش نحیف الجثہ خمیدہ کمر بوڑھا نظر پڑا۔ جو میز پر جُھکا ہُوا خدا جانے کس گہرے مطالعہ میں مشغول تھا۔ ہیرا نے اُس کی خاموشی پر اپنے آپ کو مبارکباد دی۔ مگر ابھی اُس کے خیالات کی رو کوئی نئی سمت اختیار نہ کرنے پائی تھی۔ کہ ایک طرف سے کھٹکھٹانے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی خمیدہ کمر بزرگ نے بغیر سر ہلاتے "اندر آجائیے"۔ کہا۔

جب ہیرا جیسا ماہر فن "اندر آجائیے" کی صدا سُنتا ہے۔ تو عموماً اُس کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ فی الفور باہر نکل جائے۔ مگر اتفاق سے پروفیسر کی آواز بلند ہوتے ہی سیڑھیوں کی طرف سے کسی کے چڑھنے کی چاپ سُنائی دینے لگی۔ ہیرا بھی کچھ کم حاضر طبیعت نہ تھا۔ اُس نے نہایت جرأت سے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہوگیا۔

داخل ہونے سے پیشتر اُس نے یہ بھی فیصلہ نہ کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو کیا ظاہر کریگا۔ مگر ہیرا کی خوش قسمتی کہ یہ آتشین امتحان پیش نہ آیا۔ کیونکہ سائنسدان نہایت انہماک کیساتھ اپنے خوردبینی مشاہدہ میں مصروف تھا۔ اور اُس نے سر اُٹھائے بغیر بے پروائی سے کہا۔ "کیا آپ ڈاکٹر دیوی داس ہیں؟ معاف کیجیئے گا۔ مَیں اُٹھ نہیں سکتا۔ اس وقت میری آنکھیں فطرت کے ایک دلچسپ معجزے کا مطالعہ کر رہی ہیں"۔

ہیرا کو بھی اس بات کا علم تھا۔ کہ سائنسدان عموماً خود فراموش ہُوا کرتے ہیں۔ اور وہ حیران ہو رہا تھا کہ اگر پروفیسر کو یہ معلوم ہو جائے کہ اُس کے پس پشت کیسا عجیب معجزہ رونما ہوچکا ہے۔ تو وہ کیا کہیگا۔ لیکن اس نے سوچا۔ کہ آنے والے شخص نے سیڑھیوں سے فرار ہونے کی راہ تو روک ہی لی ہے۔ اس لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں کہ خود فراموش پروفیسر اُسے جس شخصیت کا ہار پہنا رہا ہے۔ قبول کرلے۔

ہیرا نے آہستہ سے کہا۔" ہوں"

پروفیسر نے جوش مسرت سے کہا۔" دوست ریڈیم کے متعلق جو نظریہ میں نے قائم کیا تھا۔ وہ بالکل صحیح ثابت ہو رہا ہے۔ میں نے ابھی ابھی شب پرور قسم کا ایک جانور "سارونہ" پیدا کیا ہے۔

ہیرا نے علمی نکتہ کی داد دیتے ہوئے کہا۔" ہاں "جوہر حیات سے تلقیح پانے کے بعد جب سارونہ دور اوّل سے دور ثانی میں داخل ہوا تو مایئن کے اجزائے بسیطہ کے اثر سے اُس میں آثار حیات پیدا ہو گئے ہیں"۔

ہیرا نے کمرے کے تمام سامان پر ایک ماہر فن کی طرح غائر نظر ڈالتے ہوئے تحسین آمیز لہجہ میں کہا۔" ہاں" "تجربہ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ سارونہ کے دور اوّل سے دور ثانی میں منتقل ہونے کے عمل کو ریڈیم کی شعاعوں نے بہت سرعت سے سرانجام دیا ہے"۔

ہیرا نے عالمانہ حیرت کا لہجہ اختیار کر کے کہا۔" اوہو اتنی ــــ سرعت۔"

پروفیسر نے جوش مسرت سے اپنے کندھے بلند کئے۔ مگر اس کی نگاہیں خوردبین کے شیشہ پر بدستور جمی رہیں۔ " دوست! میں جوش مسرت میں اس امر کی معافی طلب کرنی بھول گیا۔ کہ ہمارا باہمی تعارف نہ ہونے کے باوجود میں نے آپ کو اس تجربہ کی شہادت عینی کے لئے طلب کیا ہے۔ میں آپ کی اس کرمفرمائی کا نہایت ممنون ہوں۔ آپ نے ایک نادیدہ مکلف کی دعوت کو لبیک کہا"۔

ہیرا ابھی میں ہنسا

اُس نے مصنوعی لہجہ میں کہا۔" اس کا کچھ خیال نہ کیجئے" اس حد تک سائنسدان پر اعتماد جما لینے کے بعد اب وہ کمرے سے یکایک نکل کر اس کے دل میں شبہ پیدا کرنے کی حماقت کا ارتکاب نہ کر سکتا تھا۔ اُس نے خیال کیا کہ بوڑھے گھوسٹ کو ذرا اور بیوقوف بنا کر فرار کا موقعہ پیدا کرنا چاہئے۔ اس اثنا میں پروفیسر خوردبین کے شیشہ پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ مبادا فطرت کے حیرتناک معجزہ کا کوئی حصّہ اُس کی نگاہ سے اوجھل ہو جائے!

" ڈاکٹر دبیداس!" پروفیسر نے سر اُٹھائے بغیر کہا۔ " آپ نے 'سارونہ' کے بارہ میں جو تجربات کئے ہیں۔ کیا اُن سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ اُسے دن کی روشنی سے نفرت ہے؟"

ہیرا نے جواب دیا۔" ہاں اکثر"

" میرا بھی یہی خیال ہے۔ آپ نے بھی یہ امر مشاہدہ کیا ہوگا کہ وہ فلزات کی طرف طبعی میلان رکھتا ہے میرے نزدیک مادہ ذی حیات کا مادہ غیر ذی رُوح کی طرف یہ رجحان خاص دلچسپی کا سرمایہ دار ہے"۔

ہیرا نے تسلیم کیا۔" ہاں ہے تو تعجب انگیز"

پروفیسر نے بدستور سر جھکائے لمبا سانس لیکر کہا۔

"افسوس ہے کہ استحالہ کے بعض کوائف میری نظروں سے اس لئے اوجھل رہینگے کہ میں تکان کے باعث چور چور ہو رہا ہوں۔ اور میرا قیاس ہے کہ جب سے "سارو قہ" خشخاشی بیضہ سے پھوٹ کر بڑھنے لگا ہے۔ اُسے کامل نشو و نما پانے تک ۴۸ گھنٹے درکار ہونگے کیا آپ مہربانی کرکے میری خاطر چند گھنٹے مشاہدہ کرینگے۔ تاکہ اتنے میں مَیں تھوڑی سی نیند لے لوں۔ مَیں کئی گھنٹوں سے متواتر جاگ رہا ہوں مجھے آپ کی دقت نظر پر پُورا بھروسہ ہے۔ مَیں اس استحالہ کے تمام منازل و مراحل پر کامل عبور حاصل کر لونگا۔"

ہیرا نے پہلے تو ارادہ کیا کہ کام کا بہانہ کرکے چل دے مگر پھر اس نے خیال کیا۔ کہ پروفیسر کو سوتا چھوڑ کر اُس کے تجربہ کو ادھورا چھوڑ جائے۔ تو عجیب لطف رہیگا۔ اس لئے اُس نے پروفیسر کی تجویز کو قبول کر لیا۔ اس نے یہ بھی خیال کیا۔ کہ اس کمرے میں کوئی نہ کوئی قیمتی چیز ایسی مل جائیگی جو آج کی رات کی بیکاری کا کفارہ ادا کر دیگی۔

ہیرا نے نہایت مستعدی سے کہا۔ "نہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"تو مہربانی کرکے عجلت سے کام لیں۔ ہم استحالہ کا کوئی مرحلہ بغیر مشاہدہ نہیں چھوڑ سکتے۔

جونہی مَیں کرسی سے اٹھوں آپ فوراً بیٹھ جائیں کاغذ اور قلم دوات میں آپ کے ہاتھ تلے رکھ دونگا۔ آپ جو دلچسپ مشاہدہ کریں۔ اُس کے متعلق نوٹ کرتے جائیں۔" یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اور ہیرا نے جبراً و قہراً اس کی کرسی سنبھالی کیونکہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اُس نے نہایت پھُرتی سے خوردبین کے شیشے پر نگاہیں جما دیں۔ پروفیسر نے کہا۔ "دیکھا کیسا عجیب نظارہ ہے؟ جوہر حیات کی شفاف جھلی کس طرح مائین کے سالمات کو جذب کرکے انقلاب کبریا کا باعث ہو رہی ہے۔ اور "سارو قہ" کے اعضاء و جوارح کے نشو و نما کے لئے فضا ماحول سے ذخیرۂ خورش بہم پہنچانے کا موجب بن رہی ہے۔"

پروفیسر انگڑائی لیکر سرو قامت ہو گیا۔

"ڈاکٹر دیویداس صاحب! مَیں آپ کی اس کرمفرمائی کا شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ امید ہے کہ آپ مجھے اس تصدیعہ کے لئے معاف کرینگے مگر آپ کیلئے بھی ...."

ابھی وہ فقرہ ختم نہ کرنے پایا تھا۔ کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور ایک شیریں نسوانی آواز نے کہا۔ "چچا جان"

ہیرا نے خیال کیا کہ یہ پروفیسر کی بیٹی ہے۔ جو اُسے بُلانے آئی ہے۔

"آجاؤ بیٹی! اندر آجاؤ!" پروفیسر نے شفقت آمیز لہجہ میں کہا۔ "تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے۔"

ہیرا کی رُوح اس کے قفس عنصری میں تڑپ رہی

تھی۔ کہ پروفیسر کی نوخیز بیٹی کے دیدار سے فرحت اندوز ہو۔ مگر اس کی خبر اسے نہیں تھی کہ وہ خوردبین میں سے بے سر و پا مضغہ کا مشاہدہ کرتا ہے جس پر پروفیسر اُسے چپکا کر الگ ہٹ گیا تھا۔ اگرچہ ہیرا کو اس وقت سر اُٹھانے کی مہلت نہ تھی۔ مگر وہ کمرے کی فضا میں وہ کہربائی لہریں محسوس کر رہا تھا۔ جو اُس کے نہاں خانۂ دل کی دیواروں سے ٹکرا کر "برقیات" کے تصادم کی طرح بصیرت افروز روشنی پیدا کر رہی تھیں۔

"چچا جان کیا فرمایا؟ میں تو سمجھی - - - - -"

"بیٹی! ڈاکٹر دیویداس نے نہایت مہربانی سے میرے بجائے چند گھنٹے مشاہدہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے۔ میرا تجربہ نہایت کامیاب ہوا ہے۔ میں بڑی دیر کے بعد ایک "سارونقہ" کی تخلیق میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اور اب اُسے محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔"

ایک لمحہ تامل کے بعد لڑکی نے مسرت نما کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ "تو کیا "سارونقہ" کو محفوظ کرنے کے لئے کسی اور شخص کی ضرورت پڑیگی؟"

"بیٹی ذرا آہستہ آہستہ بات کرو۔ ڈاکٹر صاحب کو پوری توجہ کی ضرورت ہے۔ ہمیں اُن کے کام میں رخنہ اندازی نہ کرنی چاہئے۔ ہاں تو کیا تم کسی کی امداد کا ذکر کر رہی تھیں۔ واقعی سارونقہ کو "سلاسلِ حدیدیہ" میں باندھنے کی ضرورت ہے۔ کیا تم "مستقر شرطیہ" کو جانتی ہو؟"

"ہاں جانتی ہوں چچا جان وہی نہ جہاں "بین الشرط" ہوا کرتا ہے؟"

ہاں اگر وہاں سے موقعہ پر امداد حاصل ہو جائے تو میرے تجربہ کا نتیجہ عرصہ دراز تک کے لئے محفوظ رہ سکتا ہے۔ مگر آہستہ سے جاؤ تاکہ ڈاکٹر صاحب کی توجہ نہ بٹنے پائے۔

ہیرا امید لگائے بیٹھا تھا کہ اب پروفیسر دوسرے کمرے میں جا کر سو رہیگا۔ کیونکہ اس کی بیٹی اس کے علمی کام کے سرانجام دینے کے لئے روانہ ہو گئی تھی۔ مگر پروفیسر آگے سے بھی زیادہ چست اور چالاک معلوم ہوتا تھا۔ پروفیسر نے کہا۔ "بہت کم لوگ سائنسدانوں کو ان کے تجربات کے علمی نتائج کی داد دیتے ہیں۔ عوام تو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم کھسکے ہوئے دماغ کے بیکار لوگ ہیں۔ اور اپنے حلقۂ دلچسپی سے باہر کوئی عملی کام نہیں کر سکتے۔"

ہیرا نے تصدیق کے لہجہ میں کہا۔ "ہاں"

پروفیسر نے خواب آلود انداز میں کہا۔ "حالانکہ ہم دنیا میں سب سے زیادہ عمل کے شیدا ہیں۔ ہم علت و معلول کے سلسلہ کی سرگرمی دریافت کر لیتے ہیں۔ ہم فلسفی مزاج ہیں۔ اضطراب انگیز حالات ہم کو یکایک انتشار و اضطراب

میں بتلا نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہم اپنے جملہ قوٰی کو ان مضطرب حالات کے مقابلہ میں صف آرا کرنا خوب جانتے ہیں۔"

ہیرا نے خوردبین میں دیکھتے ہوئے اُسے تسلیم کیا۔

"جب ہم سب کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ تو عوام سمجھتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں دیکھ سکتے۔ ہاں تو جب آپ کمرے میں داخل ہوتے تو میں نے آپ کا نام لیکر آپ کو بُلایا تھا۔ کیا آپ کو اس سے تعجب ہُوا تھا؟ مگر یہ تو بالکل سہل بات ہے۔ میری میز کے سامنے جو دیوار ہے اُس پر ایک شیشہ آویزاں ہے۔ وہ مجھے گردن پھیرے بغیر دکھا دیتا ہے کہ میرا کون ملاقاتی مجھ سے ملنے آیا ہے۔"

ہیرا نے بے ارادہ سر اُٹھا کر دیکھا تو واقعی میز کے سامنے ایک چھوٹا سا شیشہ دیوار پر آویزاں تھا۔ اس سے ہیرا کو اور بھی تصدیق ہوگئی۔ کہ پروفیسر نے اُسے شناخت کرنے میں غلطی کی ہے۔

اُف کتنی دیر ہوگئی۔ لڑکی ابھی تک ساروقہ کو محفوظ کرنے کا آلہ لیکر نہیں آئی۔ ابتک تو اُسے آجانا چاہیئے تھا۔ ڈاکٹر صاحب میری لڑکی بھی میرے تجربات میں شوق سے حصّہ لیتی ہے۔

ہیرا نے کہا۔" ہاں! مگر آپ کو اب آرام کرنا چاہیئے" اور خود گردن دراز کرکے درد کو فراموش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ جو خمیدگی سے پیدا ہوگیا تھا۔

دُنیا میں ہر شے کا انجام ہے۔ آخر کار ہیرا کی خمیدگی کا زمانہ بھی ختم ہوتے بغیر نہ رہا۔ اُس نے پروفیسر کے کلمات سُننے کے ساتھ ہی سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سُنی۔ اور جب کوئی شخص کمرے میں داخل ہُوا تو ہیرا اپنی خوردبین پر اور بھی جھک گیا۔ نو وارد نے پروفیسر پر مستفسرانہ نگاہ ڈالی۔ اور اُنگلی سے ہیرا کی طرف اشارہ کیا۔ پروفیسر نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔" آپ اس نمونہ کو اپنے قبضہ میں کر سکتے ہیں۔"

ہیرا نے سر اُٹھایا۔ اس کی نگاہیں شیشہ کی طرف اُٹھیں اور جب وہ مُڑا تو اس نے ایک پولیس سارجنٹ کو ہتھکڑی سنبھالے کھڑے پایا۔ ہیرا چیخ مار کر کھڑا ہو گیا مگر سارجنٹ نے اُس کے بازو پکڑ کر کہا۔" کیا تم خاموشی سے چلو گے یا نہیں؟"

یہ کیا؟ آخر اس کا مطلب؟ میں ڈاکٹر دیویداس ہوں۔ پروفیسر صاحب مجھے بخوبی جانتے ہیں۔ ہم دونوں اسوقت ایک علمی تجربہ میں مشغول ہیں۔ ادھر دیکھیو ہم نے ایک "ساروقہ" پکڑا ہے۔ جس کا مشاہدہ ہم کر رہے ہیں۔"

پروفیسر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور نرمی سے کہنے لگا کہ "علم اور فن میں مدت سے یہ مناقشہ جاری ہے۔ اگر تم نے بیگانے تالوں کی چابیاں بنانے اور ہتھکڑیاں اُتارنے کے فن کی طرف توجہ دینے کی بجائے کتابوں کا مطالعہ کیا ہوتا

تو تم کو غالب مرحوم کا یہ مصرع یاد ہوتا ع

رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتے ہیں رہزن کو

اصل میں "سارق" "سرقہ" سے ماخوذ ہے جس کے معنی چوری کرنے کے ہیں۔اس خوف سے کہ مبادا تم چمک جاؤ۔میں نے اپنی بیٹی سے اصطلاحی باتیں کیں اور اُسے سمجھا دیا کہ وہ پولیس کی مدد طلب کرے تاکہ وہ کمرہ میں خوردبین کا مشاہدہ کرنے والے "سارق" کو گرفتار کرے دوست یہ خیال بھولے سے بھی دل میں نہ لاؤ کہ انسان خواہ کتنا بھی اپنے کام میں منہمک ہو وہ ایک قزاق اور سارق کو اپنا ہم پیشہ تصور کرنے کی غلطی کر سکتا ہے۔

سارجنٹ مسکرایا۔

"تو کیا میں اسے لیجاؤں؟ آپ اس پر نالش کرنے کے لئے آمادہ ہیں نا؟" پروفیسر نے کہا "یقیناً ضرور" میں نہیں کہہ سکتا کہ اس پر "قزاقی" کا الزام لگ سکتا ہے یا محض "مداخلت مجرمانہ" کا بہرکیف کوئی دفعہ لگا دیجئے۔

پروفیسر نے سارجنٹ کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا شکریہ" "اور میرے چور دوست آپکی تشریف آوری کا بھی شکریہ" (ماخوذ) **پورن سنگھ ہنر امرتسری**

جذبات اختر

کیا جانے کیا ہوئی مری عادت شراب کی
یاس ایک کیفیت ہے سکون بہشت کی

وہ ولولے وہ جوش جوانی کے اب کہاں؟
لانے گئے ہیں ساتھ اُسے منکر و نکیر

کیا ہے امید؟ کچھ بھی نہیں۔اک فریب ہے
روشن ہے نور حق سے ہی آخر رُخ مجاز

شاید تمہیں خبر ہو کہ اک آرزو بھی ہے
گویا وہ اِک ترنگ تھی عہد شباب کی

امید ایک شکل ہے روز حساب کی
ساتھ آفتاب کے گئی دُھوپ آفتاب کی

بحث آپڑی ہے مجھ سے سوال و جواب کی
صحرائے زندگی میں جھلک ہے سراب کی

یہ بھی تو اک کرن ہے اسی آفتاب کی
اس دل کی۔ہاں اسی دل خانہ خراب کی

نا آشنا ہوں عشق سے اختر مگر مجھے
خدمت ضرور چاہیئے اپنے شباب کی

ہریچند شرما اختر

کلامِ حسرت

کوچہ اُس فتنۂ دوراں کا دکھا کر چھوڑا
دل نے آخر ہمیں دیوانہ بنا کر چھوڑا

پردہ ہم سے جو وہ کرتے تھے نہ کرنے پائے
شوقِ بیباک نے اُس کو بھی اُٹھا کر چھوڑا

بزمِ اغیار میں ہرچند وہ بیگانہ رہے
ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

تجھ سے ملنے پہ کسی کی ہمیں پروا نہ رہی
سب کو دنیا میں تری یاد لگا کر چھوڑا

اُن کے آنے کی خبر سن کے تمنائے مری
دل میں اِک شوق کا طوفان بپا کر چھوڑا

لطفِ ماضی کی جو کچھ یاد تھی باقی دل میں
اُس کو بھی تیرے تغافل نے مٹا کر چھوڑا

مجھ کو معلوم ہے پیمانے میں ساقی
تو نے جو کچھ کہ مری آنکھ بچا کر چھوڑا

دامنِ حسن ترا خونِ شہادت نے مرے
عطرِ خوشبوئے محبت میں بسا کر چھوڑا

مرگِ حسرت کا بہت رنج کیا آخرکار
اثرِ عشق نے اُن کو بھی رلا کر چھوڑا

مرسلہ بیگم حسرت موہانی

مقالاتِ فاخر

سخت مشکل ہے یہ کس کا بنے کس کا نہ بنے
دل کلیسا بنے کعبہ بنے بتخانہ بنے

نہ ہوئے کیفیتِ سیرِ دو عالم معلوم
کوئی دن شیخ گدائے درِ میخانہ بنے

تیرے انوار کی عالی نگہی ظاہر ہے
شعلۂ طور بنے دیدۂ موسےٰ نہ بنے

تابشِ حسنِ طبیعت نے جلایا ہم کو
آپ ہی شمع بنے آپ ہی پروانہ بنے

عقل کہتی ہے کہ آباد رہے خانۂ عشق
اور جنوں کا یہ تقاضا ہے کہ ویرانہ بنے

خندۂ حسن سے ظاہر ہے کہ پروا ہی نہیں
عشق سرگرم تمنا ہے کہ دیوانہ بنے

فاخر آغازِ محبت ہی میں ناکام رہے
شکر صد شکر کہ دنیا میں تماشا نہ بنے

فاخر جالندھری

عورت

نسوانی پرستش کے لئے کسی انتخاب کی ضرورت نہیں، وہ اپنے شوہر کی اس لئے پوجا نہیں کرتی کہ وہ حسین و خوشرو یا بانکا ترچھا نوجوان ہے۔ بلکہ صرف فرضِ خدمت کا احساس اُس کو خدمت کے لئے تیار کر دیتا ہے۔ اور پھر دُنیا کی کوئی طاقت اس کے عزم مصمم میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ بدصورت سے بدصورت اور نالائق سے نالائق شوہر میں حسن و جمال کی جھلک، لیاقت و قابلیت کا عنصر مطالعہ کرتی ہے۔ وہ صرف محبت کی بھوکی ہے۔ اُس کو صرف عشق کی آرزو ہے، وہ صرف چاہت کی حاجتمند ہے۔ وہ محض پسندیدگی کی متوالی ہوتی ہے، اور اگر اس کی یہ تمنائیں بر آجائیں تو تمام فضائے آسمانی میں اُس کی مسرت و شادمانی کا عشرِ عشیر بھی نہیں سما سکتا۔ اُس کو اگر اتنا محسوس ہو جائے کہ "اُس" جانب بھی دل میں جذبۂ پرستاری موجود ہے۔ تو اُس کی دُنیائے دل اسقدر وسیع ہو جائے کہ اگر وہ چاہے تو کل کائنات کو اُس کے ایک گوشہ میں محفوظ کر لے۔

ہمدردی کرنا، محبت کرنا، رنج و غم اُٹھانا، خدمت کرنا، عورت کی کل حیات کا لب لباب ہے۔ اور اُس کی زندگی کی تنہا خواہش یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ قربانگہ عشق پر فنا ہو جائے۔ اُس کی زندگی ایک طویل داستان ہے۔ جس میں قدم قدم پر اُس کو مصائب و تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ وہ ایک نئے گھر میں آتی ہے۔ جہاں کی چار دیواری سے بھی اکثر وہ ناآشنا ہوتی ہے۔ اور اُن پیاروں کو خیرباد کہتی ہے۔ جن میں وہ محبت و اُلفت کے ساتھ زندگی کا ایک معتد بہ حصّہ صرف کر چکی ہوتی ہے۔

رفتہ رفتہ اُس کی زندگی میں ایک دوسرا انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ وہ ماں بنتی ہے۔ اور ایک دوسرے وجود کو منصۂ شہود پر لانے میں اپنی زندگی معرض خطر میں ڈال دیتی ہے۔ پھر بچّے کی پرورش اور غور و پرداخت اُس کا عزیز ترین مشغلہ ہو جاتا ہے۔ اور ان فرائض کو نہایت سرگرمی اور بے لوثی سے انجام دیتی ہے۔ بچّہ بڑھتا ہے اور جُدا ہوتا ہے۔ اور یہ مجسمہ صدق و صفا پیکرِ اخلاص و وفا اپنے جگر گوشہ کو خواہ تعلیم کے لئے خواہ دوسروں کی شبستانِ عیش و عشرت کی رونق دوبالا کرنے کے لئے جدا کرتی ہے۔ اور بقول حسرت ؎

جسم ہوتا ہے جدا جان سے گویا حسرتؔ - آسماں اُن سے چھڑاتا ہے جُدا ہوتے ہیں

عورت میں روحانیت اور مذہبیت کا رنگ زیادہ غالب ہوتا ہے۔ اور اس جذبہ سے وہ مرد سے بہت زیادہ قوی تر ہوتی ہے۔ آدمی حالت تذبذب میں گرفتار رہتا ہے۔ چون وچرا کے پھندے میں پھنس جاتا ہے۔ عقلیات اور منطق کے گورکھ دھندے میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ لیکن عورت درجہ ایقان تک بہت جلد پہنچ جاتی ہے۔ وہ ذوالجلال کی بے ریا پرستش میں مستغرق نظر آتی ہے۔ وہ روحانیت کے وہ مراتب حاصل کرلیتی ہے۔ جو مرد کی رسائی سے بالعموم بالاتر ہوتے ہیں۔ وہ رموز حقائق جن کی تلاش و جستجو میں ہم اپنی عمریں ختم کردیتے ہیں۔ عورت کے ایوانِ دل کے اولین نقش ونگار ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے ورڈس ورتھ نے خوب کہا ہے۔

تو ہمارے خیالات کی پرواز سے بالاتر ہے۔
اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ تو خدا کے نزدیک ہے
تو تمام عمر گلشن خلیں میں موجود رہتی ہے۔ اور دل
کے اندرونی بت خانہ میں اُس خدا کی پرستش کرتی رہتی
ہے جو تیرے متصل ہوتا ہے۔ لیکن ہماری نگاہوں سے
پوشیدہ

ایک لطیف الخیال عورت جو مذہبی اور ادبی تعلیم سے بہرہ اندوز ہو، اور ایک روشن دماغ اور پاک دل رکھنے کے ساتھ پاکباز اور نیک کردار ہو" فطرت کی بہترین تصنیف" کے نام سے یاد کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ اُسکے شریکِ حیات کا کام ہے۔ کہ اُس کو صراطِ مستقیم پر چلائے اور قعرِ مذلت میں گرنے سے روکے۔

عورت کو فطرتاً ایک سہارے کی، ایک راہبر کی ضرورت ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ کوئی دوسری مضبوط ہستی اُس پر مستولی ہوجائے۔ اور اُس کی مدد و معاون بن جائے وہ اس امر کی ضرورت مند ہے کہ کسی کا گھر اُس کا ملجا و ماوا بنے، اور کسی کا قوی ہاتھ اس کے لئے سپر کا فرض انجام دے۔ وہ خود کمزور و نازک بدن ہے۔ اور کارزارِ زندگی میں تنہا بازی نہیں لے جاسکتی۔

تماشائی

رنگ تغزل

بے تعلق زندگی اچھی نہیں	زندگی کیا موت بھی اچھی نہیں
دل لگاؤ تو لگاؤ دل سے دل	دل لگی ہی دل لگی اچھی نہیں
ناامیدی کا ہوا دل میں قیام	شیشہ اچھا ہے پری اچھی نہیں
یہ ہوا یہ ابر یہ سبزہ حفیظ	آج پینے میں کمی اچھی نہیں

گورا

مصنفہ رابیندر ناتھ ٹیگور مترجمہ عبدالستار خاں

باب سولہواں

بارودا۔ "کیا آپ سوچترا کی شادی نہ کریں گے؟"

پریش بابو نے اپنی سفید داڑھی پر نہایت متانت سے ہاتھ پھیر کر اپنی عادت کے مطابق نرم لہجہ میں جواب دیا۔ "کوئی منگیتر بھی تو ہو؟"

بارودا۔ "کیوں؟ یہ کون نہیں جانتا ہے کہ پنو بابو سے اُس کی نسبت ہو چکی ہے اور سوچترا کو بھی اس کا علم ہے۔"

پریش بابو۔ مجھکو تو یقین نہیں کہ سوچترا پنو بابو کو پسند بھی کرتی ہے یا نہیں۔"

بارودا۔ "بس رہنے بھی دو۔ یہ باتیں مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ میں تو سوچترا کو اپنی ہی لڑکیوں کے برابر سمجھتی ہوں پھر وہ کیوں ایسا کرے۔ پنو بابو جیسا لایق اور پرہیزگار آدمی اُس کا خواہاں ہو۔ کیا یہ کم فخر کی بات ہے؟ چاہے تم جو کہو ہماری لیبو نیا اس سے کہیں خوبصورت ہے مگر ہم جس سے اس کا بیاہ کرنا چاہیں گے وہ کبھی نہیں نہ کریگی۔ اگر آپ نے اسی طرح سوچترا کا دماغ آسمان پر چڑھا دیا تو پھر اُسے دولھا مل چکا۔"

پریش بابو خاموش رہ گئے۔ وہ کبھی اپنی بیوی سے زیادہ بحث نہ کرتے تھے۔ خاصکر سوچترا کے متعلق تو بالکل نہ بولتے تھے۔

ستیش جب پیدا ہوا تو اُس کی ماں مرگئی۔ اُس وقت سوچترا کی عمر صرف ۷ سال کی تھی۔ اُن کا باپ رام شرن ہالدار اپنی بیوی کے انتقال کے بعد برہمو سماجی ہوگیا۔ اُس نے اپنے ہمسایوں کے مظالم سے بچنے کی غرض سے ڈھاکہ میں جاکر پناہ لی۔ وہیں اُس نے ڈاکخانہ میں ملازمت کرلی۔ اُسی زمانہ میں اُس سے اور پریش بابو سے دوستی ہوگئی۔ اتحاد اتنا بڑھتا گیا کہ سوچترا پریش بابو کو اپنے والد کے بجائے سمجھنے لگی۔ اچانک رام شرن کا انتقال ہوگیا۔ اس کے پاس جو سرمایہ نقد تھا وہ اُس نے اپنے بچوں کو بانٹ کر اُنہیں پریش بابو کے سپرد کردیا۔ اور وہ اُن کے سرپرست ہوگئے۔

یہ معلوم ہوچکا ہے کہ ہرن بابو بڑا کٹر برہمو سماجی تھا۔ برہمو سماج کے ہر شعبہ میں اس کو بڑا دخل تھا۔ وہ مکتب شبانہ کا مدرس تھا۔ ایک اخبار کا مدیر تھا۔ اور لڑکیوں کے مدرسہ کا ناظم تھا۔ اور درحقیقت وہ بڑا

جفاکش اور محنتی تھا۔ ہر شخص کو یہ امید تھی کہ وہ ایک دن برہمو سماج میں بڑے جلیل القدر عہدے پر پہنچیگا۔ اُسکو زبان انگریزی پر عبور تھا اور فلسفہ میں خاصی دسترس تھی اسی وجہ سے وہ اپنے طلبا کے ذریعہ برہمو سماج حلقہ کے باہر بھی بہت مشہور تھا۔

انہی خوبیوں کی وجہ سے سوچترا اس کی خصوصیت کے ساتھ عزت و توقیر کرتی تھی۔ یوں تو وہ ہر برہمو سماجی کی عزت کیا کرتی تھی۔ جب وہ ڈھاکہ سے کلکتہ آئی تو ہرن سے ملاقات پیدا کرنے کی بہت خواہاں تھی۔

آخر کار یہی نہیں ہوا کہ صرف سوچترا اور ہرن سے ملاقات ہی ہوگئی بلکہ وہ بھی سوچترا کی طرف اپنے خاص میلان کے اظہار سے نہ رک سکا۔ ہرن نے سوچترا سے اپنے تعشق کا صاف صاف اظہار تو نہیں کیا۔ بلکہ وہ ان کوتاہیوں کو جو سوچترا میں تھیں دور کرنے اُن خامیوں کو جو اُس میں تھیں مٹانے جو غلطیاں تھیں اُن کو درست کرنے۔ اس کے ذوق کو بڑھانے اور اس کی حالت کو درست کرنے میں خصوصیت کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ جس سے سب پر یہ ظاہر ہوگیا کہ وہ اس لڑکی کو خاص طور پر اس قابل بنانا چاہتا تھا کہ وہ اُس کی سچی مونس ہمدرد اور مددگار ہوسکے۔ جب سوچترا پر یہ منکشف ہوگیا کہ اُس نے اُس مشہور و معروف شخص کا دل لے لیا ہے تو اُس میں بھی ایک فخر سا پیدا ہوگیا جو عزت سے مملو تھا۔

طرفین میں اس کے متعلق کبھی کوئی گفتگو نہ ہوئی تھی۔ تاہم ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ ہرن اور سوچترا کی شادی ضرور ہوگی۔ سوچترا بھی اس کو طے شدہ امر سمجھتی تھی۔ اور اُسی وقت سے وہ اس کوشش میں رہتی تھی کہ علم و عمل غرضیکہ جس طریقہ پر بھی وہ اپنے آپ کو اس شخص کی نسبت کے قابل بنائے جس نے اپنی زندگی برہمو سماج کی بہبود کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ اس شادی کا خیال اس کو بیم و خوف اور ذمہ داری سے بنے ہوئے ایک سنگین قلعہ کی طرح معلوم ہوتا تھا ــــ" وہ آرام و آسائش سے رہنے کا مقام نہ تھا بلکہ جد و جہد اور تگ و دو کی منزل تھی ــــ وہاں کے واقعات معمولی روزانہ زندگی کے واقعات نہ تھے بلکہ تاریخی واقعات تھے۔

اس موقع پر اگر شادی ہوگئی ہوتی تو دلہن والے اس کو فال نیک سمجھتے۔ مگر بدقسمتی سے ہرن خود اپنی زندگی کی ذمہ داریوں کو اتنی اہمیت دینے لگا تھا کہ وہ محض باہمی کشش اور تعشق کی بنا پر اپنی شادی کرنا کسر شان سمجھتا تھا۔ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ میری شادی سے برہمو سماج کو کیا فائدہ پہنچیگا وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ خاص یہی وجہ تھی کہ وہ سوچترا کو آزمانے لگا۔

لیکن اس طرح جب آپ دوسروں کو آزمانے
کی کوشش کرتے ہیں تو آپ کی بھی آزمائش ہونے لگتی
ہے۔ جب ہرن سے بے تکلفی ہوگئی اور وہ اس خاندان
میں پنو بابو کے نام سے پکارا جانے لگا تو اب وہ اس
گھر میں صرف انگریزی زبان کا مخزن، علم موجودات و
الٰہیات کا ماہر اور برہمو سماج کے لئے فائدہ رساں خوبیوں کا
مجسمہ ہی نہ سمجھا گیا بلکہ وہ انسان بھی سمجھا جانے لگا۔ اور اس
حیثیت میں وہ محض شے قابل احترام نہ رہ گیا بلکہ وہ اپنی
پسند اور غیر پسندیدگی کی چیز بن گیا۔

تعجب تو یہ ہے کہ مذہبی پہلو جس نے دوسرے
سوچترا کے دل میں توقیر پیدا کر دی تھی اب تیر سے
بدنما دکھائی دینے لگا جس طریقہ پر ہرن نے اپنے آپکو
برہمو سماج کے تمام محاسن اور خوبیوں کا محافظ بنایا تھا
اُس نے مضحکہ خیز طریقہ پر اُس کو ہیچ بنا دیا۔ صداقتیا
حقائق سے انسان کا صحیح تعلق یہی ہے کہ وہ اس کا
عاشق یا فدائی ہو۔ فدائیت یا عشق کے تعلق ہی سے
انسانی فطرت میں انکساری پیدا ہوتی ہے۔ جہاں
انسان میں غرور اور نخوت پیدا ہوتی وہیں اسی تناسب
سے اُس کی بڑائی زائل ہو جاتی ہے۔ اسی اصول پر سوچترا
نے ہرن اور پریش بابو کے امتیازی فرق کو معلوم کر لیا
پریش بابو کے چہرے کو دیکھتے ہی اُن کی باطنی شرافت
ظاہر ہونے لگتی تھی۔ لیکن ہرن کے ساتھ یہ معاملہ
بالکل برعکس تھا۔ اس کے ہر قول و فعل سے ذاتی نمود
کی تہ میں دوسری چیزیں چھپکر محض اس کی برہمو سماجیت
نہایت بدنما شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔

ہرن برہمو سماج کے بہبود کے خیالات سے
مصور ہوکر پریش بابو کی بھی مخالفت کئے بغیر نہ رہتا
تھا۔ اس وقت سوچترا مثل چوٹ کھائے ہوئے سانپ
کے تڑپ اُٹھتی تھی۔ اس زمانہ میں بنگال میں انگریزی داں
طبقہ بھاگوت گیتا بالکل نہ پڑھتا تھا۔ لیکن پریش بابو
سوچترا کو سنایا کرتے تھے۔ اُنہوں نے مہابھارت کا
پورا قصہ بھی اُسے پڑھکر سنایا تھا۔ ہرن بابو اس کو بالکل
پسند نہ کرتا تھا وہ تو برہمو سماجیوں کے یہاں سے اس
قسم کی کتابیں بالکل نکلوا دینا چاہتا تھا۔ اُس نے خود
بھی ان کتابوں کو کبھی نہ پڑھا تھا خصوصاً اس لئے کہ
وہ ان تمام کتابوں سے جن کو قدامت پسند فرقہ پسند کرتا
بالکل علیحدہ رہے۔ دنیا کے مختلف مذاہب کی کتابوں
میں اُس نے صرف انجیل پڑھی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ پریش بابو
مذہبی کتابوں کا پڑھنا یا اور اسی قسم کے دوسرے معاملات
برہمو سماجیت کی امتیازی علامت نہ سمجھتے تھے۔ اور یہی
ہرن کو خار کی طرح کھٹکتا تھا۔ لیکن سوچترا یہ برداشت
نہ کر سکتی تھی کہ کوئی خواہ مخواہ بیٹھے بیٹھے ہی کیوں نہ ہو پریش بابو

اعتراضات کرے اور یہی بات ہرن میں زیادہ نمایاں تھی جس نے اُس کی نظر میں ہرن کی قدر کھو دی تھی۔

باوجودیکہ ہرن کی متعصبانہ فرقہ بندی اور تنگ خیالی کی وجہ سے سوچترا کی طبیعت اس سے ہٹتی جاتی تھی۔ تاہم فریقین میں امکان شادی پر کبھی کوئی سوال پیدا نہ ہوا۔ مذہبی حلقہ میں جو لوگ بڑا تصنع کرتے ہیں آخرکار اُن کی اصلیت ظاہر ہونے لگتی ہے۔ پریش بابو بھی ہرن کی مخالفت نہ کرتے تھے۔ اور چونکہ ہر شخص سمجھتا تھا کہ وہ آیندہ چل کر برہمو سماج کا ایک زبردست رکن ہوگا چنانچہ اُنھوں نے بھی اس معاملہ میں اپنی خاموش رضامندی کا اظہار کیا تھا۔ ان کو اگر کوئی خیال تھا تو یہی تھا کہ آیا سوچترا ایسے خاوند کے لایق بھی ہے یا نہیں۔ اُن کو یہ معلوم کرنے کا خیال بھی نہ آیا تھا کہ سوچترا ہرن کو کس حد تک پسند کرتی ہے۔

اس شادی کے متعلق جس طرح دوسرے اُس کی رائے دریافت کرنا غیر ضروری سمجھتے تھے اسی طرح وہ بھی اپنی ذاتی رائے کو نظرانداز کئے ہوئے تھی سب برہمو سماجیوں کی طرح وہ بھی یہ سمجھی ہوئی تھی کہ جس دن ہرن یہ کہیگا کہ میں اس لڑکی کو اپنی زوجیت میں قبول کرتا ہوں۔ اُسی دن وہ بھی اپنی زندگی کے اہم فرائض اس شادی کی شکل میں قبول کرلیگی۔

واقعات تو کچھ اسی قسم کے تھے۔ اُس دن سوچترا کو گورا کی طرفداری میں ہرن سے سخت کلامی کرتے ہوئے پریش بابو کو کچھ شک سا ہو گیا کہ سوچترا کے دل میں ہرن کی کافی وقعت نہیں ہے۔ اُنھوں نے سوچا کہ شاید اس اختلاف کا جس کا اظہار ہو چکا ہے کوئی مخفی اور گہرا سبب ہوگا۔ یہی سبب تھا کہ جب باروداتے شادی کا تذکرہ کیا تو وہ پہلے کی طرح زور نہ دے سکے۔

اُسی دن بارودا نے سوچترا کو علیحدہ بلاکر کہا "تم نے اپنے بابا جان کو متفکر کر دیا ہے"

یہ سُن کر سوچترا بہت پریشان ہوئی ـــــ سوچترا کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی رنجدہ بات نہ ہوسکتی تھی کہ وہ خواہ لاعلمی ہی میں کیوں نہ ہو پریش بابو کے لئے رنج کا باعث بنے۔ وہ زرد پڑگئی اور پوچھا "خدا خیر کرے، میں نے کیا کیا ہے"

بارودا" میں تو نہیں جانتی۔ خدا جانے اُن کے دل میں یہ بات کیسے پیدا ہوگئی ہے کہ تم پنو بابو کو نہیں پسند کرتی ہو۔ سب برہمو سماجی یہ جانتے ہیں کہ اس سے تمہاری شادی ایک طرح قرار پاچکی ہے ـــــ اگر تم نے "

سوچترا" اماجان میں نے تو اب تک اسکے متعلق کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے"

سوچترا کو متعجب ہونے کی وجہ بھی تھی۔ ہاں یہ

یہ ضرور ہے کہ وہ اکثر موقعوں پر ہرن کی عادت سے چڑھ چکی تھی۔ لیکن اس نے شادی کرنے کے متعلق خیال تک میں اختلاف کا اظہار نہ کیا تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے دل پر یہ نقش ہو گیا تھا کہ اس میں اس کے ذاتی رنج و راحت کو کوئی دخل نہیں ہے۔

سوچتے سوچتے اُسے یاد آگئی کہ اُس دن وہ پریش بابو کے سامنے ہرن پر خفا ہو گئی تھی۔ اور اسی وجہ سے وہ رنجیدہ ہوئے۔ وہ اپنی اس حرکت پر سخت نادم ہوئی اور تہیہ کر لیا کہ آیندہ وہ کبھی ایسا موقع نہ آنے دیگی۔

اتفاق سے ہرن بھی اُسی دن شام کو آگیا۔ باروا اُس کو اپنے کمرے میں بلا کر کہا "پنو بابو میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ آپ میری سوچترا سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں نے آپ کی زبان سے اس کے متعلق کبھی کچھ نہیں سنا۔ اگر آپ کا یہی ارادہ ہے تو پھر آپ کہتے کیوں نہیں ؟"

اب ہرن بھی اپنی رضامندی ظاہر کرنے سے زیادہ نہ رک سکا۔ اُسے سوچترا کو بغیر اپنا شکار بنائے چین نہ تھا۔ اس نے سوچا کہ سوچترا کی برہمو سماج کی خدمت کی قابلیت کا اور اپنے خاندانی محبت کا امتحان تو بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اُس نے جواب دیا "فی الحال میں اس کی ضرورت نہ سمجھتا تھا اور میں اس انتظار میں تھا کہ اس کی عمر اٹھارہ سال کی ہو جائے تو کہوں"

باروا "یہ تو آپ کی زیادتی ہے اُس کی عمر چودہ سے زائد ہو چکی ہے اور یہی شادی کی عمر ہے"

اُس دن چائے کی میز پر سوچترا کا ہرن کے ساتھ برتاؤ دیکھ کر پریش بابو کو حیرت ہوئی۔ کیونکہ ہرن کی وہ کبھی اتنی خاطر مدارات نہ کرتی تھی۔ جب ہرن جانے لگا تو لیبو بیا کا ایک نیا کشیدہ دکھلانے کے بہانے سے اُس نے اُس سے رُکنے کے لئے اصرار کیا۔

پریش بابو کو ایک گونہ اطمینان ہو گیا۔ اُنھوں نے سمجھا کہ میں نے غلطی کی تھی۔ بلکہ اپنی اس غلط فہمی پر دل ہی دل میں ہنستے رہے۔ اُنھوں نے یہ سمجھا کہ ان دونوں میں کوئی معشوقانہ اختلاف ہو گیا ہوگا۔ اور اب یہ اختلاف مٹ گیا ہے۔

اُسی دن شام کو رخصت ہونے کے قبل ہرن نے پریش بابو سے سوچترا کی شادی کے متعلق درخواست کی اور کہا "میں چاہتا ہوں کہ اب شادی میں زیادہ دیر نہیں ہونا چاہئے"

پریش بابو متعجب ہوئے اور کہا "آپ تو ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ اٹھارہ سال سے کم عمر میں لڑکی کی شادی کرنا مناسب نہیں۔ آپ نے اسی موضوع پر اخباروں میں مضامین بھی لکھے ہیں"

ہرن ”لیکن سوچیے! اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے اس میں جو باتیں ہیں وہ تو بوڑھی عورتوں میں بھی نہیں پائی جاتیں“

پریش بابو نے مستقل لیکن نرم لہجہ میں کہا ”ہاں یہ ممکن ہے کہ اس میں پختگی آگئی ہو۔ لیکن جب تک کوئی وجہ نہ ہو وقت کا انتظار کرنا چاہیے اور آپ کو اپنی رائے پر قایم رہنا چاہیے“

ہرن اپنی کمزوری سے محجوب ہوگیا اور اپنی جھینپ مٹانے کی غرض سے کہا ”جی ہاں یہ درست ہے۔ میری صرف یہی خواہش ہے کہ ایک دن سب دوستوں کو مدعو کر کے خدا کا نام لے کر بات پکی کر لی جائے“

پریش بابو ”ہاں یہ ٹھیک ہے“

باب سترہواں

دو تین گھنٹہ کے بعد جب گورا کی آنکھ کھلی تو بنئے کو اپنے پاس سوتا ہوا دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہوگیا اُس کو ایسی ہی خوشی ہوئی جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میری بیش قیمت چیز گم ہوگئی ہے اور جاگنے کے بعد اُسے معلوم ہو کہ یہ تو محض خواب تھا۔ اُس وقت اُس کو کما حقہ احساس ہوگیا کہ بنئے سے دوستی کے تعلقات قطع کرنے کے بعد اُس کی کیا حالت ہوتی۔ وہ اسوقت بہت مسرور ہو رہا تھا۔ اس نے بنئے کو جھنجوڑ کر اٹھایا اور کہا ”اٹھو! اٹھو! بہت کام ہے“

گورا کا معمول تھا کہ وہ روز صبح اُٹھ کر اپنے غریب اور نادار پڑوسیوں کے یہاں اُن کی مزاج پرسی اور خبرگیری کے لئے جایا کرتا تھا۔ نہ تو وہ تبلیغ کی غرض سے جاتا اور نہ اُن پر احسان کرنے کی خاطر۔ وہ تو محض اُن سے ملنے جایا کرتا تھا۔ وہ اپنے ذی علم دوستوں کے حلقے سے اتنا مانوس نہ تھا۔ یہ غریب پڑوسی اُس کی خاطر مدارات کرتے اور حقہ پیش کرتے تھے۔ گورا بھی محض اُن سے اور بھی زیادہ قریب ہونے کی خاطر حقہ پینے لگا تھا۔

اُن میں سب سے زیادہ گورا کی تعظیم نندا کیا کرتا تھا جو ایک بڑھئی کا لڑکا تھا۔ اس کی عمر صرف بائیس سال کی تھی اور اپنے والد کے ساتھ صندوق سازی کا کام کیا کرتا تھا۔ وہ کھیلتا بھی بہت اچھا تھا کرکٹ ٹیم میں سب سے اعلیٰ درجہ کا بولر[1] تھا گورا نے کرکٹ اور دوسرے کھیلوں کا کلب قایم کیا تھا جس میں لوہار اور بڑھئی کے لڑکوں کو

[1] کرکٹ کے کھیل میں بولر اس شخص کو کہتے ہیں جو گیند پھینکتا ہے۔

شرفا کے لڑکوں کے ساتھ ممبر بنایا تھا۔ اس کلب کے ممبروں میں نندا کے مقابل میں کوئی کھیلنے والا نہ تھا شرفا کے چند لڑکے اس سے جلتے تھے لیکن گورا کے دباؤ کی وجہ سے سب نے اُسے اپنی ٹیم کا کپتان چُن لیا تھا۔

کئی دن ہوئے کہ نندا کے پاؤں پر اوکھانی گر پڑی تھی اور زخم ہوگیا تھا۔ وہ کرکٹ کھیلنے نہ آیا تھا۔ گورا بھی بی نئے کی وجہ سے کچھ ایسا عدیم الفرصت ہو رہا تھا کہ نندا کو دیکھنے کو جانے کا اُسے موقع ہی نہ مل سکا۔ آج وہ دونوں اُس کو دیکھنے کے لئے اُس کے ہاں گئے۔

جب وہ دروازے پر پہنچے تو انہوں نے اندر عورتوں کے رونے کی آواز سنی۔ گھر پر نہ تو نندا کا باپ اور نہ کوئی دوسرا مرد تھا۔ قریب ہی ایک دوکان تھی۔ اسی دوکاندار سے معلوم ہوا کہ نندا تو آج ہی صبح مر گیا۔ اور تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ اُسے جلانے لے گئے تھے۔

ہیں! گورا مرگیا۔ وہ کتنا تندرست اور مضبوط آدمی تھا اُس کی عمر ہی کیا تھی! آج ہی صبح مرگیا! گورا کے سارے بدن میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ نندا ایک معمولی بڑھئی کا لڑکا تھا۔ چند ہی آدمی اُس کی جدائی کو محسوس کرینگے اور وہ بھی تھوڑے ہی دنوں تک۔ لیکن گورا کی عجیب حالت تھی۔ اس کو نندا کی موت بے ہنگام اور غیر ممکن معلوم ہوتی تھی۔ گورا نے دیکھا تھا کہ اُس میں کتنی طاقت برداشت تھی سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں آدمیوں کی کمی نہیں لیکن اُس جیسا کوئی بھی نہیں۔

دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ اسے تشنج کا عارضہ ہوگیا تھا۔ اُس کے باپ نے تو ڈاکٹر کو بلانا چاہا تھا لیکن اُس کی ماں کو یہ یقین ہوگیا کہ اُسے بھوت لگا ہے اُس نے ایک جھاڑنے والے کو بلا بھیجا جو اُسکے پاس بیٹھا ہوا جھاڑتا پھونکتا رہا اور سرخ لوہے سے اُس کو داغتا رہا۔ شروع شروع میں جب نندا بیمار ہوا تھا تو اُس نے گورا کو بلوانے کو کہا تھا۔ لیکن اس کی ماں نے صرف اسی خوف سے کہ گورا اس کے علاج کرانے کی ضد کریگا اُس کو خبر تک نہ دی۔

مکان سے لوٹتے وقت بی نئے نے کہا "اللہ ری جہالت! مرض کیا ہے اور علاج کیا کیا گیا!"

گورا نے جھلا کر کہا "محض جہالت کہکر ہم کو چھٹکارا نہیں مل سکتا اور نہ ہم بچ سکتے ہیں۔ اگر آپ کو اس جہالت کی حقیقت اور نتائج کا صحیح معنوں میں یقین ہو جاتا تو آپ محض اظہار تاسف پر اکتفا نہ کرتے۔"

گورا نے قدم تیزی سے اُٹھائے اور بی نئے بھی بغیر جواب دیئے ہوئے تیزی سے ساتھ چلنے لگا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد گورا نے کہا

"یہ ممکن نہیں کہ میں اس معاملہ کو سرسری سمجھ کر خاموش ہو جاؤں۔ یہ بھوت جس نے نند لال کو مارا ہے اس کی سخت چوٹ میرے دل پر پڑی ہے۔ میرے پورے ملک کو اس سے ضرر پہنچا ہے۔ یہ کوئی انفرادی حادثہ نہیں بلکہ اُسی زنجیر کی ایک کڑی ہے"۔

بی سینئے کو پھر بھی خاموش دیکھ کر گورا نے زور سے کہا "بی سینئے جو کچھ تم اپنے دل میں سوچتے ہو میں اُسے خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم یہی سوچتے ہو کہ اس کا کوئی علاج نہیں۔ اگر ہے بھی تو اس کو مدت درکار ہے لیکن میں ایسا خیال نہیں کرتا۔ اگر میں ایسا سوچتا تو اب تک زندہ بھی نہ رہتا۔ ہر مصیبت کا جو ملک پر نازل ہوتی ہے دفعیہ ضرور ہے خواہ وہ مصیبت کتنی ہی عظیم کیوں نہ ہو۔۔۔۔ اور وہ علاج میرے ہاتھوں میں ہے۔ کیونکہ مجھکو اس کا یقین ہے کہ میں تمام رنج مصیبت اور تذلیل جو مجھکو گھیرے ہوئے ہے اس کو برداشت کرنے کے قابل ہوں۔

بی سینئے۔ "مجھ میں جرأت نہیں کہ ان مصائب کے ہوتے ہوئے میرا تیقن قایم رہے"۔

گورا۔ مجھکو کبھی یہ یقین نہیں آسکتا کہ مصائب لازوال ہیں۔ تمام کائنات کی قوت ارادی اور قوت خیالی ہر طرف سے اس پر حملہ کر رہی ہے۔ بی سینئے میں تم کو باصرار تمام یقین دلاتا ہوں کہ تم کبھی یہ خیال نہ کرو کہ ہمارے ملک کا آزاد ہونا غیر ممکن ہے۔ ہم کو اپنے دلوں میں اپنے ملک کی آزادی کے یقین کے ساتھ سرگرم عمل بھی رہنا چاہیئے۔ تم اس بیہودہ خیال پر تکیہ کر کے بیٹھ رہو کہ آئندہ کسی نیک ساعت سے ہندوستان کی آزادی کی جنگ شروع ہوگی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ جنگ شروع ہو چکی ہے اور جاری ہے۔ محض پریشان اور منتظر رہنے سے زیادہ بزدلی اور کیا ہو سکتی ہے"۔

بی سینئے۔ گورا سنو! تم میں اور دوسروں میں بڑا فرق ہے۔ روزمرہ کے واقعات تم میں نئی قوت پیدا کرتے رہتے ہیں۔ یہ وہی واقعات ہیں جو مدت سے ہوتے آئے ہیں۔ لیکن ہم ان سے اسی طرح بیخبر رہتے ہیں جیسے سانس لینے سے۔۔۔۔ ان واقعات سے نہ تو ہم میں خوشی پیدا ہوتی ہے اور نہ رنج۔ ان سے نہ کوئی امید پیدا ہوتی ہے اور نہ ناامیدی۔ دن یوں ہی گذرتے جاتے ہیں ہم اپنے ماحول میں نہ تو اپنی حقیقت پہچانتے ہیں اور نہ اپنے ملک کی"۔

یکایک گورا مارے غصہ کے سرخ ہو گیا پیشانی کی نسیں تنتا اٹھیں مٹھیاں باندھ لیں اور زور سے ایک گھوڑا گاڑی کے پیچھے دوڑنے لگا اور زور سے چلا کر کہنے لگا ۔۔۔۔ "روکو! روکو!!" اُس کی آواز سے لوگ چونک پڑے۔ ایک موٹا سا بنگالی گاڑی ہانک رہا تھا اُس نے

لوٹ کر دیکھا۔ گھوڑوں کو زور سے ایک چابک مارا اور دیکھتے ہی دیکھتے غایب ہوگیا۔

ایک بڈھا خانساماں اپنے سر پر ایک ٹوکری میں کچھ پھل۔ انڈے اور ترکاریاں اپنے کسی انگریز مالک کے لئے لے جا رہا تھا۔ موٹے بنگالی نے اُس کو ہٹنے کے لئے آواز دی۔ لیکن بہرے بڈھے نے نہ سنا اور کچلتے کچلتے بچ گیا۔ وہ تو سنبھل گیا لیکن اُس کی ٹوکری گر پڑی۔ پھل۔ انڈے۔ ترکاریاں سب زمین پر بکھر گئیں۔ بنگالی غصہ میں آکر اُس کی طرف پھرا اور غصہ میں کہنے لگا "حرامزادے سؤر راستہ سے نہیں ہٹتا" اور اس زور سے اس غریب کے ایک ہنٹر مارا کہ خون نکل آیا۔

"ہائے اللہ!" اُس غریب خانساماں کے منہ سے نکل گیا اور اُس نے ایک گہری سانس لی۔ وہ نہایت ہی غربت و بے بسی کے عالم میں ان چیزوں کو سمیٹنے لگا اُس غریب خانساماں کو بڑا صدمہ ہوا۔ جب اُس نے دیکھا کہ ایک شریف آدمی اسکی تکلیف میں ہمدردی کیلئے اتنی تکلیف کر رہا ہے۔ اُس نے کہا بابو صاحب آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ اب یہ چیزیں کسی کام کی تھوڑی ہیں"

گورا یہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اُس سے کوئی مدد نہیں پہنچ سکتی بلکہ وہ اس شخص کے لئے جس کو مدد دی جا رہی تھی مزید صدمہ کا موجب تھا۔ لیکن وہ لوگوں کو بتلانا چاہتا تھا کہ ایک شریف تمام ذلت اپنے اوپر لیکر اُس مذہب کی توقیر کے لئے جس کی توہین کی گئی اُس ظلم اور نقصان کے ازالہ کے لئے تیار ہے جو دوسرے نے کیا تھا۔

جب ٹوکری بھر گئی تو گورا نے کہا "دو تمہاری جن چیزوں کا نقصان ہوا ہے اُن کی قیمت تو اب تم کو اپنے مالک سے نہ ملیگی۔ اب تم میرے ساتھ میرے گھر چلو وہاں میں تم سے یہ چیزیں خرید لونگا لیکن تم سے میں ایک بات کہتا ہوں وہ یہ کہ تم نے چپ چاپ اس ذلت کو برداشت کر لیا۔ اس لئے خدا تم کو معاف نہیں کر سکتا"

مسلمان نے جواب دیا "خدا ظالم کو سزا دیگا۔ مجھے کیوں سزا دینے لگا"

گورا "دنیا میں جو ظلم سہتا ہے وہ ظالم بھی ہے۔ کیونکہ دنیا میں برائیوں کی جڑ وہی ہے۔ ممکن ہے کہ تم میرے کہنے کا مطلب نہ سمجھو سکو لیکن تمہیں ہمیشہ یہ خیال رکھنا چاہئے کہ مذہب کے معنی زہد و اتقا ہی نہیں ہیں۔ اس سے ظالموں اور برائی کرنے والوں کو اور بھی شہ ملتی ہے۔ آپ کے رسول محمد (صلعم روحی فداہ ابی و امی) اسکو خوب سمجھتے

اس لئے آپ نے ظلم سہنے ہی کی تلقین نہیں کی۔"
گورا کا مکان چونکہ دور تھا اس لئے خانساماں کو لیکر بی نئے کے یہاں چلا گیا۔ اُس کی میز کے سامنے کھڑا ہوکر اُس سے روپیہ نکالنے لگا۔
بی نئے "ذرا ٹھیر تو جائیے میں چابی لے لوں"
لیکن گورا کے ایک ہی جھٹکے سے قفل ٹوٹ گیا اور دراز کھل گیا۔ پہلی چیز جو اُسے نظر پڑی پریش بابو کے پورے خاندان کا ایک فوٹو تھا۔ یہ فوٹو بی نئے کو ستیش کے ذریعہ ملا تھا۔ گورا نے روپیہ دیکر بوڑھے کو تو رخصت کر دیا لیکن اس فوٹو کے متعلق ایک لفظ بھی نہ بولا۔ گورا کو خاموش دیکھکر بی نئے بھی چُپ ہو رہا۔ ہاں ضرور تھا کہ اگر اس کے متعلق کچھ باتیں ہوجاتیں تو بی نئے کی طبیعت کچھ ہلکی ہوجاتی۔
یک بیک گورا نے کہا "اچھا اب میں جاتا ہوں"۔
بی نئے "یہ بھی خوب رہی۔ کیا آپ اکیلے جائیں گے۔ آپ کو یاد نہیں کہ کھانا کھانے کے لئے اماں جان نے مجھکو بھی بلوایا ہے۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں"۔
دونوں ساتھ چلے راستہ بھر گورا بالکل خاموش رہا۔ اس فوٹو نے گورا کو یاد دلا دیا کہ بی نئے کے دلی رجحان کی اصلی رَو اُسے ایک ایسے راستہ پر لئے جارہی ہے جس سے گورا کے مقصد زندگی کو کوئی واسطہ نہیں۔
بی نئے گورا کی خاموشی کا سبب تو سمجھ گیا۔ لیکن اس نے اس سکوت کو توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ اُس کو یہ خیال ہوگیا کہ گورا کے دل میں وہ بات کھٹک رہی ہے جو اُن کی دوستی کے تعلق کو توڑنے کا اصلی سبب ہے۔
جب وہ گھر پہنچے تو دیکھا کہ مہم دروازہ پر کھڑا سڑک کی طرف دیکھ رہا ہے۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی چلا کر کہا "ابتک تم لوگ کہاں تھے؟ چونکہ رات بھر تم دونوں جاگتے رہے ہو اس لئے میں نے سمجھا کہ کہیں سڑک کے کنارے تم دونوں پڑکر سو رہے۔ دیر ہو رہی ہے بی نئے آجاؤ نہا لو"۔
بی نئے کو وہاں سے اس طرح ٹال کر مہم نے گورا سے مخاطب ہوکر کہا "گورا! میں نے جو کچھ تم سے کہا ہے اُس پر تم سنجیدگی سے غور کرو۔ ہم نے مانا کہ بی نئے سخت پابند نہیں پھر یہ تو بتاؤ کہ اس سے بہتر بھی کوئی ہے؟ ہم کو صرف پابندی ہی کی ضرورت نہیں تعلیم کی بھی ضرورت ہے۔ انگریزی تعلیم اور قدامت پسندی کا مجموعہ ہمیں کہیں بھی اس صورت میں نہیں ملتا جس کا شاستروں میں تذکرہ ہے۔ مگر پھر بھی وہ برے نہیں ہوتے۔ اگر تمہاری لڑکی ہوتی تو تم ضرور مجھ سے متفق ہو جاتے"۔
گورا ۔ آپ درست فرماتے ہیں۔ غالباً بی نئے انکا

نہ کریگا۔"

مہتم "ذرا سنا یہ کیا کہتے ہیں۔ یہاں کس کو شبہ ہے کہ وہ انکار کریگا۔ بھائی ڈر تو تمہارے ہی بگڑ جانے کا تھا تم اپنے منہ سے خود درخواست کرو تو مجھکو اطمینان ہو جائیگا۔ اگر تم نہیں چاہتے تو جانے بھی دو۔"

گورا۔ اچھا میں خود ہی کہونگا۔"

اب مہتم کو یقین ہو گیا کہ اب کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی بلکہ شادی کی تیاری کرنا چاہئیے۔

موقع ملتے ہی پہلے گورا نے بی تنئے سے ہی کہا "بھائی صاحب کئی دنوں سے مجھ سے اصرار کر رہے ہیں کہ میں تم سے ششی مکھی کی شادی کے متعلق کہوں اب تمہاری کیا رائے ہے"

"پہلے یہ بتائیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں"

"میں تو یہ کہتا ہوں کہ یہ کوئی بری بات نہیں"

"لیکن آپ کا خیال تو کچھ اور تھا۔ کیا ہم دونوں نے یہ عہد نہیں کیا ہے کہ ہم شادی نہ کریں گے۔ اور میں سمجھتا تھا کہ یہ بات مستقل ہو چکی ہے"

"خیر اب یہ طے شدہ امر سمجھئے کہ میں مجرد رہوں اور آپ شادی کریں۔"

"آخر یہ کیوں؟ جب ہم آپ ایک ہی راستہ کے چلنے والے ہیں تو دونوں کے لئے دو مختلف طریقے کیوں ہوں؟

"مجھکو خوف ہے کہ دو مختلف نتائج پیدا ہونگے اس لئے میں نے تجویز کی ہے۔ خدا نے چند لوگوں کو اہم فرائض کے ساتھ دنیا میں بھیجا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کے بار ہلکے ہیں ——— اگر تم دونوں کو ایک ہی جوئے میں جوتو گے تو ہلکے بار والے پر اور بھی وزن رکھنا پڑیگا تاکہ دونوں ساتھ ساتھ چل سکیں ہم تم دونوں اسی وقت قدم اٹھا سکتے ہیں اور ساتھ چل سکتے ہیں جبکہ تمہاری شادی کر کے تم پر بھی برابر کا وزن رکھدیا جائے"

بی تنئے نے مسکراکر جواب دیا "اچھا تو جتنا وزن چاہئے مجھ پر لاد دو"

"لیکن آپ کو اس خاص وزن کے اٹھانے میں کوئی عذر تو نہیں ہے"

"جب وزن ہی رکھنا ہے تو کچھ بھی ہو ——— اینٹ پتھر۔ پھر اس کا کیا خیال۔

گورا نے اس شادی کے متعلق کیوں اتنی خواہش ظاہر کی تھی وہ بی تنئے سمجھ گیا۔ گورا کو یہ شبہ ہو گیا تھا کہ کہیں بی تنئے پریش بابو کی کسی لڑکی سے شادی نہ کرے اور وہ اپنے دوست کو اس الجھن سے بچانا چاہتا تھا۔

رات کے جاگے ہوئے تھے اس خمار کو مٹانے کے لئے کھانا کھانے کے بعد دونوں سو رہے۔ شام تک ان میں کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ شام کو دونوں چھت پر جا بیٹھے۔

بی نسئے نے آسمان کو دیکھ کر کہا۔ گورا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری حب الوطنی میں ایک بہت بڑی کمی ہے۔ ہم ہندوستان کی صرف آدھی ہی تصویر دیکھتے ہیں"

گورا" اس کا کیا مطلب؟ آپ کیا کہتے ہیں؟"

بی نسئے" ہم ہندوستان کو محض مردوں ہی کا تصور کرتے ہیں۔ عورتوں کا کچھ خیال نہیں کرتے"۔

گورا" کیا انگریزوں کی طرح آپ کا بھی خیال ہے کہ عورتیں ہر جگہ موجود ہوں ——— گھر۔ باہر۔ سمندر خشکی۔ زمین پر۔ آسمان میں۔ دعوتوں میں۔ تماشا گاہوں میں۔ غرضیکہ کوئی جگہ ان سے خالی نہ ہو ——— جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مردوں پر عورتیں حاوی ہو جائینگی پھر بھی تمہارا مطمح نظر یک رخہ رہ جائیگا"

بی نسئے" نہیں آپ میری اس بات کو مذاق میں نہیں اڑا سکتے۔ آپ یہ سوال ہی کیوں کیا کرتے ہیں کہ میں ہر چیز صرف انگریزوں ہی کے نکتۂ نظر سے دیکھتا ہوں اور کسی دوسرے نکتۂ نگاہ سے نہیں؟ میں یہ یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہم لوگ عورتوں کے جائز حقوق پر بھی خیال تک نہیں کرتے ——— بلکہ آپ ہمیشہ عورتوں کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ آپ کا غور و فکر غیر مکمل ہے"

گورا۔ جب میں اپنی والدہ کو دیکھتا ہوں۔ تو اسی سے اپنے ملک کی عورتوں کا اندازہ لگا لیتا ہوں اور سمجھ لیتا ہوں کہ ان کے بھی وہی فرائض اور حقوق ہیں جو میری والدہ کے ہیں"

بی نسئے" آپ ایسی بات کرتے ہیں جس سے آپ دھوکے میں پڑ رہے ہیں محض اپنے گھر میں عورتوں کو امور خانہ داری میں مصروف دیکھ کر یہ سمجھ لینا کہ ہم نے ان کے حقوق اور فرائض کا پورا اندازہ کر لیا ہے سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اگر میں اپنے یہاں کی عورتوں کا موازنہ انگریزی خواتین سے کروں تو یقیناً آپ خفا ہو جائیں گے میں یہ چاہتا بھی نہیں ہوں۔ نہ میں یہی ٹھیک بتا سکتا ہوں کہ ہماری عورتیں کس حد تک باہر نکل سکتی ہیں کہ جس سے ہمارے رسم و رواج سے بھی تصادم نہ ہو سکے۔ لیکن میرا یہ خیال ہے کہ جبتک ہمارے ملک میں یہ پردہ قایم رہیگا اس وقت تک ہم اپنے ملک کی حقیقت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اس کا مفہوم نصف رہیگا اور نہ ہماری کامل توجہ اس کی طرف منعطف ہو سکتی ہے"

گورا۔ جس طرح وقت کے دو رخ ہیں رات اور دن بعینہ ویسے ہی نبی نوع انسان کے بھی دو رخ ہیں مرد اور عورت' فطرتاً عورت ذات کی طرح منظر عام سے علیحدہ رہتی ہے اس کے سب کام پردہ کی آڑ میں ہوا کرتے ہیں جس قوم یا جماعت نے غیر فطرتی طریقہ اختیار کر لیا ہو وہاں

رات نے دن کا حق غصب کر لیا ہے۔ تمام کام مصنوعی روشنی سے چلایا جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ رات کا جو فطری مقصد اور کام ہے وہ فوت ہو جاتا ہے اور انسان اپنی زندگی عالم مدہوشی میں گذارنے لگتا ہے اسی طرح اگر ہم بھی اپنے یہاں طبقۂ اناث کو پردہ کی قید توڑ کر باہر نکلنے کی اجازت دیدیں تو ان کے جبلی خاموش فرائض میں بڑا خلل پیدا ہو جائیگا۔ قوم کا امن و اطمینان اور مسرت رخصت ہو جائیگی اور ان کی جگہ جنون اور دیوانگی پھیل جائیگی۔ بادی النظر میں تو اس دیوانگی کو قوت سمجھا جائیگا لیکن یہ ایسی قوت ہے جو زوال کی طرف کھینچتی ہے۔ 'مرد' اور 'عورت' سوسائٹی کے دو رخ ہیں 'مرد' قوت ہے جسے 'قوت مرئی' کہتے ہیں اور عورت 'قوت غیر مرئی' ہے اگر آپ "قوت غیر مرئی" کو سطح پر لانے کی کوشش کریں گے تو سوسائٹی اپنے پورے سرمایہ کے بل پر قایم نہ رہیگی اور بہت جلد دیوالیہ ہو جائیگی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر مرد دعوت کھائیں اور عورتیں ذخیرہ کی حفاظت کریں تو البتہ وہ دعوت کامیاب ہو سکتی ہے۔ باوجودیکہ عورتیں پردہ کی اوٹ ہی میں کیوں نہ رہیں۔ یہ تو صرف جنون ہی کا تقاضا ہے کہ ایک ہی طریقہ اور ایک ہی جگہ ساری قوت کو صرف کر دیا جائے۔"

بی نئے "آپ نے جو کچھ کہا ہے اس کے متعلق میں کسی قسم کی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس سے آپ بھی انکار نہیں کر سکتے سوال تو یہ ہے......"

گورا نے بات کاٹ کر کہا۔ "دیکھئے اگر ہم نے اس سے زیادہ مباحثہ کیا۔ تو بات زیادہ بڑھ جائیگی۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ آپ کو جس طرح حقوق نسواں کا خیال ہوا ہے۔ ویسا مجھکو نہیں۔ آپ مجھ میں بھی اتنا ہی یقین نہیں پیدا کرا سکتے۔ فی الحال ہم کو اس پر فیصلہ کر لینا چاہئے۔ کہ ہم دونوں کو اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔"

گورا نے اس وقت تو اس مسئلہ کو یونہی ٹال دیا۔ لیکن جو بیج زمین پر ڈال دیا جاتا ہے اور یونہی پڑا رہتا ہے وقت آتے ہی اس میں کونپل پھوٹ آتی ہے۔ ابتک گورا طبقۂ نسواں کو نظر انداز کئے ہوئے تھا۔ اور اس کو یہ خیال بھی نہ ہوتا تھا کہ اس کے مطمح نظر میں کسی چیز کی کمی بھی ہے یا کچھ نقص ہے۔ آج بی نئے کے ارتقار محسوسات سے اسے بھی اس خیال میں اصلیت اور اہمیت معلوم ہونے لگی کہ عورتوں کا وجود اور ان کی طاقت بھی سوسائٹی میں کوئی چیز ہے۔ چونکہ وہ اس کا فیصلہ کرنے سے عاجز تھا کہ سوسائٹی میں ان کا کونسا مقام ہے اور کس خاص کام یا وجوہ کی بنا پر وہ پیدا کی گئی ہیں۔ اس لئے بی نئے سے مباحثہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ چونکہ وہ اس مسئلہ پر کماحقہ

عبور ہی حاصل کر سکتا تھا اور نہ فضول سمجھ کر نظر انداز کر سکتا تھا۔ اس لئے اُس نے اس مسئلہ پر گفتگو ہی نہ کرنا مناسب جانا۔

رات کو جب بی ننئے جانے لگا تو انندا مائی نے اُسے بلا کر دریافت کیا "کیا ششی کمھی سے تمہاری شادی طے ہو چکی ہے یا نہیں ؟"

بی ننئے نے شرمندہ ہو کر سر نیچا کر لیا اور کہا "جی ہاں اماں جان گورا نے بیچ میں پڑ کر طے کیا ہے"

انندا مائی "ششی کمھی لڑکی تو بہت اچھی ہے۔ بی ننئے دیکھو لڑکپن نہ کر بیٹھنا۔ میں تو تم کو خوب اچھی طرح جانتی ہوں۔ تم نے بڑی جلدی کی شاید اپنی کشمکش و پیچ سے نجات پانے کے لئے یہ کیا ہے۔ اب بھی بہت وقت ہے اس پر غور کر لو۔ ہر نشیب و فراز کو سمجھ لو اور اپنے محسوسات کا اندازہ کر لو"

یہ کہکر انندا مائی نے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اور بی ننئے بغیر کچھ جواب دیئے ہوئے وہاں سے خاموش چلا گیا۔

غزل

میکدے میں شراب باقی ہے
آسماں پر سحاب باقی ہے

پے بہ پے جام مے چلے ساقی!
جوشِ رنگ شباب باقی ہے

اب تمنا تو دل میں کوئی نہیں
ہاں! مگر اضطراب باقی ہے

خاک مرجھا کے ہو گیا ہے پھول
موجِ بوئے گلاب باقی ہے

دہر کی شوخیاں ہوئیں معدوم
جلوۂ ماہتاب باقی ہے

تُو نہیں، یاد سے مگر تیری
دل میں کچھ آب و تاب باقی ہے

ساقیا! ختم ہو گئی ہے کیا؟
آہ! خانہ خراب باقی ہے!

میکدے میں بھی اسے اثرؔ افسوس
کاوشِ احتساب باقی ہے

اثرؔ صہبائی

بہارستان

جذبہ نسوانیت۔ایک سنسان ساعت میں جب چاند غور سے کائنات کے مطالعہ میں مصروف تھا پانی کے پیٹ میں ہوا کی گدگدیوں سے ہنسی کے مارے بل پڑ رہے تھے اور ان قہقہوں پر جو لہروں کی صورت میں فنا ہو رہے تھے۔ مسکرانے والا کنارِ دریا کا صرف ایک درخت تھا۔

رات بھیگ رہی تھی اور چاند کا روشن چہرہ شباب کی منزلِ مقصود تک پہنچ چکا تھا۔ مگر ہوا کی شوخیاں لحہ بہ لحہ ترقی کر رہی تھیں۔ پانی کی کمر اس کے ہچکولوں کے سبب لچک رہی تھی۔ باغ مہک رہا تھا۔ تارے چمک رہے تھے کہ آبشار نے وجد میں آکر اپنا نغمہ شروع کیا۔ موسیقی کی مجسم تصویر چاروں طرف پھیل گئی۔ اور مخلوق نے اپنی خاموش نگاہیں اس پر جبیں پر ڈالیں۔ اس تماشا کے دیکھنے والی صرف صنوبر کی سبز پتیاں تھیں۔

وادیِ سیراب کے قصر سے ایک دوسرا چاند نکلا۔ یہ مملکتِ حسن کی خاموش ملکہ تھی۔ اور کائنات فلکی کی طرح ایک خیال میں محو تھی۔ اس کی منتظر آنکھیں محبت کے شاداب پودے کو نشو و نما کر رہی تھیں۔ اور ایک سرد آہ جس کے ذرات فضائے خلوص میں منتشر ہو رہے تھے کبھی کبھی نظر آجاتی تھی۔ اس کی سرگیں آنکھوں کے ڈبڈباتے ہوئے آنسو ایک دل خراش کن وعدے پر معصومیت کی نظر چڑھا رہے تھے۔ وہ دنیا کی ہر حرکت اور انسانی دنیا کے ہر فعل سے بے خبر تھی۔ اس کے سامنے صرف ایک چیز تھی اور وہ یہ تھی جس کو قانونِ حیات شوہر بنا رہا تھا۔ (عصمت)

ہماری شاعری:۔ ہماری شاعری محض قافیہ پیمائی ہے۔ اور اس قافیہ پیمائی کے رواج کا سہرا غزل کے سر ہے جس صنفِ سخن میں سوائے ردیف اور قافیہ کی یگانگت کے معنوی تسلسل کو دخل نہ ہو۔ اس صنف میں سوائے اسکے اور کیا ہوتا کہ قافیہ کی تلاش ایک بڑی چیز ہوتی۔ جہاں قافیہ ہاتھ آیا اس کے لحاظ سے کوئی مضمون شاعری کے مقررہ مواد میں سے ڈھونڈھنا شروع کر دیا۔ اسے تو بحث ہی نہیں۔ کہ اور شعروں سے کوئی معنوی مناسبت ہو۔ لہٰذا غزل کا ہر شعر محض ایک قافیہ کے مرکزی نقطہ پر ٹکاؤ پاکر شاعر کے بطن میں ڈھلنے لگا۔ جوں جوں غزل کا رواج ہونے لگا۔ قافیہ شاعری کی جان بنتا گیا۔ اور اس کا استبداد اس نوبت کو پہنچا۔ کہ اس نے خیال کے بہاؤ کو ایسی اصناف سخن میں بھی جہاں تسلسل لازمی تھا پاش پاش کر دیا۔ ہمارے شعرا کے دماغ میں قافیہ کا سکہ ایسا بیٹھا کہ اگر قافیہ تنگ ہو جاتے تو گویا شاعری کا گلا گھونٹ گیا۔ شاعری کی یہ کیفیت

ہوگئی کہ اگر قافیہ نے ساتھ دیا تو خیر ورنہ قافیہ جس طرح بولنے لگا۔ اسی طرح ہمارے شعرا بھی گانے لگے۔ اور یہ ساری کرامات غزل کی ملکت پڑجانے سے ہوتی۔ سب سے پہلی اصلاح اب یہ ہونی چاہئے۔ کہ شاعری کو قافیہ کے استبداد سے نجات دلوائی جائے۔ اس بات کو واضح کر دیا جائے کہ شاعری قافیہ کے اشارہ پر نہیں چلیگی۔ بلکہ شاعر کے ارادہ اور خیال کی ضرورتوں کے آگے قافیہ کو سر خم کرنا پڑیگا۔ یہ مانا کہ قافیہ یوں تو شاعری اور خصوصاً اردو شاعری کے لئے ایک فطری شے ہے۔ ترنم کے پیدا کرنے کے لئے خیال کو ڈھالنے کے لئے قافیہ بہت کارآمد ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ قافیہ شاعری کی سرزمین میں کوس لمن الملک بجائے اور خیال کا گلا گھونٹ ڈالے۔ قافیہ کی اس بدعنوانی اور بدکرداری جیرہ دستی استبداد کو غزل نے اپنی گود میں پالا اور اسقدر پالن پوس کر بلوان کر دیا۔ کہ قافیہ نے تخیل اور خیال کو اپنے شکنجہ میں پھانس لیا۔ اپنا مطیع و بے نقاد کرلیا۔ اس سے خیال کی آزادی اور نشو ونما کو جو صدمہ پہنچا اور اردو شاعری جس حد تک بیجان ہوئی اس کا ثبوت ہمارے شعرا کی غزلوں سے بھرے ہوئے محض لفظی طلسمات والے دیوان ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ خیال کے گلے سے قافیہ کے پھندے کو نکالا جائے۔ اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ غزل کی گردن بے تکلف اور بے تکان مار ہی جائے۔ (اردو)

سی آر داس کے جذبات

آج اتفاقاً تیرا دیدار حاصل ہوگیا۔ تیری ذات عجیب و غریب ہے۔ تجھ کو ہمیشہ شعبدہ بازیوں میں مزا آتا ہے۔

ٹھہر ٹھہر۔ تھوڑی دیر ٹھہر۔ مجھ پر عنایت کر۔ میرے واسطے رک جا کہ میں اپنے ترانوں کی لڑیوں میں تجھ کو گوندھ لوں۔

ماہتاب کا زرد زرد نور ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ اور بحر خاموش۔ عالم خواب میں سست تھر تھر کانپ رہا ہے۔

اگر یہ سچ ہے کہ تو واقعی یہاں جلوہ فرما ہے تو اے تبسم ریز پُر اسرار ہستی آ اور میرے دل میں قیام کر۔ ورنہ میں کس وقت تیرا ذکر اپنے ترانوں میں نظم کر سکونگا۔

ابھی تھوڑی دیر اور ٹھہر رک جا۔

سمندر کی ترانہ سنجیوں اور اپنے دل کے بے صدا نغموں کے ساتھ تجھ کو بھی نظم کا جامہ پہناؤنگا۔ اور اس جامہ زیبی کی شان تمام محاسن شاعری سے بدرجہا افضل ہوگی۔ اس طرح جب میں تیرا ذکر نظم کر لونگا تو تو میرے دل کے لافانی گوشۂ تنہائی میں پابستہ ہو جائیگا۔

ہاں تو کیا تو جامۂ خواب سے مزین سرمست آہنگ جاودانی اور لایزال و غیر متحرک ہو کر اپنی پوری آن بان کے ساتھ اس گوشے میں قیام نہ کریگا؟

(زمانہ)

ایڈیٹر

(سوشی پرنٹنگ ورکس لاہور میں باہتمام لالہ ... پرنٹر چھپا اور دار الاشاعت ادب لطیف کے لئے محمد اسمٰعیل ... پبلشر ... چیمبرلین روڈ لاہور سے شائع ہوا)

قیمت سالانہ چھ روپے ۶ روپے ۱۶۴۱۴ قیمت ششماہی ۳ روپے فی پرچہ ۱۰ ر

ہزار داستان

آنریری ایڈیٹر حکیم احمد شجاع بی۔اے (علیگ)

ایڈیٹرز:-

ابوالاثر حفیظ جالندھری محمد اسمٰعیل نعیم

جلد ۴ اشاعت ماہ مئی ۱۹۲۴ء نمبر ۵

فہرست مضامین

زمیندار پریس لاہور میں باہتمام لالہ ... پرنٹر چھپا اور دارالاشاعت ادب لطیف کے لئے محمد اسمٰعیل نعیم ... سے شائع ہوا

دریا بہ حباب اندر

(صفحۂ ادارت)

مارچ کے ہزار داستان میں توسیع اشاعت کے لئے جو توجہ دلائی گئی تھی۔ صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی جو قدردانانِ ادب اپنے اپنے حلقۂ اثر میں سعی بلیغ فرما رہے ہیں کارپردازانِ ہزار داستان کا دلی شکریہ قبول فرمائیں۔ مگر ع

شبلیا سحر است ایں اعجاز می باید کرد

دو ماہ سے جناب سید طالب الہ آبادی کا ایک فسانۂ رنگیں، طلسمی دھنک کے نام سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ سید صاحب نے "علم الالوان" کی تشریح کے لئے جو دلآویز اور تجلی ریز پیرایہ اختیار کیا ہے قابلِ داد ہے۔

اس مرتبہ اُستادی جناب مولینا غلام قادر صاحب گرامی مدظلہٗ کی وہ معرکۃ الآرا غزل عزت افزائے ہزار داستان ہوئی ہے جو بیس سال ہوئے حیدر آباد کے ایک عظیم الشان شاہی مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔ شمس العلماء شبلی مرحوم نے بھی اسی زمین میں غزل پڑھی تھی مگر حضرت اُستاد کی غزل ہر لحاظ سے تمام شعراء پارسی کے کلام پر چھا گئی تھی۔ جن لوگوں نے شبلی مرحوم کی غزل ملاحظہ کی ہے۔ حضرت اُستاد کے کمالِ سخن اور ندرتِ تخیل کا اندازہ کر سکینگے۔

ہر انگریزی مہینے کی پندرہ تاریخ ہزار داستان کی اشاعت کے لئے معین تھی۔ مگر پے در پے تبدیلِ ادارت کے سبب سے تاخیر ہوتی رہی۔ مارچ میں ہم نے اس نقص کو دور کرنے کے لئے کوشش کی اور کامیاب بھی ہو گئے۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ بلائے طاعون نے ہمارے ارادوں پر پانی پھیر دیا۔ اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ کہ ہر ماہ انگریزی کی ۳۰۔ تاریخ کو رسالہ کی اشاعت کا دن قرار دیا جائے۔ اب اسی پر عمل درآمد ہوگا۔ لہٰذا خریدار اصحاب کو چاہئے کہ اگر تیسری تاریخ تک رسالہ نہ ملے تو دفتر کو دس دن کے اندر اندر اطلاع بخشیں۔ اور یہ بھی خیال رکھیں کہ ہر ارشاد کے لئے خریداری نمبر کا حوالہ دینا ازبس ضروری ہے۔ اس کے بغیر تعمیل نا ممکن ہے

جو لوگ رسائل کا نمونہ مفت منگوانے کے عادی ہیں ہمیں معاف فرمائیں۔ ہزار داستان کے بڑھے ہوئے اخراجات اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ۱۰ / دس آنے کے ٹکٹ ارسال کریں یا وی پی کی اجازت دیں۔

ابو الاثر حفیظ جالندھری

ہوشیار دیوانہ

(۱)

"مَیں نے گناہ کیا" یہ صدائے خاموش میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ یہ ایک احساس ہے۔ جو مدّت سے میری زندگی پر محیط ہے۔ اتنی مدّت سے جس کو میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔

دُنیا سکوت کی چادر اوڑھے بیخودی کی نیند سوتی ہے۔ مَیں بھی ایک فرسودہ رسم ادا کرنے کے لئے کسی بھڑبھونجے کے چھپر میں بھٹی کے قریب یا کسی نانبائی کے تنور پاس ایک پُرانی رضائی میں آنکھیں بند کئے سُکڑا ہوا پڑا ہوں۔ بالکل خاموشی ہے۔ لیکن نہیں۔ ایک آواز میرے کانوں میں ناچتی ہوئی رُوح میں اُترتی چلی جاتی ہے۔ "مَیں نے گناہ کیا" مَیں ایک جھرجھری لیکر اُٹھ بیٹھتا ہوں۔

دِن کے وقت انسانی سمندر میں ایک طوفانِ عظیم بپا ہوتا ہے۔ کشمکش حیات تازہ ترغیبوں کے جال بچھاتی ہے ہوشیار دیوانے اپنی بیخودی مشاغل میں لطفِ زیست کو بُھول جاتے ہیں۔ اس غُل غپاڑے میں جب مَیں کسی بندر نچانے والے یا کسی مقرر دوائی فروش کے تماشائیوں میں کھڑا قہقہوں کی بھیڑ بھاڑ میں اپنے حواس گم کر دیتا ہوں۔ تو بھی صدائے ماؤس مجھے صاف صاف سُنائی دیتی ہے۔ "مَیں نے گناہ کیا" اور مَیں بھاگ جاتا ہوں۔

شام کے وقت بہتے ہوئے راوی کی ترنم ریز لہروں کے سامنے اجلی ریت پر بیٹھ کر مَیں اکثر اپنی زندگی کی پیچ در پیچ تفصیلوں سے اُلجھ جاتا ہوں۔ اپنی پیدا کی ہوئی دُنیائے خیال میں گم ہو جاتا ہوں۔ ماضی کی تیرہ و تار بھول بھلیاں میرے سامنے روشن ہو جاتی ہیں۔ مَیں اپنی یاد کے خونی سیلاب میں بہتا پھرتا ہوں۔ پھر جب اس سے نکلتا ہوں تو وہی صدائے بے اختیار میرے مُنہ سے نکل جاتی ہے۔ "مَیں نے گناہ کیا" لیکن کیا مَیں اکیلا گنہگار رہوں۔ یہ ایک استفسار ہے جو مجھے دوسری مرتبہ ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں لے جاتا ہے۔ کیا مجھ اکیلے نے بدی کی کیا دوسرے مجھ سے کم گناہگار ہیں۔ کیا مَیں گناہ کے لئے مجبور نہیں کیا گیا۔ "بے آبروئی۔ شرم۔ بےعزتی انتقام" یہ الفاظ میرے کانوں میں گونج اُٹھتے ہیں۔ ہاں "مَیں نے گناہ کیا" لیکن اب یہ اعتراف احساسِ ندامت سے آلودہ نہیں ہوتا۔ نہ۔ بلکہ اب میرے خشک لب شرارت آمیز تبسّم سے لرزاں اور میری آنکھیں کامیاب شیطانی جذبے سے روشن ہو جاتی ہیں۔ میرا چہرہ فاتحانہ خوشی سے چمک اُٹھتا ہے۔

اور میری رُوح میں ایک قسم کی مجہول الکیفیت تسکین پیدا ہو جاتی ہے۔ مَیں ایک لمبا سانس لیتا ہوں اور چت لیٹ جاتا ہوں لیکن یہ سکون دیرپا نہیں ہوتا اور پھر وہی بے معنی صدا میرے دماغ میں اودھم مچانے لگتی ہے " مَیں نے گناہ کیا " مَیں اُٹھتا ہوں اور جلد جلد شہر کی طرف واپس ہو جاتا ہوں۔

(۲)

اس وقت میری عمر بتیس سال کی ہے۔ اگرچہ اپنے جھریوں سے بھرے ہوئے چہرے اور اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں، نیم سفید اور پریشان بالوں، فرسودہ اور ناتوان جسم کے سبب سے چالیس برس کا ایک بدمعاش معلوم ہوتا ہوں میرے چہرے پر ایک خونخوارانہ خرانٹ پن برستا ہے۔ میری کوئی عزت نہیں۔ دن بھر بازاروں پارکوں اور گلیوں میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ قہوہ خانوں تفرج گاہوں میں ٹہلتا ہوں۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد اُکتا جاتا ہوں۔ اور شہر سے دور کھیتوں اور باغوں سے ہوتا ہوا دریا پر جا نکلتا ہوں۔ حتیٰ کہ اندھیرا ہو جاتا ہے۔ پھر نہ جانے کیوں بے سبب اپنی زندگی کو درندوں اور سردی کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کے لئے ایک کشش بے اختیاری کے چکر میں شہر کی طرف واپس آتا ہوں مَیں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ اور شاید اسی لئے صبح و شام کسی نانبائی کی دھندلی دُکان میں سیاہ چٹائی پر بیٹھا نظر آتا ہوں۔ میری ضروریات قلیل ہیں۔ مَیں نے مدت سے نیا لباس

نہیں بدلا۔ مجھے اس کی پروا بھی نہیں۔

کیا شروع سے میری یہی حالت ہے۔ نہیں۔ مَیں نے بھی عیش کے دن گزارے ہیں۔ شہر کے اکثر لوگ مجھے جانتے ہیں۔ مَیں نے کئی ایک کو سرِراہ ٹھہر جاتے اور اپنی طرف تاسف سے نظر ڈالتے دیکھا ہے۔ ہاں وہ مجھ پر افسوس کرتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں۔ مَیں لوگوں کے اس خیال پر مُسکرا دیتا ہوں۔ کیونکہ اس مصنوعی دیوانگی نے میرے افعال پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ اپنا راز صرف مَیں جانتا یا وہ ہستی جسے عالم الغیب کہتے ہیں شاید مَیں اسی وجہ سے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے موت کے خیال سے ہول آتا ہے۔ کیونکہ اگر خُدا ہے اور عالم الغیب بھی ہے۔ تو اس دُنیا میں جہاں معاملہ صرف اسی کی ذات سے تعلق رکھیگا۔ میرے لئے ڈرنے کے کئی وجوہ ہیں۔

لوگ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے اور جبتک وہ ایسا سمجھیں مجھے ان سے کوئی خوف نہیں۔

میرے متعلق عجیب و غریب کہانیاں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے کثرتِ مطالعہ سے دماغ چل گیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کسی مجذوب کی صحبت کا اثر ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ اپنی حسین بیوی کے گم ہو جانے سے حواس باختہ ہو گیا ہے۔ کوئی کہتا ہے بھائی کی موت نے دماغ ماؤف کر دیا ہے۔ لیکن اصل حقیقت سے کوئی واقف نہیں مَیں دُنیا کی بیوقوفی

پر ہنس دیتا ہوں اور اپنی دیوانگی پر مضبوطی سے قائم ہوں۔

کیا بیوی کا گم ہو جانا یا بھائی کی موت کسی کو دیوانہ بنا دیتی ہے؟ مجھے معلوم نہیں شاید ایسا ہو لیکن مجھے یقین ہے کہ بھائیوں کی موت پر کسی کو پکاہ سے زیادہ رنج نہیں ہوتا۔" بیوی کی گمشدگی اور دیوانگی! ہونہہ کتنا مضحکہ خیز خیال ہے۔

میں بالکل محتاج نہیں ہوں۔ میرے پاس ایک رقم موجود ہے جسے میں آہستہ آہستہ خرچ کرتا ہوں۔ میرا ایک مکان بھی ہے۔ اگرچہ میں مدت سے وہاں نہیں گیا۔ کیونکہ وہاں ایک بڈھا آدمی جو میرا باپ ہے۔ مجھے محبت سے آغوش میں لینے اور آنسو بہانے کے لئے آمادہ نظر آیا کرتا ہے میں اسکی کمزور اور حسرت زا نگاہوں سے بچتا ہوں۔ گریز کرتا ہوں۔

مدت کا ذکر ہے کہ ایک دن راستے میں میری اس سے مُٹ بھیڑ ہوگئی۔ اس نے مجھے زور سے پکڑ لیا۔ وہ اسوقت بھی مجھ سے طاقتور ہے۔ وہ مجھے گھر کی طرف لیگیا۔ جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ جہاں میری شادی ہوئی تھی اور جہاں سے میں نکل بھاگا تھا۔ اس نے میرا لباس بدلوایا اور میرے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ رو رہا اس نے کہا " تمہیں کیا ہوگیا میرے بیٹے میں اب کس کے سہارے زندہ رہوں"

مجھے وہ وقت یاد ہے۔ میں کانپ گیا۔ میرے ضبط کی تمام قوتیں آنسوؤں میں تبدیل ہوتی معلوم ہوئیں میرے لئے اپنی مصنوعی دیوانگی کو قائم رکھنا دشوار ہوگیا۔ لیکن میں نے اپنی کیفیات پر قابو پالیا۔ اور زور سے ہنسا۔ پھر ایک کرسی کو اٹھایا۔ اور وحشیانہ انداز سے دیوار گیر ساتھ آئینہ پر دے مارا۔ آئینہ چکنا چور ہوگیا۔ میرے باپ نے مجھے پکڑ لیا۔ کیونکہ میں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ مجھے میرے کمرے میں لے گئے اور باہر سے تالا لگا دیا۔ اس کمرے میں جہاں میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ بسر کیا تھا۔

(۴)

مدت کے بعد میں پھر اس کمرے میں تھا۔ میری خوشیوں کا مرکز۔ میری تمناؤں کا گہوارہ اور پھر میری عزت میری آبرو کا مزار یہی کمرہ تھا۔ میں نے اسے دیکھا دروازے اور روشندان میں سے روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی میں نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد کوئی کشمکش نہ کی۔ میں اپنی دیوانگی کے اظہار کو بھول گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا دل گلے میں اٹک گیا ہے۔ دیواروں پر میرے ہاتھوں کی لگائی ہوئی تصویریں میری طرف گھور رہی تھیں۔ میری اپنی شبیہ جو کبھی ہنستی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت نفرت آمیز غصہ سے میری طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے تھی میں صوفے پر بیٹھ گیا اور سر جھکا لیا۔ باہر میرا باپ بلند آواز سے رو رہا تھا۔ " ہائے میرا بیٹا۔ میرے گھر کا چراغ۔ یا اللہ مجھ سے یہ دیوانگی دیکھی نہیں جاتی" مجھ پر ندامت کا ایک بادل چھا گیا۔ میرے

سینے سے آہ نکلی "میں نے گناہ کیا" میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ گرم گرم آنسو۔ میں نے آنکھوں کو پونچھا۔ اور اپنی حالت پر تبصرہ کرنے لگا۔ "میں نے ایسا کیوں کیا؟" اس سوال نے بہت جلد میری مغلوبیت کو تندی میں تبدیل کر دیا۔ گزشتہ واقعات کی تلخ یاد نے میرے خون میں حرکت شروع کر دی۔ ایک دیو کی طرح میں اُٹھا اور اپنی تصویر دیوار سے اُکھاڑ لی۔ اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ "میری تصویر۔ یہ میں نے اس وقت بنوائی تھی جب میں شادی کے لئے لباس بدلکر تیار ہوا تھا۔ میرا چہرہ ایک شریف اور تعلیمیافتہ نوجوان کا چہرہ تھا۔ میرے خیالات مجھے اس محفل میں لے گئے۔ جہاں ایک عورت کی قسمت میری قسمت سے وابستہ کر دی گئی تھی۔ میں اس وقت کیسا خوش تھا۔ ایسی خوشی جیسی کسی نوجوان کو ہو سکتی ہے۔ میں اپنی دلہن کو اسی کمرے میں لے آیا تھا۔ بھولی بھالی ننھی مُنّی دُلہن کم از کم اس وقت میں اسے ایسا ہی سمجھا تھا۔ میرے پہلو میں تھی۔ میں اس پر ہزار جان سے شیدا تھا۔ ہماری شادی کو ایک سال گزر گیا۔ میری محبت انتہائی بلندی پر پرواز کر رہی تھی۔ مگر وُہ۔ وہ عورت جو میری نفرت کا موضوع ہے اور جس کے خیال سے میں غصّے میں اسوقت بھی تھرا اُٹھتا ہوں۔ بیوفا تھی۔

(۴)

میری آنکھوں سے شعلے برسنے لگے میرے کان تمتما اُٹھے۔ "دغاباز۔ مکار"

"میں نے ان سے انتقام لے لیا۔" میرے مُنہ سے فتحمندانہ یہ فقرہ نکلا۔ میرے ہاتھ کسی خیالی انسان کا گلا گھونٹ رہے تھے۔ یہ میرے اپنے حقیقی غدار بھائی کی خیالی نعش تھی۔ جسے میں نے سوتے میں مار ڈالا تھا۔ اسکی پتھرائی ہوئی آنکھیں اس وقت بھی مجھے بے بسی سے گھور رہی تھیں۔ مجھے وہ وقت بھی یاد آگیا جب میں اور میرا باپ اس کی اچانک موت پر آنسو بہا رہے تھے۔ میرا بناوٹی رونا فلک شگاف تھا۔ کسی کو مجھ پر شک نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے یکایک دل کی حرکت بند ہو جانے کو موت کا باعث ٹھیرایا تھا۔

کیا میں نے اپنی بیوی کے سامنے شبہ کا اظہار کیا تھا؟ میں ایسا بیوقوف نہیں۔ میرا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا۔ وہ اپنے راز سے بالکل مطمئن تھی۔ مجھے اس کے حال پر رحم بھی نہ آیا۔ اگرچہ وہ حاملہ تھی۔ ایک دن سرِ شام جب میرا باپ کہیں گیا ہوا تھا۔ میں اسے سیر کرانے کے لئے دریا کی طرف لے گیا۔ وہ بالکل بے پروا سنسان اور غیر آباد کناروں کی طرف بڑھتی گئی۔ سُورج ڈُوب رہا تھا۔ آسمان پر خون سوار تھا۔ دریا کا پانی بھی خون میں نہایا ہُوا معلوم ہوتا تھا۔ ہم گھاٹ سے ڈیڑھ میل دُور نکل آئے تھے۔ میری بیوی نے راز و نیاز کی باتوں کا جواب دینے میں کوئی ہچکچاہٹ ظاہر

نہیں کی۔ پھر یکایک وہ ٹھہر گئی۔ اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔ شاید اسے شک ہو گیا ہو۔ وہ آگے بڑھنے میں متامل معلوم ہوتی تھی۔ اس نے کہا اب واپس چلنا چاہیئے میں خاموش تھا۔ "چلو واپس چلو۔ اندھیرا ہو رہا ہے۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔

"تم چپ کیوں ہو۔ مجھے ہول آتا ہے۔"

یکایک میں نے اس کا بازو زور سے پکڑ لیا میرے مُنہ سے پہلی مرتبہ وہ بات نکلی جس نے اس کا رنگ فق کر دیا۔ وہ تھرائی اور میرے قدموں پر گر گئی۔

"معاف کر دو۔ معاف کر دو"

میری آنکھیں ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح سُرخ ہو گئیں میں نے چھرا نکالا۔

"ہائے تم مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو۔ نہیں نہیں تم ایسا نہ کرو گے۔ مجھے بخشدو۔ اس معصوم بچے کے لئے معاف کر دو۔ جو میرے پیٹ میں ہے۔"

"ہر گز نہیں" جوشِ غضب میں میری آواز تھرا رہی تھی۔ تم بھی اسی کے پہلو میں جاؤ گی۔ جس کو میرے ہاتھوں نے پیوند خاک کر دیا۔

میری بیوی کا حسن زردی اور تاریکی میں تبدیل ہو گیا

"آہ تم نے کیا تم نے؟"

ہاں میں نے اس کا گلا گھونٹ دیا وہ اسی قابل تھا۔

اور تم بھی اس قابل ہو۔

میری بیوی نے ایک آہ کی۔ اور میری گرفت سے آزاد ہو کر بھاگنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ میں نے چاروں طرف ایک نگاہ ڈالکر چھرا اس کے سینے میں بھونک دیا ایک دردناک چیز کی آواز آئی۔ اور بس۔ میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ پے در پے میرا تیز چھرا اس کے نازک گوشت کو کاٹتا اور ٹکڑے ٹکڑے کرتا رہا۔ میرے انتقام کا جوش فرو نہ ہوتا تھا۔ حتٰے کہ میں نے گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دریا میں بہا دئے۔

ہہ ہاہا۔ وحشیانہ خوشی۔ آس پاس کی خاموشیاں میرے ساتھ ہلکے ہلکے قہقہے لگا رہی تھیں۔

میں نے خون سے لتھڑی ہوئی تمام مٹی دریا میں ڈالدی میں نے اپنے کپڑے پھاڑ پھاڑ کر بہا دئے۔ اور دوسرے پہن لئے۔ جو ایک دن پیشتر وہیں چھپا دئے گئے تھے۔ اوہ۔ کس اطمینان کے ساتھ میں سیٹی بجاتا ہوا گھر واپس لوٹا۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں کسی نے مجھے نہ دیکھا۔ نوکر چھٹی پر اور باپ دو دن کے لئے باہر گیا ہوا تھا۔ بلاشبہ میرا منصوبہ بڑی صفائی سے پورا ہو چکا تھا۔

۵

میں فرطِ مسرت سے اسی کمرے میں ناچ رہا تھا۔

"فاتح کامیاب فاتح"

میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اب وہ نفرت انگیز ہستیاں کلی طور پر ناپید ہو چکی تھیں۔ میں نے دغا بازوں کو خوفناک سزا دی تھی۔ دریا برد۔ پیوندِ خاک۔ اب پھر یہ کمرہ میری تنہائی کا بہشت بن جائیگا۔"

یکایک میرے دماغ کا گدا جم رہ گیا۔ پہلی مرتبہ میری مسرت کا طلسم ٹوٹا۔ یہ ایک بھیانک چیخ کی صدا تھی ننھے بچے کی چیخ۔ میرا رواں رواں کانپ گیا۔ میری بیوی میرے سامنے تھی۔ ایک ننھا معصوم دونوں ہاتھوں میں اُٹھائے۔ لہو میں تر۔ میں بیہوش ہونے لگا۔ میرے منہ سے نکلا "میں نے گناہ کیا"۔

میں نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لئے " یہ سب فضول ہے۔ وہم۔ بالکل وہم۔ گنہگار رُوحیں مجھے کیا کہہ سکتی ہیں" میں کمرے سے نکل آیا۔ پھر مجھے اس میں جانے کی جرأت نہ ہوتی۔

میں نے باپ کو تار دیکر بلایا۔ اُس نے پولیس میں میری بیوی کے بھاگ جانے کی رپورٹ لکھوائی کوئی سراغ نہیں ملا۔ آج تک نہیں۔

مدت کی دیوانگی کے بعد میں پھر اسی کمرے میں لایا گیا تھا۔ پیچ در پیچ خیالات کے ہجوم نے مجھے گھیر لیا تھا۔ واہمے نے مرنے والوں کی صورتیں میرے سامنے لا رکھیں۔ جو ہنسی تبسم سے مجھے دھمکیاں دے رہے تھے۔ مجھے اس کمرے سے نفرت ہے۔ سخت نفرت۔

میں نے طیش میں اپنی تصویر ایک طرف دے ماری۔

"آہ" کا ایک نعرہ بلند ہوا۔ یہ میرے ضعیف باپ کی صدا تھی۔ جو دروازہ کھولکر مجھے سوتا سمجھ کر دیکھنے کے لئے کمرے کے اندر آرہا تھا۔ لیکن میں نے اسے دیکھنے کیلئے ٹھہر جانا ضروری نہیں سمجھا۔ میں نے پروا نہ کی۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ میں بھلا لگتا ہوا بھاگ نکلا۔

میں کبھی اس طرف نہیں جاتا۔ مجھے اپنے باپ کی صورت پر رحم آتا ہے۔ راستوں میں اسے دیکھتا ہوں اور آنکھ بچا کر نکل جاتا ہوں۔ اسکی جھکی ہوئی غمدیدہ آنکھیں میرے ضمیر کی مردہ قوتوں کو بیدار کر دیتی ہیں۔ اور میں پہروں اپنے گناہ کی یاد میں سر بگریباں رہتا ہوں۔ لیکن مجھے پروا نہیں کیونکہ میری دیوانگی کا راز مجھی تک محدود ہے۔ اور کم از کم اس دنیا میں تو میں اسے افشا نہ کرونگا۔

ابو الاثر حفیظ جالندھری

کنارِ دریا کے درخت تنہا! تو کتنا بے پرواہ ہے۔ تیرے سب ہم جلیس ایک ایک کرکے موجہائے رواں کے کندھوں پر سوار ہوکے چلے گئے لیکن تو اب بھی اپنی شادابی پر شاد اور ان تباہ کن لہروں کی شرارت سے بے پرواہ ہے جو تیرے قدم چومنے کے بہانے تیری جڑیں کھود رہی ہیں۔

ابو الاثر حفیظ

واجد علی شاہ اور اندر سبھا

جنوری گذشتہ کے رسالہ "اردو" میں ہمارا ایک مضمون بعنوان "ہندوستان کا ڈراما" شائع ہوا تھا۔ اس میں ہم نے لکھا ہے۔ کہ ایک فرانسیسی کی تحریک پر واجد علی شاہ نے امانت سے اندر سبھا لکھوائی۔ اپنے مصاحبوں کیساتھ بہ نفسِ نفیس اسے تمثیل کیا۔ اور خود راجہ اندر کا پارٹ کیا۔

محترم ایڈیٹر صاحب دلگداز نے رسالہ مذکور کے جنوری نمبر میں اس ادعا کے قبول فرمانے میں تامّل کا اظہار کیا ہے۔ اور وہ اس کی تائید میں اسناد و دلائل چاہتے ہیں۔ اسبارہ میں ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔

مضمون زیرِ بحث ہماری زیرِ کار کتاب "تاریخ عالم ڈراما" کا ایک باب ہے۔ اس کتاب میں ہم دنیا بھر کے ڈراما نگاروں اور مشہور ایکٹروں کے حالات مختلف ملکوں میں فن ڈراما کے ارتقا کی کیفیت اور سٹیج کے عروج و زوال کے اسباب بیان کرکے اصل حقیقت کو آئینہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کام کیسا کٹھن اور محنت طلب ہے کسی تشریح کا محتاج نہیں سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کے علاوہ ہمیں ان لوگوں کو ڈھونڈ نکالنا پڑا۔ جن کے صندوقِ سینہ میں بہت سی روایتیں بند تھیں

ہم کچھ مدّت سے اس کتاب کے جستہ جستہ ابواب مختلف رسائل میں شائع کر رہے ہیں۔ تاکہ بحث طلب مبہم اور مشکوک باتوں کا کتاب کی اشاعت سے پہلے تصفیہ ہوجائے۔ اور کتاب جب پریس سے نکلے تو جملہ اسقام سے پاک ہو۔ یہ نامکمل باب رسالہ اردو کے ادب نواز ایڈیٹر کی توجہ سے شائع ہوکر قبل از وقت ذرہ سے آفتاب بن گیا ہے۔

قابلِ احترام ایڈیٹر دلگداز ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے سب سے پہلے اس طرف توجہ فرمائی۔

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ آجتک ہندوستان کے دورِ جدید کے ڈرامے کی کوئی تاریخ ضبط تحریر میں نہیں آئی۔ اہل قلم نے اپنی تصانیف میں اس کا بھولے سے بھی ذکر کرنا گوارا نہیں کیا۔ اور مدت تک ہندوستان کے رسائل و جرائد کے ایڈیٹر ڈراما کے متعلق کوئی مضمون شائع کرنا وضعداری کے خلاف خیال فرماتے رہے۔ دلگداز ہی کو یہ تقدیم ہے۔ رسالہ فراخ حوصلگی اور آزاد روی کے لئے خاص شہرت رکھتا ہے۔ اس کی تمام جلدیں ایک اچھا خاصہ کتبخانہ ہیں۔ یہ رسالہ گوناگوں مضامین کے لحاظ سے ادبیات کی ایک چھوٹی سی دنیا ہے۔ شاید ہی کوئی مضمون ہوگا جس کا نمونہ

دلگداز کی جلدوں میں نہ ملے لیکن باوجود اس بوقلمونی اور عالمگیری کے ان میں ڈراما کے متعلق مضامین کالنادر فی المعدوم کا حکم رکھتے ہیں۔ دلگداز کے عالم شباب میں رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹر اکثر تھیٹر جاتے تھے۔ ولایت کے اخباران کی نظروں سے گذرتے تھے۔ جن میں ڈراما پر ریویو۔ ایکٹروں کے حالات اور ڈراما نگاروں کی جدت طرازیوں پر تبصرے ہوتے تھے۔ وہ دیکھتے تھے۔ کہ یورپ میں فن ڈراما کی کیا قدر و منزلت ہے۔ اور ایکٹروں اور ڈراما نگاروں پر کس طرح اعزازات کی بارش ہوتی ہے۔ مگر بایں ہمہ اس وقت کے رسائل تو در کنار کسی اخبار میں ہی ڈراما کا ذکر خیر مشکل سے ملیگا۔ ان حالات میں اگر ہم سے تقاضا کیا جائے۔ جو کچھ بساط بھر تحقیق اور تدقیق کے بعد ہم نے ہدیۂ ناظرین کیا ہے۔ اس کا کوئی ایسا تحریری ثبوت پیش کریں جس کا ہندوستان کی ہر عدالت جوڈیشل نوٹس لے سکے۔ تو ہمارے لیے فقدان قابلیت کا اقرار کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں یورپ کا ذکر نہیں وہاں تو ڈراما لٹریچر کی جان ہے۔ اور سوسائٹی کی روح رواں ہے۔ کلیسا کے منبر سے لے کر ضروریات کی میز تک اسی کا چرچا سننے میں آتا ہے۔ ہم ہندوستان کی کہتے ہیں۔ کہ یہاں ڈراما اور سٹیج کے متعلقات کے بارے میں، خانقاہوں کے سجادہ نشینوں۔ امام باڑوں کے ذاکروں، مساجد کے اماموں اور فرنگی محل کے مولویوں سے اسناد محض بیکار ہے۔ ان کے حالات انہیں لوگوں سے ملینگے جنہیں ایڈیٹر دلگداز لکھنؤ کی پیاری زبان میں ڈوم ڈھاری کے نام سے یاد فرماتے ہیں۔ اور جنہیں عرف عام میں ایکٹر کہتے ہیں۔ یہ روایت جس کی صحت اس وقت معرض بحث میں ہے۔ اسی بدقسمت گروہ کے ایک ایسے قابل توقیر رکن سے مروی ہے۔ جس نے اگر واجد علی شاہ کا زمانہ نہ بھی پایا ہو، پھر بھی ایسے وقت ضرور ہوش سنبھالا جبکہ اندر سبھا اور قیصر باغ کی یاد اکثر دلوں میں زندہ تھی۔ ہماری مراد مسٹر بالی والا خورشید جی آنجہانی سے ہے۔ مگر ہندوستان کی محفل ادب میں بیچارا ایکٹر کیا اور اسکی روایت کیا۔ ورنہ دنیا جانتی ہے کہ دیبات یورپ کی تاریخ میں اسے کیا وقار اور اعتبار حاصل ہے۔ ارباب دانش جانتے ہیں کہ ہند قدیم کے ناٹکوں کی نمائش پردوں اور سینری سے بے نیاز تھی۔ مثنوی غنیمت شاہد ہے کہ حضرت اورنگزیب کے زمانہ تک بھگت بازوں کا اٹالا پردوں کے بوجھ سے سبکدوش تھا۔ دور کیوں جایئے۔ آجکل بھی جو رہس ہوتے ہیں۔ پردوں کے التزام سے مستغنی ہیں۔ مولانا کو اس بات سے انکار نہیں کہ قیصر باغ میں رہس کے جلسے منعقد ہوا کرتے تھے۔ اور واجد علی شاہ ان میں پارٹ کیا کرتے تھے۔ لالہ سری رام صاحب تذکرہ خمخانہ جاوید (جلد اوّل صفحہ ۲۰۹) واجد علی شاہ کے حالات میں فرماتے ہیں کہ

"صدہا طوائف حسین وجمیل و خوش گلو اس رہس میں ملازم ہوئیں۔ ہر ایک کو لباس فاخرہ و زیور مرصع عطا ہوا۔ پردے اور دیگر سامان بھی اسی شاہانہ پیمانہ پر تیار و مرتب ہوا۔"

رہس تو خیر ہندوستان میں عام چیز ہے۔ قیصر باغ میں پہنچ گئی لیکن پردے جو بالکل مغربی چیز ہیں اور رہس کی نمائش ان کی دست نگر نہیں۔ ان کا دخل قیصر باغ میں کیسے ہوا۔ اردو کے سٹیج کی تاریخ میں یہ سوال اسقدر اہمیت رکھتا ہے کہ صرف اس کا جواب مولانا کی تشفی کے لئے کافی ہے۔ یہ زمانہ ایسا نہ تھا جب یورپ کی زیارت سے مشرف ہونے والے اس کثرت سے نہیں جیسے آجکل دیکھنے میں آتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ میں داخل نہ ہوگا۔ کہ اس وقت کے دربار اودھ کا مرقع کسی ایسے ہندوستانی کی شبیہ پیش کرنے سے قاصر ہے جس نے یورپ کا سفر کیا ہو۔ اور وہاں کے تھیٹر دیکھے ہوں۔ ان حالات کو مدنظر رکھ کر اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ قیصر باغ کے سٹیج کو کسی یورپین کی وساطت سے پردے ملے۔ ورنہ واجد علی شاہ کی رنگ رلیوں کا کوئی مورخ ہمیں بتائے کہ یہ دساور کی چیز قیصر باغ کی فصیل کس طرح پھاند گئی۔ اور لکھنو کے کنھیا جی کا رہس منڈل کس طرح گیرک کے تھیٹر کا شنی بن گیا۔ یہ درست ہے کہ واجد علیشاہ کے زمانہ میں فرانسیسی حکومت کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ ہندوستان کی بساط حکمت عملی پر ان کے تمام مہرے پٹ چکے تھے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی فرانسیسی تجارت یا سیاحت کے لئے لکھنو میں نہیں آسکتا تھا۔ اور اسے دربار میں اتنی بھی رسائی نہ ہوسکتی تھی کہ وہ ذرا مغربی تھیٹر کے ساز و سامان کا ذکر کر سکے۔ عین ممکن ہے کہ جس شخص کو راوی نے فرانسیسی سمجھا وہ فرانس کا رہنے والا نہ ہو بلکہ یورپ کے کسی اور ملک کا باشندہ ہو۔ کیونکہ اس زمانہ میں عوام لکھنو کے لئے مختلف بلاد مغرب کے ساکنوں میں تمیز کرنا اور ان کی قومیت اور وطنیت تخصیص کر کے یہ کہنا کہ فلاں فرانسیسی۔ جرمن۔ ہسپانوی یا انگریز ہے محال تھا۔ ان کے عندیہ میں ہر ہیٹ پوش فرنگی تھا۔ اور یہ ہمہ گیر لفظ تمام مغرب نژاد اشخاص پر حاوی تھا۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے بھی (جلد سوم صفحہ ۳۳۰) فرنگی کے معنی یورپین لکھتے ہیں۔ لفظ فرنگ لفظ فرینک کا معرب ہے۔ اور فرینک اس قوم کا نام ہے جو گال میں آباد ہوئی۔ اور اس سرزمین کا نام اس قوم کے نام کی مناسبت سے فرانس پڑ گیا۔ اس لئے جبتک اس کے برعکس ثابت نہ ہو پردے لانے والے فرنگی سے فرانسیسی مراد لینا لغت کے لحاظ سے زیادہ موزوں ہے۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ رہس نے ایام قدیم سے لیکر تا ایں دم اپنی دلچسپی کی بقا کے لئے تھیٹر کے پردوں کے سامنے سر نیاز

ختم نہیں کیا۔ اور تھیٹر کے متعلقات کو اپنی سادگی کی بہار کے نقیض
سمجھا۔ پس پردوں کی موجودگی کسی ایسے ڈراما کی مقتضی ہے۔
جس کی نمائش میں انہیں استعمال کیا جائے اور جو فن کے
لحاظ سے رہس سے بلند پایہ ہو۔ اگر اندر سبھا وہ ڈراما نہیں
تو مولانا بتائیں کہ کس ڈراما کے لئے اتنا اہتمام کیا گیا تھا۔
بقول مولانا بادشاہ نے کنہیا جی کا ڈراما تصنیف کیا۔ مگر یہ تو
رہس کی قسم کی چیز تھی۔ ڈراما کا قائمقام نہیں ہو سکتی۔ مولانا
فرماتے ہیں کہ بادشاہ کے رہس منڈل کو دیکھ کر عوام کو بھی
شوق چرایا اور ان کے لئے امانت نے اندر سبھا لکھی۔ یہ سراسر
جانِ عالم کے حسن مذاق اور جدتِ طبع کی توہین ہے۔ اس
کے تو یہ معنی ہونگے کہ اہل لکھنؤ اپنے تاجدار سے زیادہ باسمجھ
تھے۔ جنہوں نے بادشاہ کے سوقیانہ شوق کو مہذب رنگ
میں پیش کیا۔ مولانا اگر یورپ کی تاریخ ڈراما پر نظر ڈالیں۔ تو
انہیں معلوم ہو کہ اندر سبھا کسقدر بلند چیز ہے۔ اور اگر وہ
مولانا حسرت موہانی کی آنکھ سے دیکھیں تو ادبیات میں اس
کا درجہ ظاہر ہو جائے۔ اندر سبھا اوپیرا یا میوزیکل کومیڈی ہے
اس صنف سے ہندوستان کا قدیم ڈراما نا آشنا ہے۔ اور
یہی طرز جدید یورپ میں ڈراما کا منتہائے کمال ہے ہندوستان
میں ڈراما کا آغاز اوپیرا سے ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ
اس کا طرح انداز کوئی فرنگی ہے۔ بلکہ یوں کہئے فرانسیسی ہے
اگر کوئی ہندوستانی رہنما ہوتا تو بھو بھوتی۔ بھوس اور کالیداس
کے ڈراموں کا نمونہ پیش کرتا۔ اگر انگریز ہوتا تو شیکسپیئر کے
طرز کی چاٹ لگاتا۔ یہ کوئی فرانسیسی ہی تھا جو اوپیرا کو رائج
کر گیا۔ کیونکہ اس وقت اوپیرا کے سب سے بڑے علمبردار
فرانسیسی ہی تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اندر سبھا کی
ترتیب فرانسیسی ڈراموں کی ترتیب سے ملتی جلتی ہے۔
اور انگریزی ڈراموں کی ترتیب سے مختلف ہے۔ اب اگر
یہ مان لیا جائے (ہٹ دھرمی اور سخن پچی کے بغیر کوئی
وجہ انکار نہیں) کہ اندر سبھا کی تصنیف کی وجہ کوئی فرانسیسی
ہے تو مولانا کا یہ خیال کہ وہ اہل شہر کے لئے لکھی گئی بودا
ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان ایام میں اہلِ لکھنؤ کو فرنگیوں سے
ملنے اور بات چیت کرنے کا کوئی موقعہ حاصل نہ تھا۔ یہ لوگ
دربار میں آتے جاتے تھے۔ اور وہیں اس قسم کا تذکرہ ممکن
تھا۔ یہ تو مسلمہ ہے کہ واجد علی شاہ رہس میں پارٹ کیا
کرتے تھے۔ اور یہ بھی مخفی نہیں کہ اختر پیا کی تمام زندگی ایک
ڈراما ہے۔ جس میں کبھی وہ نئی نویلی دلہن۔ کبھی سہاگ لٹی بیوہ
کبھی دردِ زہ کی ماری زچہ کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ تو
پھر کوئی وجہ مانع نہیں آتی۔ کہ انہوں نے کیوں اندر سبھا میں
پارٹ نہ کیا ہو۔ اور اس سے ان کے زہد و اتقا میں کیونکر
رخنہ پڑ سکتا ہے۔ مولانا نے واجد علی شاہ کے راجہ اندر
نہ بننے کے ثبوت میں یہ شعر پیش کیا ہے ؎

جانو سنگلدیپ سے اختر نگیں ہاں   سوتا ہے اک ماہرو لال محل پر وال

ہمیں اس استدلال پر ہنسی آتی ہے۔ کیونکہ واجد علیشاہ کے اندر نہ بننے کا تو کوئی ثبوت نہیں۔ ہاں اس سے یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے گلفام کا پارٹ کیا۔ ورنہ اندر سبھا کا یہ مصرع کہ "راجہ ہوں میں قوم کا اندر میرا نام" واجد علی شاہ کی آواز ہے۔ اور اس استعارے کے پردے میں اس کا ذکر ہے۔ کیونکہ ہندو دیومالا سے ذراسی مس رکھنے والا بھی جانتا ہے۔ کہ اندر کس قوم کے رکن ہیں۔ آخر میں ہم مولانا کی توجہ سرسوتی ریول ۱۹۲۰ء (انگریزی) کی طرف منعطف کرتے ہیں جس میں ہندوستان کے مایۂ ناز ادیب تاریخ اور فن ڈراما کے ماہر جناب لالہ کنور سین صاحب ایم۔اے بیرسٹرایٹ لاء اندر سبھا کے متعلق رقمطراز ہیں۔ " یہ اندر سبھا اودھ کے رنگیلے فرمانروا اور اس کے اہل دربار کے لئے تحریر ہوئی۔ جسے انہوں نے تمثیل کیا۔ واجد علی شاہ اس میں اندر کا پارٹ کیا کرتے تھے۔"

مزید تشفی کے لئے ہم نے ڈراما کے وحید العصر عالم جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی سے استشہاد کیا اور صاحب موصوف نے بھی اس قول کی تصدیق اور توثیق کی۔ اگر اب بھی مولانا نہ مانیں تو ہم تھیٹر کی زبان میں یہ کہنے پر قناعت کریں گے۔ " شتر جانیں یا لالہ کنور سین یا سرپرام۔ ہمیں اس جھگڑے سے کیا کام۔"

نور الٰہی محمد عمر

غزل

آنے لگا ہے اپنی حقیقت سے ڈر مجھے
کیوں دیکھتے ہیں غور سے اہل نظر مجھے

ہے خواب مرگ زندگیٔ تازہ کی دلیل
یہ شام دے رہی ہے نویدِ سحر مجھے

بدلی ہوئی نگاہ کو پہچانتا ہوں میں
دینے لگے پھر آپ فریب نظر مجھے؟

لیجاؤ ساتھ ہوش کو اے اہل ہوش جاؤ
ہے خوب اپنی بے خبری کی خبر مجھے

لو۔ وہ تو آکے بیٹھ گئے میرے سامنے
اُٹھنا پڑے نہ بزم سے دل تھام کر مجھے

کھویا گیا ہوں بے خودیٔ ذوقِ عشق میں
اے عقل جا کے لا تو ذرا ڈھونڈ کر مجھے

ہوتا ہے کون موت پہ عاشق میرے سوا
سوجھا نہ یہ فریب کسی کو۔ مگر۔ مجھے

"اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی"
پھر یہ نہیں تو کھا گئی کس کی نظر مجھے؟

ابوالاثر حفیظ

شعرائے مغرب

ہر ملک میں شاعر کی سیرت یکساں مانی گئی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ "شاعر" حال کی دلچسپیوں میں مستقبل کو بالکل فراموش کر دیتا ہے۔ شاعر کی گفتگو عقل و دانش پر مبنی ہوتی ہے۔ مگر اس کے اطوار میں ایک مجنونانہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ شاعر کی طبیعت کے جمود کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کوہ شگاف زلزلے بھی اس کی رُوح کو حرکت میں نہیں لا سکتے۔ برخلاف اس کے حسیات کا یہ عالم کہ ایک شربت کا گلاس ٹوٹ جانے تو شاعر سوگوار ہو جاتا ہے۔ یہ دنیا بھر سے انوکھا کیریکٹر ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ شاعر دُنیا میں کبھی کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتا۔

شعرائے مغرب جس طرح شاعری میں ان کا چرچا ہے۔ اسی طرح مفلسی میں بھی شہرہ آفاق ہیں۔

یُورپ کے بیشمار ہسپتالوں میں جو غربا کی اعانت کے لئے قائم ہیں۔ ایک ہسپتال ایسا بھی ہے جو صرف "زندہ" اور مفلوک الحال مصنّفین کے لئے وقف ہے۔ اور جسے مایوس الحیات مصنّفین کا محتاج خانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس ہسپتال کا بانی پوپ اربن ہشتم تھا۔ مگر اس ہسپتال میں شعراء اور عام مریضانِ افلاس کو داخل ہونے کی اجازت نہیں۔

اگر میں شعرائے ماضی وحال کے سوانح قلمبند کروں تو آپ سمجھینگے کہ میں دُنیا کے انبار مصائب کی تاریخ لکھ رہا ہوں

دورِ قدیم کے شاعروں میں "ہومر" سب سے زیادہ مشہور گزرا ہے۔ وہ نابینا تھا۔ اور گلیوں میں گا بجا کر کسب معاش کیا کرتا تھا۔ مگر جہانتک دیکھا گیا ہے اس کا مُنہ خوراک کے بجائے زیادہ تر اشعار سے پُر رہتا تھا۔

پلاٹس ایک خوشباش اور زندہ دِل شاعر تھا۔ اور دوسرے شعراء کی نسبت زیادہ خوشحال تھا۔ وہ شاعری کو خوش بسری اوقات کا ذریعہ خیال کرتا تھا۔ مگر شکم پری کے لئے اس کو رات دن چکّی سے زور آزمائی کرنی پڑتی تھی۔

ٹیرنس ایک غلام تھا۔ اور بوتھیّس قید خانے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگیا۔

اٹلی کے شعراء میں "بولو بارگیس" جسے کمالِ شاعری میں ٹوسو کا ہمپلہ مانا جاتا ہے۔ جو دہ مختلف کام جانتا تھا مگر وہ مرگیا۔ کیونکہ وہ ایک کام کے ذریعہ سے بھی معاش حاصل نہ کر سکا۔

خود "ٹوسو" جو ایک ہردلعزیز شاعر تھا۔ کبھی کبھی کسی دوست سے قرض مانگنے پر مجبور ہو جاتا تھا جس سے

وہ اپنے ماہانہ مصارف چلا سکے۔ وہ ایک نظم اپنی یادگار چھوڑ گیا ہے۔ اس نظم میں وہ اپنی بلی سے خطاب کر کے اس کی آنکھوں سے نور طلب کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اسقدر مفلس تھا کہ ایک موم بتی خریدنے کی بھی استطاعت نہیں رکھتا تھا۔

مگر "بینی دو گلیو" "آہ غریب" "بینی دو گلیو" ہمارے خاص رحم کا مستحق ہے۔ اس کے (کومیڈیز) ڈرامے اطالوی زبان کے ساتھ یادگار رہینگے۔ اس نے اپنی کثیر دولت جود و سخا میں صرف کر دی تھی۔ مگر بڑھاپے میں وہ اس ہسپتال سے جبراً نکال دیا گیا۔ جسے اس نے جوانی میں اپنے روپے سے تعمیر کرایا تھا۔

ہسپانیہ میں مشہور "سروینٹز" بھوک سے ہلاک ہوا اور یہ بھی درست ہے کہ "کیمونیز" نے اپنے آخری ایام قید خانے کی سنگلاخ تنہائی میں بسر کئے۔

اگر ہم فرانس کے شاعروں کا مطالعہ کریں۔ تو ابنائے وقت کی سرد مہری کا پورا پورا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

"دوگیلس" ایک نازک خیال شاعر اور راستباز انسان عوام میں "اُلو" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس لئے کہ وہ اپنے قرضخواہوں کے خوف سے گھر میں چھپا رہتا تھا اور صرف رات کے وقت باہر نکلنے کی جرأت کرتا تھا۔ اس کی وصیت دیکھکر ہماری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔

"میری ساری دولت قرضخواہوں میں تقسیم کر دی جائے۔ مگر چونکہ میری ساری دولت میرے واجب الادا قرض سے کم ہے۔ اس لئے یہ زیادہ مناسب ہوگا۔ کہ میرے جسم کو کسی سرجن کے ہاتھ معقول رقم پر فروخت کر دیا جائے۔ جس سے میں باقیماندہ قرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ اور دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اگرچہ میں زندگی میں ان کے کسی کام نہ آیا تھا۔ مگر زندگی کے بعد ملک و قوم کے لئے کسی حد تک مفید ثابت ہوا۔"

سیڈین اپنے وقت کا خاص طباع شخص تھا۔ مگر قابلیت اس کے عیوب برہنگی ڈھانپنے کے کام بھی نہ آسکی۔ زمانہ اس کے ساتھ ہمیشہ سرد مہری کا برتاؤ کرتا رہا۔ اور رفتہ رفتہ اس نے بھی زمانے کے سکھائے ہوئے سبق کو زمانے ہی پر دوہرانا شروع کر دیا۔ اور انسانوں سے نفرت کرنے لگا۔ اور خدا کو اپنی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار ٹھیرایا۔ جب وہ دم توڑ رہا تھا۔ ایک خدا ترس پادری اس کے پاس آیا۔ اور اس سے خدا کے انصاف پر شاکر و صابر رہنے کی درخواست کی۔ اور کہا۔ کہ اسے رحم کی امید اسی ہستی سے رکھنی چاہیے جس نے اُسے پیدا کیا ہے۔

شاعر نے جواب دیا۔ "خدا نے دنیا میں میرے ساتھ کونسا انصاف روا رکھا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میں دوسرے جہان میں بھی اس سے کوئی توقع رکھوں۔"

پادری بولا خدا کے رحم اور انصاف کو جھٹلانے سے اس کی واقعیت میں فرق نہیں آسکتا۔ مَیں تمہاری منّت کرتا ہوں کہ اس سے جو تمہارا باپ اور تمہارا خالق ہے عناد نہ رکھو۔"

شاعر نے چڑ کر جواب دیا۔ "نہیں یہ کبھی نہیں ہوسکتا کیا تمہیں معلوم ہے کہ مَیں نے اپنی زندگی کس طرح بسر کی ؟ وہ اُٹھا اور اپنے گھاس کے ناہموار بسترِ موت کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بولا۔ "کیا تم اندھے ہو؟" پھر گرا اور مر گیا۔

جب ہم اپنے مُلک سے مقابلہ کرتے ہیں تو دوسرے ممالک کے شعراء کی مصیبتیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔

سپنسر۔ ملٹن۔ ڈرائیڈن وغیرہ کے حالاتِ زندگی قوم کے لئے باعثِ ننگ ہیں۔ ان میں سے بعض زندگی اور موت کی اس درمیانی حالت میں عمر بسر کر گئے جس میں انہیں دوسرے وقت کے آذوقہ کی کبھی امید نہیں ہُوئی۔ اور بعض شدتِ گرسنگی سے ہلاک ہوگئے۔ موجودہ زمانے میں انگلستان کے معدودے چند شاعر امراء کے دست نگر نہیں ہیں۔ ان کے مربی عوام الناس ہیں۔ اور نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ حالت اوّل الذکر سے بدرجہا بہتر ہے۔

بعض وقت جمہور شاعروں کے کمالات کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ مگر یہ کیفیت دیر تک نہیں رہتی۔ رفتہ رفتہ شاعری کی اصلی خوبیاں ان کے دلوں کو منوّر کر دیتی ہیں۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ایسی تصنیف بہت جلد مشہور ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اس میں خوبی کوئی بھی نہ ہو مگر یہ حالت بھی دیر پا نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ اصل خوبی سے معرا ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی شہرت جلد معدوم ہو جاتی ہے وقت جو ہماری خوبیوں کا معیار ہے۔ دھوکے کو جلد معلوم کر لیتا ہے۔ کوئی شاعر اپنے آپ کو کامیاب خیال نہیں کر سکتا جب تک عوام اسکی تصنیف کو دس برس تک دل لگا کر مطالعہ نہ کریں۔

موجودہ زمانے کا مُصنّف اپنی تصنیف کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوتا ہے۔ لوگ اس کی تصانیف کو خریدتے ہیں اور اسے اپنی محنت کا کافی معاوضہ مل جاتا ہے۔

"پچھلے زمانے میں لوگ ایسی زندگی کو جو بالاخانوں میں بسر ہو نفرت آمیز مضحکہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مگر اب یہ حالت نہیں کیونکہ یہ بات اچھی بھی نہیں۔ اگر کوئی صاحبِ کمال مصنف دولتمند بننا چاہے تو اسکے راستے میں کوئی مشکل حائل نہیں لیکن اُن مُصنّفوں کو جو کمال سے بے بہرہ ہیں چاہئے کہ اپنی زندگیاں گمنامی ہی کی حالت میں بسر کر دیں۔

آجکل کوئی شاعر کھانے کی دعوت سے بڑی فراخدلی کے ساتھ انکار کر سکتا ہے۔ کیونکہ اسے اپنے کسی مربی کے بگڑ جانے کا خطرہ نہیں اور نہ بھوکا رہنے کا احتمال ہے۔ اور خواہ کسی قسم کا لباس پہنکر بازاروں میں سیر کرے۔ شہزادوں سے ملے اور ان کو اپنی گفتگو سے دانشمندی کا ثبوت دے وہ ہر طرح آزاد ہے۔ اگرچہ وہ دولتمند نہیں۔ (گولڈسمتھ)

فاخرہ

اندرا

M. A. Zeenuddin

آخرکار مجھے سُسرال بھیجنے کی تیاریاں ہونے لگیں
میری انیسویں سالگرہ گزر چکی تھی۔ مگر ہندو رواج کے خلاف
ابھی مَیں نے والدین کے گھر سے قدم باہر نہ رکھا تھا۔ کیوں؟
اس کا جواب آسان ہے۔ میرا باپ امیر تھا اور خُسر غریب۔
شادی کے چند روز بعد ابھی مَیں بچّہ ہی سی تھی۔ میرے خُسر نے
چند آدمی مجھے لے جانے کے لئے بھیجے۔ مگر میرے باپ نے
انکار کر دیا۔ کہ پہلے میرے داماد کو برسرِ روزگار ہو لینے دو۔
موجودہ حالت میں وہ اخراجات کا کفیل کس طرح ہو سکتا ہے
جب میرے خاوند نے یہ بات سُنی تو اسے سخت رنج ہُوا۔
اس وقت اس کی عمر بیس سال کی تھی۔ اُس نے گھر سے نکل
مغربی ہند کا رُخ کیا۔ اس زمانے میں ریل نہ تھی۔ سفر
نہایت مشکل اور خطرناک تھا۔ تاہم وہ منزل بمنزل پیدل
سفر کر کے پنجاب میں آ نکلا۔ ایک نوجوان جو تکالیف اور
مشکلات کا سامنا کرنے کا مصمم ارادہ کر لے۔ وہ سارے
مصائب پر فتحیاب ہو سکتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس
نے روپیہ کما کما کر بھیجنا شروع کیا۔ مگر سات آٹھ سال
تک نہ تو وہ خود واپس آیا۔ نہ ہی اُس نے میرے متعلق دریافت
کیا۔ جس وقت میری کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ پہلی دفعہ گھر
آیا تھا۔ گردو نواح کے لوگوں میں یہ افواہ گرم تھی کہ اس نے
کمسریٹ میں ٹھیکے لے لے کر کافی روپیہ جمع کیا ہے۔ میرے
خسر نے میرے باپ کو چٹھی لکھی۔ کہ اوپندرا (دقیانوسی خیالات
کے آدمی آزادانہ اپنے شوہر کا نام لینے پر مجھے معاف فرمائیں
میرا خیال ہے کہ آجکل کی عورتیں میرا اوپندرا کہتی ہوئی بھی
نہ شرمائینگی) پرماتما کی کرپا سے واپس آ گیا ہے۔ اور اب
اخراجات خانہ داری برداشت کرنے کے قابل ہے۔ اس
نے ایک پالکی اور چند کہار بھی بھیجدئے۔ کیا میرا باپ مجھے
نئے گھر میں بھیج دیگا؟

پالکی منقش تھی اس کی چھت روپہلی تھی اور ستون نقرئی
خادمہ جو ہمراہ آئی تھی زرق برق ریشمی لباس پہنے ہُوئے
تھی۔ گلے میں طلائی موتیوں کی مالا تھی۔ میرا باپ ہرموہن دت
نہایت شریف النسل انسان تھا۔ وہ ان نئے امیروں
کے طرزِ زیبائش پر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ میری پیاری اندرا
اب مَیں تمہیں نہیں روک سکتا تمہیں جانا پڑیگا۔ مگر دیکھنا
کہیں بناوٹ اور ظاہری شان و شوکت تمہیں خود پسند
نہ بنا دے۔

الغرض مَیں اپنے نئے گھر کی طرف روانہ ہو گئی میرے
سُسرال منوہر پور میں تھے اور میرا باپ مہیش پور رہتا
تھا۔ دونوں گاؤں میں کوئی بیس میل کا فاصلہ تھا

میں ایک جھیل تھی۔ جس کا نام کالا تال یا سیاہ تالاب تھا۔
یہ ایک میل لمبی تھی۔ کنارے پہاڑیوں کی طرح بلند تھے۔
ارد گرد ڈھیل کے بڑے بڑے درخت تھے۔ پانی گھٹا کی
طرح سیاہ تھا۔ جگہ بالکل غیر آباد تھی۔ نزدیک ایک گاؤں تھا
جس کا نام کالا ڈنگی تھا۔

لوگ اس رستے سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔
یہ علاقہ ڈاکوؤں کے لئے مشہور تھا۔ مسافر قافلے بن بن کر
چلتے تھے۔ درحقیقت جھیل کا نام ڈاکوؤں کی سیاہ جھیل تھا۔
مجھے کوئی خوف نہ تھا۔ میرے ساتھ بہت سے خدمتگار تھے
سولہ کہار چار مسلح محافظ اور تھے۔ جب ہم یہاں پہنچے دوپہر
ڈھل چکی تھی۔ کہاروں نے کہا۔ اتنے آدمیوں کو کوئی خطرہ
نہیں۔ چنانچہ ٹھہرنے کی تجویز ہو گئی۔

جھیل کے کنارے بڑے درختوں کے نیچے میری
پالکی رکھ دی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کی آوازوں سے
معلوم ہوا کہ میرے خدمتگار کچھ فاصلے پر چلے گئے ہیں۔ میں
نے حوصلہ کر کے دروازے کا تختہ سرکایا۔ اور پانی پر نظر ڈالی
کہار کوئی سو گز کے فاصلے پر ایک درخت کے نیچے کھانا کھا
رہے تھے جھیل کا نیلا پانی سامنے تھا۔ ارد گرد کنارے
پہاڑیوں کی طرح کھڑے تھے۔ پانی کے کنارے بہت سے
درخت اُگے ہوئے تھے۔ ان میں چوپائے اِدھر اُدھر چر
رہے تھے۔ آبی پرندے پانی میں کھیل رہے تھے نسیم جانفزا
کے جھونکے آ رہے تھے۔ ہلکی ہلکی لہریں دھوپ میں چمک رہی
تھیں۔ کنول پانی کی سطح پر لہرا رہے تھے۔ میرے مسلح محافظ
نہا رہے تھے۔ اور پانی کے قطرے اچھل اچھل کر سورج کی
کرنوں میں ہیروں کی طرح چمکتے تھے۔ میرے پاس صرف
دو عورتیں ہی رہ گئی تھیں۔ میری طبیعت بے چین ہو گئی۔
سوائے عورتوں کے کوئی نزدیک نہ تھا۔ جگہ خطرناک تھی
میں کچھ خوفزدہ سی ہو گئی۔

اس وقت میں نے پالکی کی دوسری طرف ایک
آواز سنی۔ جیسے کوئی وزنی چیز درخت پر سے گری ہو۔ میں
نے اس طرف کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ ایک دراز قد
سیاہ فام شخص میرے سامنے کھڑا تھا۔ اتنے میں ایک اور
پھر ایک اور۔ یکے بعد دیگرے درخت کی شاخوں میں
سے کود پڑے۔ اور پالکی اٹھا کر بھاگ نکلے۔

یہ دیکھ کر محافظ چلائے۔ کون ہے؟ اور پانی
سے نکل کر ان کے پیچھے بھاگے۔ اس وقت مجھے پتہ لگا کہ
میں ڈاکوؤں کے پھندے میں پھنس گئی۔ اب شرم و حیا
کس کام کے تھے۔ میں نے پالکی کے دونوں دروازے
کھول دئے۔ میرے خدمتگار شور مچاتے ہوئے ڈاکوؤں کا
تعاقب کر رہے تھے۔ پہلے تو مجھے بچاؤ کی کچھ امید تھی۔ مگر
جلد ہی ان امیدوں کا خاتمہ ہو گیا۔ کیونکہ جوں جوں ہم
چلتے گئے۔ درختوں پر سے اور ڈاکو کودتے گئے۔ بعض کے

ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں بعض نے درختوں کی ٹہنیاں توڑ لی تھیں۔

ایسا زبردست گروہ دیکھ کر میرے خدمتگار جھجک گئے اور واپس لوٹے۔ اس مایوسی کی حالت میں میں نے سوچا "کیا میں پالکی میں سے کود پڑوں" مگر وہ اس تیزی سے جا رہے تھے کہ کودنا بھی خطرناک تھا۔ علاوہ ازیں ایک ڈاکو نے لاٹھی سے مجھے دھمکایا کہ اگر تم باہر آنے کی کوشش کروگی تو تمہارا سر پھوڑ دونگا۔

میرے ایک خدمتگار نے پیچھے سے آکر پالکی کو پکڑ لیا۔ ایک ڈاکو نے اس کے سر پر لاٹھی ماری۔ اور وہ بیہوش ہوکر گر پڑا۔ یہ دیکھ کر دوسروں نے تعاقب چھوڑ دیا۔ ڈاکو بغیر روک ٹوک کے مجھے لئے جاتے تھے وہ رات تک متواتر بھاگتے رہے۔ آخرکار پالکی ایک جگہ رکھ دی میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ دور تک گھنا [illegible] دکھائی دیتا تھا۔ گھپ اندھیرا تھا۔ ایک ڈاکو نے مشعل جلائی اور مجھے کہا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے بلاحیل و حجت ہمارے حوالے کردو۔ میں نے اپنے تمام زیور اور جواہرات اُتار دئے میرے کپڑے بھی اُتروا لئے۔ اور ایک میلی سی دھوتی مجھے باندھنے کے لئے دیدی۔ جب وہ مجھے لوٹ چکے تو انھوں نے پالکی کو توڑ ڈالا۔ اور طلائی اور نقرئی حصّہ اُتار کر چوبی حصّے کو آگ دکھادی۔ اور مجھے اس ویران جنگل میں درندوں کے رحم پر چھوڑ کر روانہ ہوگئے۔ میں ڈر کے مارے چلّائی "مجھے اپنے ساتھ لے چلو"

میں اسقدر خوفزدہ ہوگئی تھی کہ ان بدذات ڈاکوؤں کے ساتھ جانے کو تیار تھی۔ ایک بوڑھے ڈاکو نے ذرا نرمی سے کہا۔ ہم ایسی خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو کیا کرینگے۔ ایک نوجوان نے کہا۔ میں اس حسن کی دیوی کے لئے جیل میں جانے کو تیار ہوں۔ مگر اس کو اکیلی نہیں چھوڑ سکتا۔

بوڑھا آدمی ان کا سرغنہ تھا۔ اس نے لاٹھی اُٹھائی اور کہا۔ میں تمہارا سر توڑ دونگا۔ بدذات۔ کیا ایسے گناہ ہمارے ہی حصّے میں آتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ سب چلے گئے

جبتک ان کی آوازیں میرے کانوں میں آتی رہیں مجھے ہوش رہی۔ جب کچھ سنائی نہ دیا تو میں بیہوش ہوگئی۔

(۳)

میرا خیال ہے کہ میں سوگئی۔ کیونکہ جب مجھے ہوش آئی تو کوے شور مچا رہے تھے۔ بانسوں کے جھنڈ میں سے صبح کی روشنی نمودار تھی۔ میں اُٹھی اور آبادی کی تلاش میں چلی اور کچھ عرصے کے بعد ایک گاؤں میں پہنچ گئی۔ مگر میں نے جنگل کی نسبت یہاں اپنے آپ کو زیادہ خطرے میں پایا۔ اوّل تو مجھ جیسی باحیا و باعصمت لڑکی کے لئے مردوں سے باتیں کرنا تکلیف دہ تھا کیونکہ جب میں اُن سے کوئی بات دریافت کرتی۔ وہ میری طرف گھورتے بعض تمسخر اڑاتے بعض ہنسکر

فقرے کستے۔ مَیں نے سوچا کہ ایسی ذلّت سے موت اچھی ہے۔ ایسے بدطینت لوگوں سے کوئی بات نہیں پُوچھنی چاہیئے۔ مگر طرفہ یہ کہ عورتیں بھی مجھے عجیب الخلقت خیال کر کے محوِ حیرت بن جاتیں۔ صرف ایک ضعیف العمر نے پُوچھا۔ بچّی تو کون ہے۔ کیا یہ مناسب ہے کہ تجھ جیسی نوجوان اور حسین لڑکی سڑکوں پر اکیلی پھرے۔ مَیں قربان جاؤں۔ میرے گھر چلو۔"

مَیں بلا تامل اس کے ساتھ چلی گئی۔ مجھ کو بھُوک سے بیتاب دیکھ کر اُس نے کچھ کھانے کو دیا۔ اور کہا "میں جھیش پور جانتی ہوں۔" مَیں نے کہا۔ "اگر تم مجھے وہاں پہنچا دو۔ تو تمہیں بہت سا انعام و اکرام ملیگا" مگر اُس نے سادہ لوحی سے جواب دیا۔ "مَیں اپنا گھر اور بال بچے چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔"

مَیں اکیلی روانہ ہو گئی۔ اور شام تک چلتی رہی۔ اندھیرا ہو گیا۔ مَیں تھک کر چور ہو گئی تھی۔ ایک مسافر سے مَیں نے دریافت کیا جھیش پور کتنی دُور ہے۔ وہ حیران ہو کر کہنے لگا۔ "تم اُلٹے راستے جا رہی ہو۔ جھیش پور یہاں سے دو دن کی راہ ہے۔" خوف اور یاس کے باوجود مَیں سنبھلی رہی۔ اور اس سے پُوچھا آپ کہاں جا رہے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ "گوریگرام کی جھونپڑیوں میں جو نزدیک ہی ہیں۔" مَیں بلا سوچے سمجھے اس کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ جب ہم گاؤں میں پہنچے تو اس نے پوچھا تم کہاں جاؤگی۔ مَیں نے کہا یہیں کسی درخت کے نیچے رات بسر کر لونگی۔

اُس نے کہا۔ "تمہاری ذات کیا ہے؟"

مَیں نے جواب دیا۔ "مَیں کایستھ ہوں۔"

اُس نے کہا۔ "مَیں برہمن ہوں۔ میرے ساتھ آؤ۔ تم اُونچے گھرانے کی معلوم ہوتی ہو۔ گودڑیوں ہی میں لعل ہُوا کرتے ہیں۔ آہ۔ خوبصورتی۔ حُسن۔ مَیں ان خوبیوں کی تعریف سُنتے سُنتے تھک گئی تھی۔ مگر برہمن بوڑھا تھا اور شریف۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

مَیں نے وہ رات برہمن کے گھر میں نہایت آرام سے گزاری۔ صبح کو جب اُٹھی تو جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ پاؤں سُوج گئے تھے۔ مجھ میں بیٹھنے کی بھی طاقت نہ تھی۔

جبتک میری یہ حالت رہی مَیں برہمن کے گھر رہی۔ وہ اور اُس کی بیوی مجھ پر بڑے مہربان تھے۔ مگر مَیں جھیش پور پہنچنے کی کوئی سبیل نہ سوچ سکی۔ کسی عورت کو معلوم نہ تھا۔ نہ ہی کوئی میرے ساتھ چلنے کو تیار تھی۔ بہت سے مرد البتہ ضرور تیار تھے۔ مگر ان کے ساتھ اکیلی جاتی ہُوئی ڈرتی تھی۔ نہ ہی بُوڑھے برہمن نے مجھے اجازت دی۔

ایک دن مَیں نے سُنا کہ مسمی کرشن داس باسو معہ عیال و اطفال کلکتہ جا رہا ہے۔ کلکتہ میرے باپ اور سسرال دونوں کے گاؤں سے بہت دُور تھا۔ مگر ہمارا ایک دُور کا رشتہ دار وہاں بیوپار کرتا تھا۔ مَیں نے سوچا اگر مَیں کلکتہ پہنچ جاؤں تو اپنے رشتہ داروں کو آسانی سے اطلاع دیدونگی۔ وہ مجھے گھر

بھیجد ینگے یا میں اپنے باپ سے کہلا بھیجونگی۔

میں نے اپنے میزبان سے اس بات کا ذکر کیا۔ اس نے میری تجویز کو پسند کیا۔ اور کہا میں کرشن بابو کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ نہایت شریف آدمی ہے۔ پھر وہ مجھے کرشن بابو کے پاس لے گیا۔ اور واقعات بیان کئے۔ "اگر آپ اس غریب و بیکس لڑکی کو کلکتے پہنچا دیں تو یہ آسانی سے اپنے گھر چلی جائے گی۔

کرشن بابو رضامند ہو گیا اور مجھے زنانخانہ میں بھجوا دیا۔

اگلے دن ہم سب روانہ ہوئے۔ اور آٹھ دس میل پیدل چلکر گنگا میں کشتی پر سوار ہو گئے۔ اور صحیح سلامت کلکتے پہنچ گئے۔ کرشن بابو کالی گھاٹ ماتا کے ہاں جا رہا تھا۔ اس نے بھوانی پور کے نواح میں قیام کیا۔ اور میرے رشتہ داروں کے متعلق دریافت کیا۔ مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ نہ ہی ان کا پتہ معلوم تھا۔ میرا خیال تھا۔ کہ کلکتہ ایک گاؤں ہوگا۔ جہاں بڑے بڑے آدمیوں کو سب جانتے ہونگے۔ صرف نام لے دینا ہی کافی ہوگا۔

اب معلوم ہوا کہ کلکتہ مکانوں اور عمارتوں کا ایک بے پایاں سمندر ہے۔ کرشنا بابو میری خاطر تلاش کرتا رہا مگر کلکتہ جیسے شہر میں ایک معمولی بابو بھی کیا پتہ لگا سکتا ہے۔

کالی گھاٹ سے کرشنا بابو کا ارادہ بنارس جانے کا تھا۔ پوجا وغیرہ سے فارغ ہو کر انہوں نے تیاری شروع کر دی۔ اب میں کیا کرتی۔ بے اختیار رونے لگی۔

میرے مہربان نے کہا۔ دیکھو میری بات سنو۔ میرا ایک دوست نزدیک ہی رہتا ہے۔ میں کل اتفاقاً اس سے ملا۔ اس کو ایک باورچن کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملک میں شریف زادیاں بھی روٹی پکانے کا کام کرتی ہیں۔ تم کیوں نہیں چلی جاتیں۔ میں تمہیں بنارس نہیں لے جا سکتا۔ اور اگر تم گئی بھی تو تمہاری حالت نہیں سدھر سکتی۔ علاوہ ازیں تم یہاں رہ کر اپنے رشتہ داروں کو تلاش کر سکتی ہو۔

سوائے سر تسلیم خم کرنے کے میں اور کیا کر سکتی تھی۔ اپنی خوبصورتی کا خیال پھر میرے دل میں آیا۔ میں مردوں کو اپنا جانی دشمن خیال کرتی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "رام دت بابو کی عمر کیا ہے۔"

کرشن بابو نے جوابدیا۔ "وہ میری طرح بوڑھا ہے۔"

میں۔ "کیا اس کی بیوی زندہ ہے۔"

کرشن بابو۔ اس کی دو بیویاں ہیں۔

میں۔ "کوئی اور مرد بھی اُن کے گھر میں ہے۔"

کرشن بابو۔ "صرف ایک دس سال کا لڑکا۔ اور ایک اندھا بھتیجا۔"

انکار کو جگہ نہ تھی۔ اگلے دن کرشنا بابو نے مجھے رام دت بابو کے گھر بھیج دیا۔ اور میں باورچن بن گئی۔ کس کو خیال تھا کہ یہ دن بھی میری قسمت میں لکھے تھے۔

(۲)

سب سے پہلے مجھے یہ خیال آیا کہ کچھ روپیہ جمع کر کے گھر جانا چاہیے۔ مگر کسی کو معلوم نہ تھا کہ بھیش پور کہاں ہے نہ ہی کوئی ایسا شخص مجھے ملا۔ جو وہاں جانے کی تجویز بتاتا۔ میں خود چار دیواری کا باشندہ۔ مجھے تو اپنے ضلع کی بھی خبر نہ تھی۔ ایک سال گذر گیا۔ اور یکلخت میری یاس کی تاریکی میں امید کی ایک جھلک دکھائی دی۔ گویا میں نے برسات میں بادلوں کے درمیان ایک چمکتا ہوا ستارہ دیکھا۔

ایک دن رام بابو نے مجھے بلایا اور کہا۔ "آج میرے ہاں ایک دوست کی دعوت ہے۔ میں اس کا مقروض ہوں۔ آج کھانا خاص طور پر نفیس ہو"

میں نے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ خود ہی کھانا چنا۔ رام بابو اور مہمان دونوں آ گئے۔ میں کھانا چن رہی تھی۔ میرے چہرے پر نقاب تھا۔ مگر عورت ذات کو نقاب کیا تکلیف دے سکتا ہے۔ میں نے اپنے آقا کے مہمان کو نظر بھر کر دیکھا۔

وہ تیس سال کا تھا۔ گورا بدن۔ نہایت خوبصورت واقعی ایسے حسین محبوبِ زناں ہوتے ہیں۔ میں تھالی ہاتھ میں لئے کھڑی اس کو دیکھتی رہی۔ اُس نے سر اُٹھایا۔ اور کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ بنگالیوں میں مثل مشہور ہے کہ جس طرح روشنی اندھیرے میں زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اسی طرح نقاب پوش عورت کی آنکھیں بھی زیادہ روشن ہوتی ہیں۔ وہ بھی اسی خیال کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ ذرا مُسکرایا۔ اور پھر کھانے میں مشغول ہو گیا۔ میرے سوا اور کسی نے اس کی مُسکراہٹ کو محسوس نہ کیا۔ میں نے گھبراہٹ میں سارا سالن اسی کی تھالی میں ڈال دیا اور بھاگ آئی۔

میں شرمندہ بھی تھی اور خوش بھی۔ مگر مسرت شرم پر غالب آگئی تھی۔ یہ پہلا تبسم تھا۔ جس سے مجھے مسرت ہوئی میری طرف دیکھ کر پہلے کوئی اس انداز سے نہیں ہنستا تھا۔ دُنیا کے تمام لوگوں کا تبسم اس کے مقابلے میں زہر معلوم ہوتا تھا مجھے یقین ہے کہ جو عورتیں اپنے خاوندوں سے محبت رکھتی ہیں وہ سخت ناراض ہو جائینگی۔ اور کہینگی بیحیا عورت۔ مگر یہ دل کے آجانے کی باتیں ہیں۔ میں اُسے چاہنے لگی تھی۔ میں نے اپنے خاوند کو صرف شادی کے موقعہ پر ایک دفعہ دیکھا تھا۔ اور اس وقت میری عمر دس سال کی تھی۔ جب ایسے گہرے اور بے تھاہ سمندر میں جال ڈال دیا۔ تو پھر موجوں کے تھپیڑوں کی کیا پروا۔

میں مانتی ہوں۔ کہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے میں مجھ پر کوئی الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ خواہ اس کی وجہ کچھ ہی ہو۔ گناہ آخر گناہ ہے۔ مقصد کا بہانہ گناہ کی تلافی کے لئے کافی نہیں۔ مگر میری تمام عمر میں اس قسم کا پہلا اور آخری گناہ تھا۔

جب میں مطبخ میں واپس آئی۔ مجھے خیال آیا۔ میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ تسلی کر لینے کے لئے میں پھر

گئی اور چھپ کر دیکھا۔ میں غور سے دیکھتی رہی اور پہچان لیا
اس وقت رام بابو نے اور کھانا لانے کے لئے آواز
دی۔ میں نے بہت سے کھانے تیار کئے ہوئے تھے۔
ایک تھالی اُٹھا کر میں ڈائننگ روم میں گئی۔ مہمان وہ پہلی
ادا نہیں بھولا تھا۔ اُس نے کہا۔ رام بابو۔ باورچن سے کہدو
اس نے بہت اچھے کھانے پکائے ہیں۔ رام بابو کو اصل
واقعہ کی خبر نہ تھی۔ اُس نے سرسری طور پر کہا۔" ہاں بُرا
نہیں پکاتی" مگر میں سمجھ گئی۔ اور دل میں ٹھان لی کہ اس کو جتا
دینا چاہئے۔ کہ کس طرح چالاک باورچی ایک نوجوان کے
توہمات کو منتشر کر سکتا ہے۔

مہمان نے کہا۔" میں حیران ہوں کہ دو ایک کھانے
بالکل ایسے ہیں۔ جیسے ہمارے علاقے میں پکائے جاتے ہیں"

اب میں تاڑ گئی۔ یہ وہی ہے۔

رام بابو نے کہا۔ ممکن ہے۔ کیونکہ یہ لڑکی اس طرف
کی نہیں۔

مہمان نے یہ موقعہ غنیمت جان کر میری طرف غور
سے دیکھا۔ اور پوچھا" لڑکی تمہارا وطن کہاں ہے؟"

میں حیران تھی کہ بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ اور اگر بتاؤں تو
درست بتاؤں یا غلط۔ میں نے فیصلہ کیا۔ کہ غلط بتانا چاہئے
میں نے یہ ارادہ کیوں کیا۔ اس کی وجہ صرف وہی جانتا ہے
جس نے عورت کے دماغ کو مکر و فریب اور پیچید گیوں سے
بھر دیا۔ میں نے سوچا۔ اگر ضرورت پڑی تو سچ بتایا جا سکتا
ہے۔ اب اسے دھوکا ہی دینا چاہئے۔ یہ سوچ کر میں نے
جواب دیا۔" ہمارا گھر کالا ڈگی ہے"

وہ چونک پڑا اور نرمی سے پوچھنے لگا۔ کونسا کالا ڈگی
ڈاکوؤں کا۔

مجھے یہ بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ کہ میں نے جواب
دیا۔" ہاں"

وہ خاموش ہو گیا۔

میں ہاتھ میں تھالی لئے کھڑی تھی۔ مجھے اس بات کا
مطلق خیال نہ رہا۔ کہ ایک ہندو باورچن کے لئے مردوں کی
موجودگی میں اس طرح کھڑے رہنا خلافِ تہذیب ہے۔
میں نے دیکھا۔ کہ وہ کھانے میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ رام بابو
نے پوچھا۔" اوپندرا بابو۔ کھاتے کیوں نہیں۔"

میں یہی سننا چاہتی تھی۔ اوپندرا بابو۔ یہ نام سننے
سے پہلے ہی میں جانتی تھی۔ کہ وہ میرا خاوند ہے۔

میں کچن میں دوڑی گئی۔ اور تھالی پھینک خوشی
میں بیٹھ گئی۔

(۷)

اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اس کے بعد میں ہزاروں
دفعہ اپنے خاوند کا نام لیکر اس کا ذکر کرو نگی۔ کیا مہذب خاندانیں
باہم مشورہ کر کے مجھے بتا دینگی۔ کہ خاوند کے لئے کونسا لفظ

استعمال کرنا چاہئے۔ کیا وہ میرا خاوند۔ یار بار سُنکر ناراض تو نہ ہونگی۔ یا میں مغربی تہذیب کے مطابق اوپندرا کہہ کر پکاروں یا شاعرانہ تخیل کو کام میں لاکر میرا آقا۔ میرا مالک۔ میرا شوہر استعمال کروں۔ افسوس ہمارے بدقسمت مُلک میں ایک محبوب ہستی کو بلانے کے لئے جس کا نام لیکر پکارنے میں لطف آئے۔ کوئی لفظ نہیں میری ایک سہیلی جس نے شہر میں تربیت پائی تھی۔ اپنے خاوند کو بابو کہکر بلاتی تھی مگر صرف بابو ذرا خشک سا لفظ ہے۔ اس لئے اس نے بابو رام کہنا شروع کر دیا۔ میں تو اس کی پیروی نہیں کرتی۔

خیر۔ میں نے ابھی بتایا ہے کہ میں نے سالن کی رکابی پھینک دی۔ جونہی کہ میں نے ایسا کیا۔ مجھے خیال آیا کہ چونکہ قدرت نے گم شدہ خزانہ مجھ کو واپس دیا ہے۔ اب شرم وحیا سے اس کو کھونا نہیں چاہئے۔ یہ دل میں سوچکر میں ایسی جگہ کھڑی ہوئی۔ کہ جو شخص کمرے سے باہر آئے اس کی نگاہ ضرور مجھ پر پڑے۔

میں نے سوچا۔ اگر وہ میری طرف دیکھے بغیر چلا جائے تو اس بیس سال کی عمر میں میں نے مردوں کو سمجھا ہی نہیں۔ ناظرین معاف فرمائیں۔ میں سچ سچ کہونگی میں نے نقاب اُلٹ دیا۔ اور بے شرمی سے مُنہ کھولکر کھڑی ہوگئی۔ مجھے خود بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مگر غور کرو کہ اس وقت میری کیا حالت تھی۔

پہلے رام بابو نکلا۔ اُس نے بالکل سامنے کی طرف دیکھا میں ایک طرف تھی۔ پھر میرا خاوند باہر آیا۔ میرا کلیجہ بلیوں اُچھلنے لگا۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ اِدھر اُدھر گھور رہا ہے گویا وہ کسی کی تلاش میں ہے۔ اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کس کی تلاش میں ہے۔ جونہی کہ آنکھیں چار ہوئیں . . . . کیا بیان کروں۔ میرے ہوش ٹھکانے نہیں۔ مگر جس طرح ڈسنے سے پہلے ناگ اپنا پھن پھیلا لیتا ہے۔ یہی حالت عورت کی نظر کی ہے۔ اور میں کیوں اپنی نگاہ زہر آلود نہ بناتی۔ جب مجھے معلوم تھا۔ کہ وہ میرا آقا میرا خاوند ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مایوس ہوکر گیا۔ رام بابو کی ایک اور نوکرانی بھی تھی۔ جس کا نام ہرآنی تھا۔ ہمیں آپس میں بڑی محبت تھی۔ کیوں نہ ہو۔ ہم دونوں ایک ہی آقا کی نمک خوردہ تھیں۔ میں نے اُسے بلاکر کہا۔ میری پیاری! اگر تم مجھے شکر گزار بنانا چاہتی ہو تو جس وقت وہ بابو رُخصت ہونے لگے۔ مجھے اطلاع دینا۔ وہ ہنس پڑی اور کہنے لگی۔ اوہ۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ تم میں یہ کمزوری بھی ہے۔ میں نے ہنسکر کہا۔ یہ ایک کوچہ ہے۔ جس میں پیچ وخم نہیں۔ اور سارے کُتّوں کا اس میں حصّہ ہے۔ اس وعظ ونصیحت کو رہنے دو۔ مگر یہ بتاؤ کہ میری مدد کروگی یا نہیں۔ یقین جانو۔ دال میں کالا نہیں۔ اس نے کہا۔ اچھا میں تیار ہوں مگر کسی اور کے لئے نہیں۔

وہ گئی اور میرے اضطراب کی وجہ سے اُسے واپسی میں بہت دیر لگتی معلوم ہوئی۔ میں ماہیِ بے آب کی طرح بیقرار تھی۔ آخر وہ واپس آئی اور ہنسکر کہنے لگی۔ بابو کی طبیعت کچھ علیل ہے۔ وہ آرام کرنا چاہتا ہے۔ میں اس کے بستر کا انتظام کرنے آئی ہوں۔

میں نے جواب دیا۔ یہ تو اچھا ہُوا۔ لیکن اگر وہ شام کو جانے لگے تو اُسے آہستہ سے پکڑ لینا اور کہنا کہ بادرچن رات تک ٹھیرنے کی درخواست کرتی ہے۔ پھر وہ کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرلیگا۔

ہرانی ہنس پڑی۔ کچھ تو شرم کرو۔

تاہم وہ گئی اور شام کو واپس آکر بولی۔ میں نے تمہارا پیغام دیدیا ہے۔ بابو بڑا بد معاش ہے۔ وہ ٹھیرنے پر رضامند ہو گیا ہے۔ یہ سُنکر مجھے بڑی خوشی ہُوئی۔ میں شرمندہ بھی تھی مگر جو کچھ میں نے کیا۔ خلافِ اخلاق نہ تھا۔ کیونکہ میں اُسے جانتی تھی۔ مگر اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ اُس نے مجھے پہچانا ہوگا۔ میں نے اُسے کبھی جب وہ نوجوان تھا۔ دیکھا تھا۔ مگر اُس نے مجھے صرف اُس وقت دیکھا تھا جب اُس کی عمر دس گیارہ سال کی تھی۔ اس لئے مجھے سخت افسوس ہُوا۔ کہ اُس نے مجھے غیر عورت خیال کرتے ہُوئے اپنی خواہشاتِ نفسانی پر عمل کیا۔ تاہم وہ میرا خاوند تھا۔ اور میں اس کی بیوی مجھے اس کے خلاف کوئی بات نہیں کہنی چاہیے۔ میرے دل میں صرف اتنا خیال آیا۔ کہ اگر کسی دن ہم باہم مل جائیں تو میں اُس کی یہ بشری کمزوری دُور کردوں۔

اس کو ٹھیرنے کے لئے کوئی لمبے چوڑے بہانے تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اسے وقتاً فوقتاً اپنے کاروبار کے لئے کلکتہ آنا پڑتا تھا میرے آقا سے اس کی محبت کی بناء تجارتی کاروبار ہی تھا۔ ہرانی کی شرارت آمیز تجویز منظور کرکے وہ رام بابو کے پاس گیا اور کہنے لگا۔ "چونکہ میں یہیں ہوں اگر حساب کتاب کی پڑتال کرلیں تو اچھا ہے۔ رام بابو نے کہا۔ کتابیں دفتر میں پڑی ہیں۔ منگوا لیتا ہوں۔ مگر شام ہو جائیگی۔ صبح ہی ملاحظہ کرلیں۔ رات یہیں قیام فرمائیں۔

اُس نے جواب دیا۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔ آپ کا گھر میرا گھر ہے۔ حساب کی پڑتال کل ہی کرلینگے۔

(۵)

آدھی رات گزرے، جب سب لوگ کھانا کھا کر سو گئے۔ میں آہستہ سے مہمان کے کمرے میں چلی گئی وہاں صرف میرا خاوند سویا ہُوا تھا۔ یاد رہے کہ میری پیدائش سے لیکر آجتک خاوند سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ میں اس فخر اور حیا کا اظہار کس طرح کروں۔ جس کا مجھے اس وقت احساس تھا میں ہرزہ گو ہوں۔ مگر پہلی دفعہ جب میں نے اُسے مخاطب کرنے کی کوشش کی تو میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا میرے جسم میں رعشہ ہوگیا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میری زبان بند ہوگئی۔ اور میں نے زار زار رونا شروع کردیا۔

وہ میرا مطلب غلط سمجھا۔ بولا۔ روتی کیوں ہو۔ میں نے تو تمہیں نہیں بلایا۔ تم خود ہی آئی ہو۔ اور اب روتی ہو۔

ان الفاظ سے مجھے سخت صدمہ ہوا۔ اُس نے مجھے بے شرم اور رابتی عنایت کا متمنی تصور کیا۔ پہلے تو میں نے ارادہ کیا۔ کہ راز افشا کر دوں۔ پھر خیال آیا کہ اگر میں نے بتا ہی دیا۔ اور اُسے یقین نہ ہوا۔ پھر؟ چنانچہ میں نے اس ارادہ کو ملتوی کر دیا۔ اور اُس کو باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد اُس نے کہا۔ مجھے یہ سُنکر تعجب ہوا کہ تمہارا گھر کالا دیگی ہی ہے۔ مجھے کبھی یہ توقع نہ تھی۔ کہ ایسی حسین اور پاکیزہ ہستی اس جگہ پیدا ہو سکتی ہے۔ میں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور کہا۔ آپ کا حسنِ ظن ہے۔ مگر ہمارے علاقے میں تو آپ کی بیوی زیادہ حسین خیال کی جاتی ہے۔ اس کا کیا حال ہے؟

اُس نے بے اعتنائی سے کہا۔ نہیں! اُنہیں گھر سے آئے کتنا عرصہ ہوا۔

میں نے جواب دیا۔ آپ کی بیوی کے اغوا کے بعد ہی میں یہاں آئی تھی۔ کیا آپ نے دوسری شادی کر لی ہے؟

اُس نے دل خوش کن جواب دیا۔ نہیں!

میں نے کہا۔ آپ جیسے بڑے گھرانوں میں دوسری شادی ذرا دقت طلب امر ہے۔ اگر پہلی بیوی مل جائے تو دونوں تنازعہ ہو کرے۔

اس کمبخت نے بے پروائی سے ہنس کر کہا۔ اس بات کی پروا نہیں۔ اگر وہ واپس آ بھی جائے تو میں اُسے نہ رکھونگا

یہ بجلی تھی جو مجھ پر گری۔ میری تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ کیا میری روز افزوں محبت کا یہی صلہ تھا۔ تاہم میں نے حوصلہ کر کے پوچھا۔ اگر وہ تمہیں مل جائے تو کیا کرو۔

اس نے مستقل مزاجی سے جواب دیا۔ میں اس کے ساتھ قطع تعلق کر دوں۔

سنگدل۔ سفاک۔ ظالم ...... میں بت کی طرح کھڑی تھی۔ میرا دل زخمی ہو گیا۔ مایوسی اور حیرت سے میرا سر چکرانے لگا۔ اور میں اس کی چارپائی کے پاس بیٹھ گئی۔

(۶)

میں نے اپنے دل سے افکار دُور کر دیے۔ میں جانتی تھی۔ کہ میری تبسم آمیز نگاہیں اس کے متلون مزاج کو کھینچ رہی ہیں۔ میں نے سوچا جب گینڈا اپنا سینگ استعمال کر سکتا ہے۔ جب شیر اپنے پنجوں سے اپنی حفاظت کرتا ہے۔ تو ایک ضعیف الفطرت عورت بھی اپنے کمزور ہتھیار استعمال کر سکتی ہے۔ میں وہ طاقت آزماؤنگی جو خدا نے مجھے بخشی ہے۔

میں وہاں سے اُٹھی اور ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی۔ اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگی۔ وہ میری طرف بڑھا۔ میں نے کہا ہٹو، تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میں پھر مسکرائی۔ اگر تم میری

کہانی سُنو۔ تو مَیں سچ سچ کہہ دوں۔" مَیں نے پھر کہا۔ تم سراسر غلط سمجھے۔ مَیں اوباش نہیں ہَیں تو صرف وطن کی خبریں سُننے تمہارے پاس آئی تھی۔

اُس نے یقین نہ کیا۔ وہ نہایت دلیری سے میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ مَیں نے ہنس کر کہا۔ "چونکہ تم میرا حکم نہیں مانتے۔ مَیں چلی جاتی ہوں۔ خُدا حافظ"

یہ کہہ کر مَیں کھڑی ہوگئی۔ مجھ کو سنجیدہ پاکر وہ مایوس ہوگیا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مَیں نے زور سے چھڑایا مگر مُسکراتی رہی۔ اور کہا تم بڑے بُرے آدمی ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مَیں آوارہ عورت ہوں۔ یہ کہہ کر مَیں دروازہ کی طرف چلی۔ میرے خاوند نے ...... مجھے یہ لفظ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ مجھے زور سے روک لیا اور کہا خُدا کے واسطے نہ جاؤ۔ میری حالت پر رحم کرو۔ مَیں تمہارے حسن پر مر رہا ہوں۔ مَیں واپس پھری اور کہا۔ "افسوس۔ تم نے مجھے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ اس میں شک نہیں کہ مَیں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ اور نہیں کہتے ہوئے کسی قدر محسوس کرتی ہوں۔ مگر کر ہی کیا سکتی ہوں۔ ایک عورت کا خزانہ اس کی پاکدامنی ہے کیا مَیں ایک دن کے عیش کی خاطر تمام عمر کا رنج و شرم خرید لوں۔ مجھے جانے دو۔"

اُس نے چلّا کر کہا۔ "خدا کی قسم۔ ساری عمر تمہیں سینے سے لگا کر رکھونگا۔"

مَیں نے ہنس کر کہا۔ ایسی قسموں پہ اعتبار نہیں۔ مَیں پھر چلی اور دروازے پر پہنچ گئی۔ وہ دوڑ کر میرے پاؤں پر گر پڑا۔ اور مجھے ٹھیرا لیا۔ اس کی نازک حالت دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہُوا۔ مَیں نے کہا چلو تمہارے مکان پر چلیں۔

وہ فوراً تیار ہوگیا۔ اس کا مکان نزدیک ہی تھا۔ ہم دونوں وہاں چلے گئے۔ دو کمرے تھے۔ مَیں نے جلدی سے ایک کمرے میں جاکر اندر سے چٹخنی لگادی۔ وہ بیچارہ باہر رہ گیا۔ اُس نے بڑی التجائیں اور درخواستیں کیں خوشامدیں کیں۔ مَیں نے ہنس کر کہا۔ مَیں تمہارے قبضے میں ہوں مگر دیکھوں تمہارے جوشِ اشتیاق کا طوفان کل صبح تک خشک تو نہیں ہوجاتا۔ اب چلے جاؤ۔ خُدا حافظ۔

دن چڑھے مَیں نے دروازہ کھولا۔ وہ دروازے پر منتظر تھا۔ مَیں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ میرے آقا یا تو مجھے رام دت بابو کے پاس واپس بھیجدو یا ایک ہفتہ میرے نزدیک نہ آؤ۔ یہ تمہارے صبر و استقلال کا امتحان ہے۔

میرا خاوند اس بہادرانہ آزمائش کے لئے تیار ہوگیا۔

(۷)

خُدا تعالےٰ نے جو جو اسباب مردوں کو ستانے اور ان کا جی جلانے کے لئے ہماری جنس کو عطا کئے ہیں۔ مَیں نے

ایک ہفتہ کے عرصے میں سب استعمال کئے۔ خود ایک عورت ہو کر کس طرح عورتوں کے مکر و فریب بیان کروں۔ اگر بتقاضائے بشریت مجھے معلوم نہ ہوتا کہ مرد کس طرح جوش میں لایا جاتا ہے۔ تو کل رات اس کے دل میں اس قدر شوق کیوں تھا۔ مگر میں نے یہ آگ کس طرح لگائی۔ کس طرح اس کو بھڑکایا۔ اور چالاکی سے اپنے خاوند کے دل میں جلن پیدا کی۔ ان کے بیان کرنے میں حیا مانع ہے۔

اگر میری کسی بہن کو مردوں کے شہید کرنے کا اتفاق ہوا ہو اور وہ اس میں کامیاب ہوئی ہو۔ وہ سمجھ لیگی۔ اگر کسی مرد کو اس جان قبض کرنے والے فرشتے کے ہاتھوں مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ اس کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ کیا ہم عورتیں اس عذاب جان جہان میں کانٹے نہیں۔ کیا یہ امر صحیح نہیں کہ دنیا نے مردوں کی نسبت عورتوں سے زیادہ نقصان اٹھاتے ہیں۔ ہماری جنس لطیف کو اپنی طاقتوں کا اندازہ نہیں لگا۔ ورنہ زمین کا تختہ کبھی کا جلکر خاک سیاہ ہو گیا ہوتا۔

دوران آزمائش میں میں ہر وقت اپنے خاوند کے ہمراہ رہتی۔ محبت آمیز الفاظ میں گفتگو کرتی۔ خرافات سے احتراز کرتی۔ تبسّم، دزدیدہ نگاہیں، شوخی۔ ادائیں۔ کیا ہماری جنس لطیف کے لئے ہتھیار نہیں۔ پہلے دن میں ہمدرد تھی۔ دوسرے دن الفت کا اظہار کیا۔ تیسرے دن اس کے خانگی معاملات کا ملاحظہ کیا۔ اس کے کھانے پینے سونے کا معقول انتظام کیا۔ بے شرمی کی انتہا۔ ایک دن میں رو پڑی۔ اور رونے کی وجہ بیان کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر اس کے ذہن نشین کر دیا۔ کہ مجھے خوف ہے کہ ہفتہ کے بعد اس کا جوش ٹھنڈا ہو جائیگا۔ ایک دن وہ بیمار ہو گیا۔ میں ساری رات اسکے سرہانے بیٹھی تیمارداری میں مصروف رہی۔ میں اس کو چاہنے لگی تھی۔ کیا یہ کہنا جائز ہے۔ کہ ایک ہفتہ کے بعد اس سے اسقدر الفت ہو گئی۔ کہ اگر وہ مجھ کو مار کر نکالنا چاہتا تب بھی میں نہ جاتی۔ اس نے میری صحبت کا لطف اٹھانے کی خاطر سارا کاروبار ترک کر دیا۔ جب میں گھر کے کام میں مصروف ہوتی۔ وہ بچوں کی طرح میرے پیچھے پیچھے پھرتا۔ قدم قدم پر میں اس کے روز افزوں اشتیاق کو محسوس کرتی۔ آخرکار اس کی یہ حالت ہو گئی۔ کہ وہ میرے قدموں کو چومتا۔ اپنے عجز و انکسار کا اظہار کرتا۔ اگر میں اس کو اس حالت میں چھوڑ جاتی تو وہ ضرور میرے عشق میں دیوانہ ہو جاتا۔

آزمائش کے آخری دن میں رو پڑی۔ اور کہا "میرے پیارے، میں نے تمہارے ساتھ آنے میں سخت غلطی کی۔ میں نے خواہ مخواہ تمہیں تکلیف دی۔ یہ آزمائش بھی ایک بیوقوفی تھی۔ آدمی کی خواہشات نفسانی پر کس کو اعتبار ہے۔ آٹھ دن تم مجھ سے محبت کرتے رہے ہو۔ مگر کیا وثوق سے کہہ سکتے ہو کہ آٹھ ماہ بعد اسی طرح محبت کرو گے۔ اگر تم مجھے نکال دو

وہ ہنستا ہوا کھڑا ہوگیا۔ "اگر یہی فکر ہے تو میں تمہاری
تسلّی کئے دیتی ہوں۔ مجھے پہلے ہی سے خیال تھا میں تمہارے
گزارے کی مستقل سبیل نکالتا ہوں۔

میں تو ایسا چاہتی ہی تھی۔ یہ سُنکر بہت خوش ہوئی
اور کہا۔

اُف اگر تم مجھے چھوڑ دوگے تو میں روپیہ لیکر کیا کرونگی۔
ایک عورت بھیک مانگ کر گزارہ کر سکتی ہے۔ اس حالت
میں تو زندہ رہنا گوارا بھی نہیں کرونگی۔ میں چاہتی ہوں۔
تمہاری طرف سے مجھے اطمینان ہو جائے۔ کہ تم ساری عمر
مجھے نہ چھوڑوگے۔

اس نے پوچھا تم کیا چاہتی ہو۔

میں عورت ہوں مجھے ان باتوں کی کیا سمجھ ہے۔

یہ کہہ کر میں نے گفتگو کا پہلو بدل دیا۔ اور ایک ایسے
آدمی کا قصہ بیان کر دیا جس نے اپنی ساری جائداد بیوی
کے نام لکھوا دی تھی۔

اس نے گاڑی منگوائی اور چلا گیا۔ سارے ہفتہ میں
گھر سے باہر جانے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ جب شام کو واپس
آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا۔

"یہ لو میری جائداد کا قبالہ"

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کو مجھ سے اس قدر
محبت تھی۔ میں نے اس کے قدم پکڑ لئے۔ اور کہا۔ آج سے
میں تمہاری زر خرید لونڈی ہوں۔ آزمائش ختم ہو گئی ہے۔

(۸)

اب میں فخریہ کہہ سکتی تھی۔ کہ وہ چاند جس کی مجھے جستجو
تھی میرے ہاتھ میں ہے۔

اب وہ مجھے کس طرح چھوڑ سکتا ہے۔ وہ کہتا تھا۔ کہ
مجھے بطور بیوی کے نہ رکھیگا۔ واقعی میرا مقصد جس کے لئے
میں نے مکر کا جال بچھایا تھا۔ پورا ہو گیا۔ اب اگر میں اس
کو بتا دوں کہ میں اس کی بیوی ہوں۔ اور وہ مجھے چھوڑ
دے تو وہ . . . . .

میرے باپ نے میرا نام لکشمی کے نام پر اندرا رکھا
تھا۔ میری ماں مجھ کو کمودنی کہا کرتی۔ سسرال والے
مجھے اندرا کہکر پکارتے۔ گھر پر سب لوگ کمودنی کہتے۔ رام بابو
کو بھی میں نے یہی نام بتایا تھا۔ میرے خاوند کو بھی یہی نام
یاد تھا۔ اور یہی نام ہبہ نامہ میں درج ہوا۔

ہم نے کلکتہ میں چند روز خوشی سے گزارے۔ مگر میں نے
اپنا پتہ نہ بتایا۔ ارادہ کیا کہ مہیش پور چلکر بتاؤنگی۔ ایکدن
میں نے کہا۔ میں اپنے والدین سے ملنے کالادیگی جانا
چاہتی ہوں۔

وہ مجھ سے ایک لمحہ بھی علیحدہ نہیں ہوتا تھا۔ میرے بغیر
کس طرح زندہ رہیگا۔ مگر وہ انکار نہ کر سکا۔ صرف اتنا کہا۔
تمہیں وہاں آنے جانے میں دو ہفتے لگ جائینگے میں اکیلا

مر جاؤنگا۔ مَیں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔
مَیں نے کہا۔ "مگر تم وہاں کہاں ٹھہروگے؟"
اُس نے پوچھا۔ تم کتنا عرصہ وہاں رہوگی؟"
مَیں نے کہا۔ اکیلی تو پانچ دن سے زیادہ نہ رہونگی۔
اُس نے کہا۔ تو مَیں پانچ دن کے لئے اپنے گھر چلا جاؤنگا۔ پانچویں دن آجاؤنگا۔
صلاح پختہ ہوگئی۔ ہم پالکیوں میں سوار ہوگئے۔ جب ہم جھیل سے گذر کر کالادیگی پہنچے۔ تو میرا خاوند اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔
مَیں نے کہاروں سے کہا "مجھے پہلے مہیش پور لے چلو"
وہ مجھے میری جنم بھومی میں لے گئے۔ کہاروں کو باہر چھوڑ کر مَیں پیدل گاؤں میں داخل ہُوئی۔ جب پُرانا گھر نظر پڑا تو فرطِ انبساط سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے مَیں گھر میں گئی تو پہلا شخص جو مجھے ملا۔ میرا بُوڑھا باپ تھا مَیں اس کے قدموں پر گر پڑی۔ جب اُس نے اپنی گمشدہ لڑکی کو پالیا۔ تو وہ خوشی کے مارے جامے میں پھولا نہ سمایا۔ مَیں ان واقعات کی تفصیل نہیں دیتی۔ اور کس طرح ایسی متبرک اور پاکیزہ امور کا ذکر کروں۔ مَیں نے انہیں یہ تو نہ بتایا کہ مَیں اتنا عرصہ کہاں رہی اور کیا کرتی رہی۔
اگلے دن میرے باپ نے میرے سسرال کیطرف خط لکھا۔ اور قاصد سے کہا۔ اگر میرا داماد گھر پر نہ ہو تو اُسے تلاش کر کے یہ خط اس کے ہاتھ میں دینا۔"
مَیں نے اپنی ماں سے کہا۔ میرے آنے کی کسی کو خبر نہ ہو۔ ورنہ وہ یہاں آنے سے انکار کر دیگا۔ کسی اور بہانے سے بلاؤ۔
ماں نے میرے باپ سے اس بات کا ذکر کیا۔ اور وُہ میری تجویز پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ اُس نے لکھا۔ "مَیں ایک وصیت کرنے والا ہوں۔ تم میرے عزیز اور خیر خواہ ہو۔ میں اس معاملہ میں تم سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ جسقدر جلد ہوسکے آجاؤ۔"
میرا خاوند فوراً آپہنچا۔ اور میرے باپ نے سب کچھ راست راست بیان کر دیا۔ میرا خاوند کچھ عرصہ سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ مَیں آپ کو بزرگ سمجھتا ہوں۔ مگر آپ کی لڑکی گھر سے بہت عرصہ غائب رہی۔ پتہ نہیں۔ کہاں رہی۔ کیا کرتی رہی۔ افسوس ہے کہ مَیں اُسے اپنے گھر نہیں لیجا سکتا۔
میرے باپ کو سخت رنج ہُوا۔ اُس نے میری ماں کو اطلاع دی۔ اُس نے مجھے بتا دیا۔ مَیں نے ان سے کہا۔ کوئی فکر نہ کرو۔ اس کو میرے پاس لے آؤ مَیں اس سے نپٹ لونگی۔
مگر اُس نے صاف انکار کر دیا۔
آخر کار میری ماں کے رونے اور میری سہیلیوں کے

کہنے سُننے سے اس کا دل پسیج گیا۔ اور وہ کھانے کے لئے اندر آگیا۔ وہ سر جھکائے کھانے میں مشغول تھا۔ مَیں چپکے سے اس کے پیچھے جا کھڑی ہُوئی۔ اور اُس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھدیا۔

اُس نے ہنس کر کہا۔ شاید تم کامنی ہو۔ (کامنی میری چھوٹی بہن کا نام تھا)

مَیں نے کہا۔ مَیں کامنی نہیں۔ بتاؤ مَیں کون ہوں۔

میری آواز پر وہ چونک پڑا۔ اور جلدی سے پُوچھا کون ہے؟

مَیں دوڑ کر اس کے سامنے آکھڑی ہُوئی۔ اور کہا۔

" فریبیوں کی سردار۔ اندرا۔ ہرموہن دت کی لڑکی۔ یہ میرے والدین کا گھر ہے۔ آپ کی دوست کمودنی کا کیا حال ہے۔

وہ چپ تھا۔ مگر مجھے دیکھ کر خوش تھا۔

اُس نے کہا۔ کمودنی! یہ کیا مذاق ہے۔ تم یہاں کس طرح آگئیں۔

مَیں نے کہا۔ کمودنی بھی میرا ہی نام ہے۔ تم عجب احمق ہو کہ مجھے نہ پہچانا۔ مَیں نے تو تمہیں اسی وقت پہچان لیا تھا۔ جب تم رام دت کے ہاں کھانا کھانے بیٹھے تھے۔

میرے پیارے خاوند آپ کی بیوی آوارہ نہیں۔

کچھ عرصہ وہ بالکل خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا۔ تم نے اتنا عرصہ مجھے کیوں دھوکا دیا۔

جواب آسان تھا۔ پہلے دِن جب تم سے میری ملاقات ہُوئی۔ تم نے کہا تھا۔ کہ اپنی بیوی کو نہ آنے دوگے۔ ورنہ مَیں نے کبھی کا بتا دیا ہوتا۔

ہبہ نامہ میرے دامن میں لپٹا ہُوا تھا۔ مَیں نے گرہ کھولکر کاغذ دکھایا۔

" ہبہ نامہ کا مطلب پُورا ہوگیا۔ یہ کہہ کر مَیں نے کاغذ پھاڑ دیا۔

اُس نے اٹھ کر مجھے بغل میں دبا لیا۔ اور کہا " میری عزیز۔ میری پیاری۔ تم میری ہو۔ مَیں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آؤ۔ اور میرے گھر کی۔ میرے جان ومال کی۔ اور میرے دِل کی مالک بن کر رہو۔

(ترجمہ)

ولی مینی

تجلّیاتِ اختر

تھا ازل سے نورِ حق دل میں نہاں ۔۔۔ جب سے میں جو تندہ ہوں یابندہ ہوں

لے چلی آخر قضا جانا پڑا ۔۔۔ کیا کروں مردہ بدست زندہ ہوں

اختر

بیوی کی موت

دامانِ قیامت میرے ہاتھوں سے لپٹ جا
او چرخِ ستمگر میرے نالوں سے اُلٹ جا
اے جانِ حزیں جسم سے آنکھوں میں سمٹ جا
اے عمر اگر باقی ہے کچھ بیچ سے کٹ جا
اِک نزع کا فوٹو ہے جو سینے پہ دھرا ہے
کس کا دم آخر میری آنکھوں میں بھرا ہے

اُٹھنے کو ہے پردا سا کچھ اب رازِ نہاں کا
جب صبر کی طاقت نہیں پھر صبر کہاں کا
دِل کو تو بہت روتے تھے اب رونا ہے جاں کا
یہ حشر دوبارہ ہے میری مشقِ فغاں کا
اب دم پہ بنی آکے کہ دمساز کا غم ہے
سب بھید کھلا جاتا ہے ہمراز کا غم ہے

وہ حشر دوبالا - وہ قیامت - ہمہ تن ناز
وہ دلبر و دلدادہ - وہ دلسوز - وہ دمساز
غمخوار - وفادار وہ ہمدرد وہ ہمراز
میں عاشقِ دلریش تو وہ عاشقِ جانباز
معشوق تھے پر عشق کے کچھ ڈھنگ جدا تھے
میں اُن پہ جو قربان تھا تو وہ مجھ پہ فدا تھے

بیتاب تھے کیا عشق و محبت کی ہوس میں
قابو میں اگر میں تھا تو وہ تھے میرے بس میں
اِک دن نہ ہوا تفرقہ اٹھارہ برس میں
مدت سے یہ دو بلبلیں تھیں ایک قفس میں
آباد کیا گلشنِ فردوس کو کس نے
میرے لئے چھوڑا میرے افسوس کو کس نے

تسکین مجھے دیتے رہے بیمار تھے جب سے
ہاتھوں سے اشاروں سے کبھی جنبشِ لب سے
بگڑی ہوئی صورت تو ہے کچھ ایک ہی شب سے
جو آنکھ تھی میری طرف اب پھرتی ہے سب سے
سرمہ کی جگہ اشک اب آنکھوں میں بھرے ہیں
جو ہاتھ تھے گردن میں وہ چھاتی پہ دھرے ہیں

تاثیر دوا میں - نہ دعاؤں میں اثر ہے
سر کا ہوا زانو سے میرے کس لئے سر ہے
کیا سچ ہے؟ کہ مرنے کی تمہیں اپنے خبر ہے
کیوں میری طرف دیکھ کے حسرت کی نظر ہے
کیا جی پہ بنی آکے کہ دم توڑ رہے ہو
"کیا میں نے کہا" ہاتھ یہ کیوں جوڑ رہے ہو

رفتار تھی جن کی کہ قیامت کو اُبھارے
افسوس ہے اب اُٹھتے ہیں ہاتھوں کے سہارے
نقاشِ اجل نے جو خط و خال سنوارے
ٹھنڈے ہُوتے ساکت ہُوتے شوخی کے نظارے
خاموش دمِ نزع ہو حیرت ہے جبیں پر
تصویر بنے تم تو اُترنے کو زمیں پر

کہہ لے دلِ بیتاب نظارا کوئی دم ہے
ہے یہ بھی ادا گردنِ نازک میں جو خم ہے
مرجاؤں مَیں کیا بھولی سی صورت پہ ستم ہے
ہمراہ ہوں مَیں بھی جو تمنّائے عدم ہے
اب طائرِ جاں اُڑنے کو پر تول رہا ہے
یہ قلقلِ مینا ہے کہ کف بول رہا ہے

آنسو نکل آتے ہیں جدائی میں کسی کی
خاموش ہو کس کے لئے کچھ تو کہو جی کی
تسکین مجھے دیتے تھے یہ بات ابھی کی
اب چہرۂ پُر نور کی تنویر ہے پھیکی
کیوں مائلِ پرواز ہے اب رنگ بدل کے
نازک ہے بدن پیکِ اجل دیکھ سنبھل کے

اے آہ دمِ نزع وہ خود اُٹھ کے سنبھلنا
وہ دیکھ کے میری طرف اشکوں کا نکلنا
ناصح کے ہاتھوں میں رُکا نبض کا چلنا
تھا شوخیِ آہو کی طرح آنکھ بدلنا
اندھیر قیامت کا ہُوا سب کی نظر میں
سر کھُل گئے اور حشر کا غُل پڑ گیا گھر میں

مَیں کیا کہوں کیا تھے دمِ آخر کے نظارے
بگڑے ہُوتے تیور بھی تھے سنورے ہوئے سارے
اُلجھے ہُوئے وہ مانگ کے بالوں میں ستارے
رخساروں پہ "پتے" تھے جھکے بوجھ کے مارے
گردن میں گلوبند گلا گھونٹ رہا تھا
وہ ہار تھا یا سانپ کوئی لوٹ رہا تھا

ہل ہل کے گرے پڑتے تھے وہ کان کے بالے
بن بن کے بگڑ جاتے تھے جوں ماہ کے ہالے
وہ خود ہی سنبھلتے نہ تھے پھر کون سنبھالے
بیہوش تھے بیتاب تھے سر پیٹنے والے
رفتار کو روکا مرے پاؤں کے چھڑوں نے
ہاتھوں کو نہ اُٹھنے دیا سونے کے کڑوں نے

آنکھوں میں لہو میرے اندھیرا تھا نظر میں
اور زور سے دابے ہوئے دل پھرتا تھا گھر میں
سینے میں نیا زخم۔ نیا درد جگر میں
دیوار نے پھینکا تو گرا آکے مَیں در میں
دامن سے چھپاتے ہوئے آنکھوں کو جبیں کو
منہ ڈھانپ کے روتا تھا بُتِ پردہ نشیں کو

کہتا تھا کہ اُٹھو بھی سحر ہونے کو آئی
لو صبح قیامت بھی تمہیں رونے کو آئی
اور رحمتِ حق آخری مُنہ دھونے کو آئی
لینے کو اجل تم کو۔ مجھے کھونے کو آئی
دیکھو میری پیاری تمہیں اب شرم ہے کن سے
وہ سامنے روتے ہیں کھڑے پردہ تھا جن سے

شرماتے ہُوئے کس سے ہو چتون تو اُبھارو
پھر ملنے کا وعدہ تو کرو ہاتھ تو مارو
رُخساروں پہ بکھرے ہُوئے گیسو تو سنوارو
اب غسل کا وقت آگیا زیور تو اُتارو
شانہ تو کرو میری پریشانی کو دیکھو
آئینہ کہاں ہے میری حیرانی کو دیکھو

آنکھوں کے بدلنے میں بھی اِک شرم و حیا تھی
اُنگلی کے پھڑکنے میں اشاروں کی ادا تھی
ہر اِک دمِ حسرت میں بھری بُوئے وفا تھی
ہر سانس میں لپٹی ہُوئی جنّت کی ہوا تھی
کافر کے دمِ نزع بھی اک ناز تھا پیدا
گردن کے ڈھلکنے میں بھی انداز تھا پیدا

تھا خاک پہ گُل کی طرح کمہلانا بدن کا
دو ہاتھ زمیں پر تھا پڑا ڈھیر چمن کا
اب ہائے وہ چُپ ہونا بُتِ غنچہ دہن کا
طاقت تھی اشاروں کی نہ یارا تھا سخن کا
دِل کی طرح پہلو میں مِرے رُکے چلے ہو
کچھ سُن کے چلے اور نہ کچھ کر کے چلے ہو

وہ سادگی سے زلف کا چہرے پہ بکھرنا
وہ آخری جوڑے کا سجاوٹ سے سنورنا
سامانِ وصال۔ اور جوانی کا یہ مرنا
وعدہ تھا۔ مگر جانتے تھے تم تو مکرنا
مَیں دیکھتا تھا جن کو شب و روز سجا کے
چھوڑا ملک الموت نے چھاتی سے لگا کے

کیوں سرد ہیں دہارے رواں کچھ نہیں کہتے
کیوں آگئی گلشن پہ خزاں کچھ نہیں کہتے
پھرتی نہیں کیوں مُنہ میں زباں کچھ نہیں کہتے
کیا ہو گیا اب اے مِری جاں کچھ نہیں کہتے
لب بند ہیں تقریر کا انداز کہاں ہے
جنبش ہی نہیں جسم میں اب ناز کہاں ہے

لو دِن نکل آیا ہے مِری مہ جبیں اُٹھو
چق پڑ گئی دالان میں پردہ نشیں اُٹھو
ہاں شعلۂ دلسوز کی جانِ حزیں اُٹھو
لے آیا ہوں میں غسل کو پانی کہیں اُٹھو
اُٹھنے کا جو یارا نہ ہو چادر ہی اُٹھا لو
لپٹے ہُوئے آبِ چہِ زمزم سے نہا لو

اے کب کے انیندے تھے یہ کیا نیند ہے پیاری — لو اُٹھو چلو آگئی اب سیج کے سواری
محشر کا ہے اِک شور دمِ گریہ و زاری — لاشہ ہے کوئی بیچ میں کہرام ہے بھاری
کیا شوق ہُوا؟ سیرِ گلستانِ جہاں کا — مُنہ کھول کے کچھ تو کہو ہے عزم کہاں کا
حاضر ہُوا پوشاک کا جوڑا یہ پہن لو — دُلہن میری جاں اور بھی اِک بار تو بن لو
آراستہ اب ہو گیا نک سُک سے بدن لو — پردہ ہے تو چادر کے عوض اوڑھ کفن لو
نازک بدن اِک سُرخ دوشالے میں چھپا لو — مہکا ہُوا تابوت ہے۔ پھولوں میں بسا لو
لینے کے لئے اُٹھا ہے رضوان متواتر — حورانِ بہشتی ہیں در خلد پہ حاضر
لمبا ہے سفر تم صفِ ماتم میں گئے گھر — لو جاؤ میری پیاری خُدا حافظ و ناصر
صورت بھی دکھاؤ گے کبھی جلد بلا کے — جس طرح سے جاتے ہو مجھے پیٹھ دکھا کے
او بارِ نزاکت ذرا لاشے کو سنبھالے — او رنگِ حنا پاؤں سے بوجھ اپنا اُٹھا لے
او نگہتِ گل دوش پہ تابوت اُٹھالے — جنبش نہ ہو کاندھا میرے کاندھے سے ملا لے
مہکی ہوئی پھولوں کی طرح بو ہے کفن کی — دُنیا سے سواری گئی کس رشکِ چمن کی
اے آہ کروں کیا کہ غم پردہ نشیں ہے — آواز سے رونے کی مجھے تاب نہیں ہے
ویرانہ میں بیٹھا ہوں مکاں ہے نہ مکیں ہے — گھر چھوڑ دوں کیسے تیرے مرنے کی زمیں ہے

کاشانہ میرا بنتے ہی ویرانہ ہُوا ہے
جو عیش کا کمرہ تھا عزاخانہ ہُوا ہے

برکت شیر خاں ادیب میرٹھی

رازِ بیخودی

تاسف ہے اُن لوگوں کی آرزوئے دید پر، جو تجھے بے حجاب سمجھ کر بیہوش ہو جاتے ہیں۔ مجھے دیکھ میں پہروں بیخود رہتا ہوں صرف اس لئے کہ تیری بے حجابی کا یقین نہیں۔ کاش میں تجھے بے حجاب دیکھتا۔ اور ہوشیاروں میں شمار ہوتا۔ حفیظ

موتیوں کا ہار

بہروز نے برآمدہ میں پاؤں کی چاپ سُنی۔ اس سے پیشتر کہ وہ راہِ فرار اختیار کرے کمرہ کا دروازہ کھلا۔ وہ برقی قمقمہ جسے اُس نے چاپ سُنتے ہی بُجھا دیا تھا۔ بُجھتے ہی معاً روشن ہو گیا۔ کیونکہ ناہید نے کمرہ میں داخل ہوتے ہی بٹن دبا دیا تھا اب بہروز سمجھ گیا کہ بھاگنے کی کوشش بیسود ہے۔ اگر وہ ناہید کو گرا کر برآمدہ سے بھاگ بھی جاتا تو ناہید اسے ملازموں کی مدد سے گرفتار کرا سکتی تھی۔ علاوہ بریں بہروز جس فن کا ماہر تھا وہ اُسے اجازت نہ دیتا تھا۔ کہ ایسے وقت میں بھاگنے کی کوشش کرے۔ بالخصوص جبکہ ناہید جیسی زہرہ جبیں سے بدسلوکی کرنی پڑتی تھی۔ ناہید کو اڑ کپڑے بُت بنی کھڑی رہی اُس کے کندھوں پر قیمتی شال بتا رہا تھا۔ کہ وہ کسی تقریب سے واپس آئی ہے۔

محوِ حیرت ہونے کے باوجود چور نے ناہید کے حسن کیف انگیز کا اثر محسوس کیا۔

جب اس آنی استعجاب کی حالت دُور ہُوئی تو بہروز نے کہا " ہماری اس غیر متوقع ملاقات کی مسرت میرے لئے یقیناً ذخیرہ حیات ہے "

ناہید بہروز کی بات پر توجہ نہ دیتے ہوئے بولی " اگر تم نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو مَیں ملازموں کو بُلا کر ایک لمحہ میں تمہاری مشکیں کسوا دُونگی۔ اور اس کمرے سے نکلنے کا دروازہ بھی یہی ہے جہاں مَیں کھڑی ہوں۔"

ناہید نے اس وقت غیر معمولی شجاعت اور استقلال کا اظہار کیا تھا۔

بہروز نے قدرے لاابالیانہ لہجہ میں جواب دیا " آپکا یہ خیال غلط ہے کہ مَیں یہاں سے نکل نہیں سکتا۔ اگر مَیں چاہوں تو نکل جا سکتا ہوں۔ لیکن تم جیسی خاتون پر دست درازی کرنا اپنی مردانگی کی توہین سمجھتا ہوں۔ باقی رہے ملازم ان سے نپٹنا میرے لئے چنداں دشوار نہیں۔ آپ دیکھتی ہیں کہ مَیں اس وقت خوش وضع شریفانہ لباس پہنے ہُوئے ہوں۔ وہ خیال کرینگے کہ کوئی معزز ملاقاتی ہے اور جبتک آپ کے چند ملازم چور کی تلاش میں مصروف رہینگے۔ دوسرے ملازم میرے لئے گاڑی لا کر کھڑی کر دینگے "

ناہید نے حیرت سے کہا۔ " تمہارا لب و لہجہ تو تعلیمیافتہ لوگوں کا سا ہے۔"

" ہاں مَیں نے خاصی تعلیم پائی ہے۔ اور اپنے والدین

کا بہت سا سرمایہ اس بے فیض تعلیم پر غارت کر چکا ہوں۔"
"پھر تم ان کمینہ جرائم کے مرتکب کیوں ہوتے ہو؟"
"میں نہایت ادب سے آپ کی مخالفت کرتا ہوں۔
آپ دیکھ رہی ہیں کہ چوری خطرات سے خالی نہیں ہے اس کے لئے بھی خاص مہارت اور چابکدستی کی ضرورت ہے۔
اور خواہ آپ اس میں کوئی نکتہ چینی کریں۔ مگر آپ اسے کمینگی نہیں کہہ سکتیں۔"
"کیا تم میرے موتیوں کے ہار کی تلاش میں نہ تھے؟"
"یقیناً" "مگر وہ آپ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ بیمہ شدہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے اصول کے مطابق ایک سرمایہ دار کمپنی کی شے چرا رہا ہوں جس کے چوری جانے سے آپ کی ذات کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔ پچاس ہزار کی حقیر رقم جو آپ کے ہار کی قیمت ہے۔ بیمہ کمپنی کو بھی ناقابل برداشت خسارہ نہیں ہو سکتا۔"
"خیر تمہاری محنت تو رائگاں گئی۔ تم ایک ہفتہ میں بھی ہار تلاش نہیں کر سکتے۔"
"مجھے تلاش کرتے ایک گھنٹہ ہو گیا ہے۔ اگر ہار کو اتنی احتیاط سے نہ چھپایا ہوتا۔ تو میں اسے لیکر کبھی کا چلا گیا ہوتا۔"
ناہید نے رکتے رکتے کہا۔ "مگر تم ایسی حرکات کیوں کرتے ہو؟"
بہروز (کرخت لہجہ میں) "کیا آپ میری دائم المریض بیوی کی

سرمایہ سوز علالت کے دلشکن اور روح فرسا حالات سننے کی منتظر ہیں۔ مگر میری تو بیوی ہی نہیں۔ تاہم میری قوت متخیلہ حسب ضرورت فسانہ تراش سکتی ہے۔"
"مگر میں تو صحیح اور سچے حالات سننا چاہتی ہوں۔"
"اگر تم اپنے حالات نہیں بتاتے تو میں ابھی تمہیں پکڑوا دیتی ہوں۔"
"اگر آپ شور کرینگی تو مجھے قدرے سختی سے کام لینا پڑیگا۔ جس سے میں نفرت کرتا ہوں۔ بالخصوص جبکہ آپ جیسی خاتون سے پالا پڑا ہو۔ آپ سچ سننا چاہتی ہیں۔ مگر آپ اُسے پسند نہ کرینگی۔" بہروز نے ایک لمحہ کے بعد کہا۔ "میں چوری کرتا ہوں۔ کیونکہ کسی اور ذریعہ معاش کی نسبت اس طرح زیادہ کما سکتا ہوں۔ میں اُن لوگوں پر ہاتھ صاف نہیں کرتا جن کی ذات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ بس اس نفرت انگیز پیشہ کی یہی ایک خوبی ہے۔"
ناہید نے سختی سے کہا۔ "کیا تمہیں اپنی حرکات پر شرم نہیں آتی؟"
کہنے کو تو ناہید نے کہدیا۔ مگر وہ خود اپنے اس جملہ کے ضعف معانی کو محسوس کر رہی تھی۔
"معزز خاتون میں! میں طفل شیر خوار نہیں ہوں۔ میں دنیا میں صعب ترین کام میں لگا ہوا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ایک نہ ایک دن ضرور پکڑا جاؤنگا۔ پھر

"مگر تم اپنی اصلاح کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟"

بہروز نے استعجاب انگیز لہجہ میں کہا۔ "اور اصلاح کر کے . . . . . ؟"

"ایک معزز شخص بن جاؤ گے عزت ہی دنیا میں سب سے بڑی شے ہے۔"

"افسوس ہے کہ میں نہایت ناقابل اصلاح بدمعاش ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی ناٹک گھر میں ملازم ہو جاؤں۔ مگر خوش وضع ایکٹروں اور خوش گلو ایکٹرسوں کے مقابلے میں مجھے ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔"

باوجود احساس نفرت کے ناہید کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اُس نے کہا۔ "تم بھی کیسے عجیب آدمی ہو!"

اس تعریف سے کیا حاصل بہرکیف چونکہ آپ نے میرے آج کے کام میں رخنہ اندازی کی ہے۔ اس لئے اب مجھے اُسے از سر نو شروع کرنا پڑیگا۔"

"مگر میں تمہیں چھوڑنے کب لگی ہوں۔"

"ہاں یہ تو آپ نے کہا کہ آپ مجھے جانے نہ دینگی مگر جہانتک مجھے نسوانی فطرت کا علم ہے میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھے ہرگز گرفتار نہ کرائیں گی۔ کیا آپ مجھے مجرموں کے لباس میں دیکھتی ہیں؟"

"خیر اتنی باتیں بنانے سے کیا حاصل۔ خدانخواستہ اگر میرا خاوند آگیا تو کیا کہیگا؟"

"یقیناً وہ بھی ایک حیرت انگیز منظر ہوگا۔ چنانچہ ایک مرتبہ عجیب لطف انگیز واقعہ پیش آیا۔ مالکہ مکان کا خاوند شکی مزاج آدمی تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آپ کھڑی ہیں وہ بھی میرا راستہ روکے کھڑی تھی۔ کہ اُس کا خاوند آگیا اور اُس نے اپنی بیوی کو ہلاک کرنا چاہا۔ جوش رقابت میں وہ یقین نہ کرتا تھا۔ کہ میں چور ہوں۔ آخرکار جب میں نے اپنے آلات سرقہ نکالکر دکھائے تو اُسے قدرے اطمینان ہوا کہ اس نے مجھے شکریہ کے ساتھ چھوڑ دیا۔ ورنہ میری خوش وضعی کی بدولت بیچاری عورت کا خون ہوگیا ہوتا۔"

ناہید نے لڑکھڑا کر کہا۔ "بہتر ہے کہ تم ابھی میرے کمرہ سے نکل جاؤ ایسا نہ ہو کہ میرا ارادہ بدل جائے۔"

"اچھا میں جاتا ہوں ہماری اس ملاقات کی لطف انگیز یاد میرے ذہن میں ہر وقت تازہ رہیگی۔ مگر عرصۂ دنیا تنگ ہے اس لئے ممکن ہے کہ ہم پھر بھی کبھی ملیں۔" یہ کہہ کر بہروز ناہید کو تعجب زا تنہائی میں چھوڑ کر نہایت بے باکی سے کمرہ سے نکل گیا۔

اُس کے جاتے ہی جب ناہید نے غور کیا تو وہ اپنی اس حرکت پر نہایت تاسف کرنے لگی۔ اُف! کیسی غلطی ہوئی میں نے اسے گرفتار کیوں نہ کرا دیا۔ ناہید مسحورانہ انداز سے کمرہ کی طرف بڑھی گویا بہروز کے مردانہ حسن کے تصور نے کیف سحر طاری کر دیا ہے۔ بیٹھتے ہی وہ پھر کمرہ سے اُٹھی اور دریچہ سے

نیچے جھانکنے لگی۔ مگر بہروز جا چکا تھا! وہ سوچنے لگی ایک نہ ایک
روز ضرور پکڑا جائیگا۔ مگر اُس کی جرأت واقعی قابلِ داد ہے۔
میں کمرے میں داخل ہوئی تو اُس نے مُڑ کر دیکھا مگر شکن جبیں
سے اضطراب کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوتی تھی کس بلا کا حوصلہ
ہے! اُس نے کہا تو سچ اگر میرا ہار لے جاتا تو میرا کیا نقصان
ہوتا کمپنی ہی کو اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی۔ مگر نہیں! میں نے
غلطی کی کہ اُسے جانے دیا۔ چوری خواہ کسی کی ہو بُری ہوتی
ہے۔ اور چوری دیکھتے ہوئے چور کو پکڑوانا اخلاقی گناہ ہے
جب ناہید کا سلسلہ خیال یہاں پہنچا تو اس کی جبین سے
چند قطرات ندامت ٹپکے۔ جو برقی روشنی میں ستاروں کا جھومر
معلوم ہوتے تھے! اب وہ پھر کسی خیال سے کرسی سے اُٹھی،
اور الماری کی طرف بڑھی۔ جہاں اُس نے اپنا ہار رکھا ہُوا
تھا۔ دروازہ کھولا تو ہار ندارد تھا۔

ناہید نے لرزتے ہُوئے کہا۔ "اف اس قدر ظلم" میرا
ہار جیب میں ڈال کر مجھی سے باتیں بنا کر چمپت ہو گیا! میں نے
کیسی حماقت کی۔ گرفتار کیوں نہ کرا دیا۔ قریب تھا کہ غیظ و غضب
کے جذبات آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے نکل پڑتے کہ
دروازہ پر کسی نے دستک دی۔

ناہید اُٹھی جب اُس نے دروازہ کھولا تو بہروز تھا!
اُس نے ناہید کو ہار دیتے ہُوئے کہا۔ "افسوس ہے کہ میں
نے آپ کو چند لمحوں کے لئے اس قدر رنجیدہ کر دیا۔ آپ کی
شرافت میرے ضمیر پر بار گراں ثابت ہوئی۔ اس نے مجھے
مجبور کر دیا کہ میں آپ کا ہار واپس کر دوں میں احسان فراموش
نہیں ہوں۔"

ناہید بہروز کی اس غیر متوقع واپسی سے اسقدر حیرت زدہ
ہوئی کہ اُس نے ہار پکڑنے کے لئے محض اضطراری حرکت
سے کام لیا۔ ایک لمحہ کے بعد جب اُس کے حواس بجا ہُوئے
تو ناہید نے کہا۔ "تو کیا تم اپنی اصلاح نہیں کر سکتے؟
تم خود کہہ چکے ہو کہ تم ایک نہ ایک دن پکڑے جاؤ گے۔ پھر تم
بچنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ اگر میں اپنے خاوند کو
کہوں تو وہ تمہارے لئے کوئی ۔۔۔۔۔۔۔"

بہروز نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں! نہیں!!
میں پختہ مغز بدمعاش ہوں۔ اب میں سیدھا نہیں ہو سکتا
اچھا الوداع۔"

یہ کہہ کر بہروز ناہید کے جواب کا انتظار کئے بغیر
جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے چلا گیا۔

بہروز کو گئے ابھی ایک گھنٹہ نہ ہُوا تھا کہ ناہید کا خاوند
آ گیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ خلافِ معمول ناہید ابھی تک
سوئی نہیں! اُس نے پُوچھا "خیریت تو ہے؟ تم ابھی تک
کیوں جاگ رہی ہو؟"

"میرا دل سخت پریشان ہے"

"کیوں کیا ہو گیا؟"

"یہاں سے ابھی ابھی ایک چور گیا ہے۔"

"ہیں! چور؟"

"ہاں نہایت حیرتناک آدمی تھا۔"

اونہہ کیا حماقت ہے چور یہاں کس طرح آ گیا۔ تم نے نوکروں کو کہہ کر کیوں نہ پکڑوا دیا۔"

"لیکن میں نہیں کہتی تو ہوں کہ وہ نہایت شریف آدمی تھا"

"سٹرن تو نہیں ہو گئی ہو! چور اور شریف؟" "مگر وہ ہار تو نہیں لے گیا؟"

ہاں لے گیا تھا۔ مگر حیرت تو یہی ہے کہ وہ واپس بھی دے گیا ہے۔" ناہید نے ہار نکال کر اپنے خاوند کو دکھایا۔

"اُف تم کسقدر پریشان کرتی ہو۔ تم نے نوکروں سے کیوں نہ گرفتار کرا دیا۔ تاکہ وہ ہار لے جا ہی نہ سکتا۔ تم نے اُسے چھوڑ دیا۔ اب وہ کسی اور کے ہاں چوری کریگا۔"

ناہید نے تن کر کہا۔ "مجھے اس کی پروا نہیں۔ مَیں خوش ہوں کہ مَیں نے اُسے گرفتار نہ کرا دیا۔ کیونکہ وہ میرا ہار واپس دے گیا ہے۔

ناہید کے خاوند نے سلسلۂ کلام کو مختصر کرتے ہُوئے اپنے لاابالیانہ تبسّم سے ناہید کے بازو کو پکڑ کر کہا۔

"چور نے پہچان لیا تھا کہ ہار جھوٹے موتیوں کا ہے!"

پورن سنگھ ہنر امرتسری

غزل

مقصودِ تمنّا ہے۔ اِک جلوۂ جانانہ
کچھ اس سے نہیں مطلب کعبہ ہو کہ بتخانہ

ہاں اے نگہِ ساقی حیرت نہ رہے باقی
گردش میں رہے ساغر چلتا رہے پیمانہ

تم اپنی اداؤں کو للہ یہ سمجھا دو
ہوں بندہ نوازی سے اتنی بھی نہ بیگانہ

سرمستِ محبت کی ہستی بھی ہے کیا ہستی
یا خویش فراموشی یا نالۂ مستانہ

اب وقفِ ستم کیوں ہے محرومِ کرم کیوں ہے
وہ دل کہ رہا برسوں ظالم تیرا کاشانہ

محرومِ تمنّا ہوں۔ مایوسِ تقاضا ہوں
اتنا میرا قصّہ ہے اتنا میرا افسانہ

نشہ مئے اُلفت کا مٹ کر بھی نہیں جاتا
گر دیدۂ ساقی ہوں۔ خاکِ درِ میخانہ

پھر دیکھئے محفل میں بیٹھا ہے بشیر آ کر
وہ آپ کا شیدائی وہ آپ کا مستانہ

طلسمی دھنک

(گزشتہ سے پیوستہ)

مَیں۔ نہیں تو (ہنسکر) جرجی کا شکریہ۔ اسوقت بھی تھوڑی سی گلخپ کرنے چلی آئی تھی۔

حکیم صاحب۔ آؤ۔ آگ کے پاس بیٹھ جاؤ۔ اور کہہ چلو۔ کیا دیکھا ہے؟

مَیں نے علمی اصطلاحات کے ساتھ اپنی رام کہانی دُہرا ڈالی

حکیم صاحب (میرے ختم کرتے ہی) نہایت خوب۔ مگر وہ تصویر ہے کہاں؟

مَیں۔ جرجی کے پاس۔ صاحب تصویر کا پتہ چلانے لے گئے ہیں۔

حکیم صاحب۔ آج اتوار ہے۔ کیا کام چلے گا۔ کاش آجاتے تو مَیں بھی دیکھ لیتا۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ خود جرجی صاحب بھی آگئے۔ اور آتے ہی تصویر میری طرف اُچھال دی۔

مَیں۔ خیر تو ہے؟

جرجی۔ پس پشت۔

مَیں نے تصویر پلٹی۔ پشت پر حسب ذیل عبارت پنسل سے لکھی ہوئی تھی۔

زرافشاں خاتون۔ فریدوں پناہ کروڑ پتی۔ ایرانی تاجر رکن مجلس درآمد و برآمد کی اکلوتی بیٹی۔ ۱۳۲ حضرت گنج

حکیم بطلیموس۔ خوب اور کچھ

جرجی۔ مجھے اپنے ایک ہمعصر مدیر سے معلوم ہوا ہے کہ یہ ایرانی کروڑ پتی اپنی لڑکی کو اس خیال سے لکھنؤ لایا تھا کہ یہاں اسکے خداداد حسن سے ہلچل مچ جائیگی۔ جو یقینی تھی ہوا یہ کہ دوشیزہ حسن اتفاق سے اپنے ایک ہموطن قانونی مشیر پر عاشق ہے جو دماغی خزانوں کا بادشاہ ہے۔ مگر نام کو کوڑی بھی نہیں۔ باپ کی تمنا تھی کہ یہاں کسی شریف بادشاہ زادے سے پیوند کرے۔ مگر آج کئی دن سے افواہ ہے کہ صاحبزادی صاحبہ اپنے حبیب کے ساتھ فرار ہو چکی ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے۔ کہ خوش نصیب داماد صاحب اپنے زبردستی کے خسر سے ملنے کے لئے کئی ناکامیاب کوششیں فرما چکے ہیں۔

حکیم بطلیموس صاحب میرے شانے پر سہارا دئے ہوئے آہستہ آہستہ گرانباری سے اُٹھے اور میرے ساتھ ہو لئے۔ ہم دونوں محمودی گنبد میں پہنچکر کرسیوں پر بیٹھے اور

آس پاس کی گنگا جمنی نگاہ پرور دیواروں کو ایک ٹک دیکھنے لگے۔ سفید دیواروں کا اجلا پن تھوڑی ہی دیر میں گہرے زعفرانی رنگ کا ہوگیا۔ مَیں سانس روک کر چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اب کی بار پھر وہی سنہرا دروازہ نظر پڑا۔ مگر پوری لمبان چوڑان سے۔ دروازہ کے اس طرف ایک خمیدہ پشت بُوڑھا کھڑا ہمیں گھور رہا تھا۔ جس کا چہرہ شال دیوانگی میں لپٹا ہُوا تھا۔ اور آگ برساتی ہُوئی دھندلی آنکھیں، جنوں کی دو جیتی جاگتی تصویریں بنی ہُوئی تھیں۔

غالباً مَیں چیخ مار کر بیہوش ہوگئی ہونگی۔ جب حواس درست ہُوئے تو مَیں نے محسوس کیا کہ حکیم صاحب میرے شانے ہلا رہے ہیں۔

بازغہ اب اٹھو باہر چلیں۔ کُھلی ہوا میں طبیعت درست ہو جائیگی۔"

ایک دس ہی منٹ میں ہم لوگ ۱۳۳۴ حضرت گنج پہنچ گئے۔ دروازہ پر ایک بلند بالا نوجوان پولیس والوں سے کچھ کہہ رہا تھا۔

حکیم صاحب (دیکھتے ہی) غالباً یہی ہمارے مشیر قانونی دوست حضرت محتشم ہیں۔

یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنے نام کا پرچہ بھجوایا۔ جس پر داہنی طرف حکیم "بطلیموس" اور بائیں جانب "کار خاص" لکھا ہُوا تھا۔ اور ہم لوگ فوراً ہی اندر بلوائے گئے۔

فریدوں پناہ۔ (جسیم مُسن بزرگ) مَیں آپ کے نام سے مانوس تو ضرور ہوں۔ مگر پہلے کبھی شرف نیاز حاصل نہیں ہُوا۔

حکیم صاحب۔ کبھی نہیں تشریف رکھئے۔

کروڑ پتی میزبان مہمان کی زبانی یہ رسمیہ جملہ سُن کر ظرافت آمیز طور سے چونک تو ضرور اُٹھا۔ مگر فوراً حسب الحکم بیٹھ بھی گیا۔

حکیم صاحب۔ ہم آپ کی صاحبزادی کے معاملہ میں آئے ہیں۔

فریدوں (طنز یہ نفرت سے) غالباً اس ناشاد اور اس بدنصیب محتشم کی سفارش کے لئے۔ پہلے اتنا سُن لیجئے۔ کہ اب وہ میری لڑکی نہیں رہ گئی۔ اور اگر کبھی . . . .

حکیم صاحب۔ بس کافی ہے (مُسکرا کر) کیا آپ کسی ایسے کبڑے بوڑھے سے واقف ہیں۔ جس کا رنگ گہرا سیاہی مائل اور ٹھڈی اکہری ہو۔

فریدوں پناہ۔ اسقلیوس ؟ وہ تو میرا خاص الخاص دوست ہے۔ اُنہوں نے ہرگز میری لڑکی کو کچھ بھی . . . .

حکیم صاحب۔ وہ ہیں کہاں ؟

فریدوں پناہ۔ سچ تو یوں ہے کہ اس وقت بغل والے کمرہ میں موجود ہیں۔ مگر مَیں پھر کہتا ہوں کہ محض بے تعلق ہیں بلکہ مَیں اس معاملہ میں ان کے بے لوث ہمدردانہ سلوک کا شرمندہ احسان ہوں۔ میری اکلوتی لڑکی میرے لئے . . . .

حکیم صاحب۔ مہربانی فرما کر اُن کو بلوائیے۔ اور کہہ دیجئے کہ کل تک آپ کسی ضروری کام سے میرے ساتھ جا رہے ہیں۔

فریدوں پناہ نے یکے بعد دیگرے ہم سب کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھا۔ جھجکے سوچے۔ آخر گھنٹی بجا ہی دی۔ کبڑے صاحب تشریف لائے۔ میں حیران رہ گئی۔ چہرہ اس وقت بالکل ہی بھلے مانسوں کی طرح تھا۔ دیوانگی کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ فریدوں پناہ نے ہماری امیدوں کے خلاف نہایت ستھرے لفظوں میں اپنے دوست کو جو کچھ سمجھانا تھا سمجھا دیا۔

کبڑے صاحب۔ عزیز محترم۔ بہت خوب۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ (مسکرا کر) شب بخیر خدا حافظ اور چلدیئے۔

حکیم صاحب (تحکم سے) اچھا اب ہم تعاقب میں روانہ ہونگے۔ آپ اور فریدوں پناہ صاحب پولیس کو ساتھ لیکر (کان میں آہستہ سے کچھ بتا کر) وہاں چلے آئیے گا۔

جیسے ہی کبڑے صاحب کی موٹر گاڑی نگاہوں سے اوجھل ہوئی۔ ہم تینوں بھی موٹر پر بیٹھ کر تعاقب میں روانہ ہوئے اگلی گاڑی ایک چوراہے پر رکی۔ ہم بھی رک رہے۔ اسقلیوس صاحب اُتر کر پاؤں پیدل روانہ ہوئے۔ ہم بھی تھوڑے فاصلہ کے ساتھ پیچھے پیچھے چلے۔ کبڑے نے ایک معمولی مکان کے سامنے جو بظاہر گودام یا بھٹی معلوم ہوتا تھا اپنی جیب سے کنجی نکالی۔ دروازہ کھولا۔ اندر گئے۔ اور پھر دروازہ بند کر دیا۔ اب ہم کیا کرتے مجبوراً باہر ہی "انجمن رزمیہ" مقرر کی مشورے کرنے لگے۔ اتنے میں اچانک ایک آدمی دروازہ کھولکر باہر آیا۔ اور پھر مقفل کرنا ہی چاہتا تھا کہ حکیم بطلیموس نے نہایت پھرتی کے ساتھ پورا زور صرف کر کے ان صاحب کو فرش زمین کر دیا۔ اور چشم زدن میں ہم تینوں اندر پہنچ گئے۔ جرجی نے جھپٹ کر اندر کی کنڈی چڑھا دی۔ حکیم بطلیموس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اس سرے والا دروازہ کھولا اور یکایک دو قدم پیچھے آپڑے۔ میں پنجوں کے بل تنکر موصوف کے کاندھوں پر زنخداں رکھ کر دیکھنے لگی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ سامنے وہی سنہرا دروازہ سنگ مرمر کی دیوار میں نصب ہے

ہم نے چپ چاپ نگاہیں بدلیں۔ جرجی نے بڑھکر دونوں پٹ آزمائے۔ مگر دروازہ کو نہ ہلنا تھا نہ ہلا۔ اب ہم دیوار کے پہلو میں کچھم کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ پچیس تیس قدموں کے بعد آبدارخانہ ملا۔ قہقہہ کی آواز سنائی دی۔ ہم لوگ بے جان بے زبان ہو کر کھڑے ہو گئے۔ سامنے "کمرہ خاص" کا دروازہ تھا۔ جس پر رنگین شیشوں کا نفیس کام کیا ہوا تھا۔ ہم نے جوش سے ہانپتے ہوئے اپنے گال شیشوں سے لگا دئے۔ سانس لینے کی آوازیں محسوس ہونے لگیں۔ میں نے اپنے ہونٹ زور سے کاٹ لئے کہ اگر لبوں سے چیخ نکل گئی۔ تو ساری کی کرائی چوپٹ جائیگی۔ اسقلیوس

ایک عیش افزا گدے دار کرسی پر ہماری طرف پیٹھ کئے ہوئے بیٹھا تھا۔ سارا کمرہ طلائی ساز و سامان کی کثرت سے سونے کی کان معلوم ہو رہا تھا۔ زبردست کھمبوں پر زعفرانی ریشمی پردے منڈھے ہوئے تھے۔ زمین پر دبیز ترکی زعفرانی قالینوں کا بہترین فرش تھا جس پر بہت سی لڑکیاں بسنتی زعفرانی جوڑے پہنے بیٹھی تھیں۔ کمرے کے اس سرے پر ایک بڑی سی سیاہ رنگ کی آرام کرسی سجی ہوئی تھی۔ جس پر زرافشاں خاتون اس طور سے لیٹی ہوئی تھی کہ دلفریب چہرہ نازک ہاتھوں میں چھپا ہوا تھا۔ اور گول مول شانے بھاری ہچکیوں سے ہلتے جا رہے تھے۔ سارا لباس زعفرانی تھا بغل میں ایک پختہ کالے رنگ کا موٹا تازہ حبشی زعفرانی وردی پہنے کھڑا تھا۔ جس کے ایک ہاتھ میں پانی کا جام اور دوسرے میں طلائی پنکھا تھا۔

بھلا اب حکیم صاحب کو تاب کہاں۔ فوراً دروازہ کھول کر اندر ہو رہے۔ مفرزی اسقلیبوس کو پیچھے سے پکڑ کر مشکیں کس کر باندھ دیں۔ ابتو کو بڑا اور زیادہ نمایاں ہو گیا۔ حبشی نے پیچیدہ سیڑھیوں کی راہیں بتائیں۔ اور زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ میں زرافشاں خاتون اپنے باپ کے گھر سلامتی سے پہنچ گئیں۔ جہاں ہم نے کچھ سوچ کر تھوڑی دیر کے لئے، طالب و مطلوب محتشم و زرافشاں کو خلوت میں تنہا چھوڑ دیا۔ جس کی مخالفت فریدوں پناہ نے بھی نہیں کی۔

تیسرا رنگ ارغوانی

میں حکیم بطلیموس کے پاس بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھی۔ کہ خادمہ نے ایک پرچہ لاکر دیا۔ جسے موصوف نے لیتے ہی میری طرف سرکا دیا۔ ذرا نام تو پہچانئے۔

میں۔ سردار جہاں۔ میں تو نہیں جانتی۔

حکیم صاحب۔ بازغہ شاید تم نے ادھر کئی دن سے اخبار نہیں دیکھے۔ پائیں پا اخباروں کا ڈھیر تھا جس میں انہوں نے "نئی روشنی" کا تازہ نمبر نکال کر دیا۔ اسے پڑھو۔

مجھے عنوان دیکھتے ہی یاد آگیا۔ کہ کل ہی یہ نام دیکھ چکی ہوں "امین آباد مصورہ میں قتل" میں بول اُٹھی۔ ہاں گلفام جہاں تو زیر حراست ہے۔

حکیم صاحب۔ غالباً یہ اُن کی بہن ہیں۔ دیکھوں کیا فرماتی ہیں۔

میں۔ کیا تنہائی مطلوب ہے۔ میں باہر چلی جاؤں

حکیم صاحب۔ نہیں۔

سردار جہاں صاحبہ بلوائی گئیں۔ بلند بالا۔ چھریرا بدن خوبصورت چہرہ۔ سیاہ زلف، سیاہ چشم اور حسب امید زرد و جوشیلی تھیں۔ جیسا حکیم صاحب نے خیال فرمایا تھا واقعی یہ خاتون گلفام جہاں کی بہن نکلیں۔ جو ایک زبردست الزام کے ماتحت زیر حراست تھیں۔ میں آپ کے پاس اپنی بہن کے

معاملہ میں آئی ہوں۔ آپ نے سُنا ہو گا۔ اخباروں میں پڑھا ہو گا۔ کہ وہ ایک مُصوّر بہزاد نمبرہ امین آباد مصوّرہ کے الزام قتل میں زیر حراست ہے۔

حکیم صاحب (ہمدردی سے) بیٹھئے۔ حواس درست کیجئے اور آپ جو کچھ چاہتی ہوں بلا تکلف کہہ گزرئے۔

سردار جہان۔ منگل کی شام کو میں اپنی بہن کے انتظار میں کھانا لئے بیٹھی تھی۔ کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ دو جاسوس اور ایک پولیس انسپکٹر تشریف لائے۔ انہوں نے گلفام کو پوچھا میں نے کہہ دیا کہ باہر گئی ہیں۔ پوچھنے لگے کہ روزانہ کس وقت واپس آتی ہیں۔ میں نے کہا کہ آج معمول سے زیادہ دیر ہو گئی ہے۔ انہیں صدر بازار سے ایک جوڑا جرابیں خریدنا تھیں۔ ہم لوگ رکاب گنج میں رہتے ہیں۔ اسی وقت گلفام بھی سیڑھیوں سے تیز تیز دوڑتی ہوئی آئی۔ اور یکے بعد دیگرے ہم سب کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ان تینوں میں سے جو شخص بول رہا تھا۔ اس نے ایک طرف سرک کر میری بہن سے اندر آنے کے لئے کہا۔ وہ اندر آ گئیں۔ انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔ پھر اس آدمی نے پوچھا کیا آپ ہی کا نام گلفام جہان ہے؟ گلفام نے کہا۔ بیشک۔ ہاں۔ حضور۔ متکلم نے جواب دیا کہ ہم لوگ پولیس افسر ہیں تمہیں بہزاد مُصوّر نمبرہ امین آباد مصوّرہ کے الزام قتل میں گرفتار کرتے ہیں۔ گلفام فرط حیرت سے دیوانی سی ہو گئی۔ پھر قہقہہ مار کر ہنسی اور کہنے لگی۔ مگر میں ان کو ابھی ایک گھنٹہ گزرا مصورہ میں چھوڑ کر آئی ہوں۔

میں نے ان لوگوں کو پھرتی سے تبادلہ نگاہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اور سمجھ گئی۔ کہ میری نادان بہن گو معصوم سہی بیگناہ سہی مگر اس نے بے سوچے سمجھے ایک خوفناک اقرار کر لیا ہے۔ بہر حال وہ لوگ گلفام کو لے گئے۔ اور اب وہ نظر بند ہے۔

یہ کہہ کر زار زار رونے لگی۔

حکیم صاحب۔ اپنی بہن کی خاطر سے اپنے کو سنبھالئے۔ تو ہمیں ان کی بیگناہی اور رہا کرا لینے کا یقین ہے گو ان کے لئے نظر بندی کی ایک ایک گھڑی پہاڑ ہو گی۔ اچھا یہ تو بتائیے کہ آپ بہزاد صاحب کو محض بہزاد کیوں کہتی ہیں۔ اس سے تو صاف حقارت کا اظہار ہوتا ہے۔

سردار جہان۔ بات یہ ہے کہ وہ گلفام کی چشمان مست کھینچنے کے لئے انہیں اکثر اپنے سامنے بٹھایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ عشق ہو گیا۔ ایک بار اس نے شادی کرنے کی التجا بھی کی میری مایوس و مغموم بہن نے صاف انکار کر دیا۔ تو قتل کی دھمکیاں دینے لگا۔

گلفام ہمیشہ ان باتوں پر مضحکہ سے ہنس ڈالتی تھی۔

حکیم صاحب۔ یہ ابتک سمجھ میں نہیں آیا۔ کہ تمہاری بہن آخر کس بنا پر گرفتار کی گئی۔

سردار جہان۔ بنا۔؟ یہی کہ وہ مقتول کے پاس سب سے آخر میں جاتے آتے ہوئے دیکھی گئی تھی۔

حکیم بطلیموس۔ میں نے سُنا ہے کہ بہزاد کے سر سے گولی پار ہُوئی تھی۔ تپنچہ کہاں چلا؟

سردار جہان (خفیف سی چونک کر) ہاں گلے دروازہ کے بالکل سامنے۔

حکیم صاحب (تیز نگاہیں ڈال کر) کس کا تھا۔ کہاں سے آیا تھا۔

سردار جہان (اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کر) گلفام کا تھا۔

حکیم صاحب۔ طبیعت سنبھالئے۔ ان کے پاس تپنچہ کیوں آیا اور وہ اسے مصوّرہ میں کیوں لے گئیں۔

سردار جہان۔ خالو نے دیا تھا۔ ہم لوگ لیسنس سے مستثنےٰ ہیں۔ گلفام خود حیران ہے۔ کہ وہاں کیسے پہنچ گیا۔ وہ کہتی ہے کہ میں تپنچہ لیکر تصویر کھنچوانے کے لئے اپنے مصوّر دوست مانی صاحب کے پاس گئی تھی۔

حکیم صاحب۔ اور غالباً وہیں چھوڑ آئیں تھیں۔

سردار جہان۔ جی ہاں۔ طے یہ ہُوا تھا کہ جب تک ضرورت نہ ہو تپنچہ مانی صاحب کے پاس رہے۔

حکیم صاحب۔ یہ صاحب کہاں ہیں۔

سردار جہان۔ امریکہ میں تھے خبر سُنکر آئے ہُوئے ہیں۔

حکیم صاحب۔ تپنچہ انہیں کے کمرہ یا تصویر خانہ میں مقفل تھا۔ کم سے کم گلفام کو تو اس کا یقین ہے۔

سردار جہان۔ ہاں انہیں بالکل یقین ہے۔ میں۔ اور ضروری سامان؟ کیا اُنھوں نے تپنچہ کے ساتھ کارتوس وغیرہ بھی وہیں رکھ دیتے تھے۔

سردار جہان۔ گلفام کے پاس کارتوس تھے ہی نہیں عجیب بات یہ ہوئی کہ گلفام والے سنگاردان میں کچھ خالی کارتوس پائے گئے۔ جو تپنچہ کی نلی میں ٹھیک ٹھیک آ جاتے ہیں۔ اور وہ گولی بھی جو دیوار سے نکالی گئی ہے خالی کارتوس میں پُوری پوری بیٹھ جاتی ہے۔

حکیم صاحب۔ اچھا اب آپ رخصت ہوجایئے۔ شام کو پھر تشریف لایئے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کی بہن بیگناہ ہے

کوئی گھنٹہ بھر بعد مجھے لئے ہُوئے کوتوال شہر کے ساتھ حکیم بطلیموس صاحب اس مصوّرہ میں پہنچ گئے۔ جہاں واقعہ قتل ظہور میں آیا تھا۔

موصوف اس تصویر خانہ میں دیوانوں کی طرح ہر چیز کو دیکھ بھال رہے تھے۔ اور لبوں ہی لبوں میں کہتے جا رہے تھے۔ خودکشی ...... میں محسوس کرتا ہوں ......

مجھے معلوم ہوتا ہے۔ کوتوال شہر کا خیال تھا کہ حکیم صاحب دیوانہ ہوگئے ہیں۔ سب دروازے بھیڑ دیے گئے۔ کمرہ میں اچھا خاصہ اندھیرا ہوگیا۔ دس منٹ بعد یکایک ایک گوشہ سے ارغوانی رنگ کے ہلکے ہلکے شعلے نکلے۔ جنہوں نے کمرہ کے دُھندلکے کو ایک مدھم سی خونی روشنی سے بدل دیا

اب وہی ارغوانی شعلے آپس میں ٹکراتے جدا ہوتے۔ بل کھاتے
بگولہ کی طرح بلند ہوتے۔ اور اس میں سے ایک شعلہ تن آدمی
آگ کی پھنکاریاں مارتا ہوا کود پڑا۔ آنکھیں انگاروں کی طرح
دہک رہی تھیں۔ اس انسانی روپ والے شعلہ جوالہ نے
ایک طرف کی دیوار پر زور زور سے سر ٹکرانا شروع کیا۔
ہر بار دھندلی فضا۔ بے شمار چنگاریوں کا مخزن بن جاتی
تھیں۔ اور سر میں خالی نشان پڑتے جاتے تھے۔ یہاں تک
کہ ساری کھوپری ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی۔ داہنے ہاتھ میں
تپنچہ دکھائی دیا۔ لبلبی دبنے کی آواز سنی گئی۔ زمین سے ہوا
طلسمی ہستی دھماکے کے ساتھ زمین پر گری اور غائب ہو گئی۔
میں نے اپنے چہرہ پر ایک سرد برفانی ہاتھ محسوس کیا۔
کانپ گئی اور چیخ اٹھی۔ مگر یہ ہاتھ کوتوال شہر کا تھا جو روشنی
کرنے کا بٹن ڈھونڈ رہے تھے۔ بٹن دبا برقی قمقمہ ایکبارگی
جل اٹھے۔

حکیم صاحب (مسکرا کر) آخر ثابت ہو گیا خودکشی ہی تھی
کہ نہیں۔ بازغہ تم نے بھی دیکھا۔

ہم دونوں (ایک زبان ہو کر) دیکھا تو ہے مگر کچھ سمجھے
نہیں۔ موصوف نے مجھ سے ایک کرسی منگوائی اور اسی دیوار
سے لگا کر چڑھ گئے۔ تھوڑی دیر تک انگلیاں اِدھر اُدھر
پھراتے رہے۔ اور آخیر میں ایک سوئی ملی جسے انہوں نے
دبا کر داہنی طرف سرکا دیا۔ ہم حیران رہ گئے ایک پورا چوکور
پتھر دُہرا ہو کر اوپر کی طرف اٹھ گیا۔

حکیم صاحب نے کھڑکی میں ہاتھ ڈالا۔ نئی کھڑکی سے
کاغذ کا پرچہ نکالا۔ اور ایک تپنچہ جو ربڑ کے ایک لمبے فیتے
میں بندھا ہوا تھا۔ ہم دونوں اس کاغذ پر جھک پڑے
وصیت نامہ کی عبارت حسب ذیل تھی۔

"جو بھی اس کو پائے سمجھ لے کہ میں مسمی بہزاد نے
کس طرح اپنی محبوبہ گلفام جہان سے اس کے انکار کا بدلہ
لیا۔ انہیں اس لئے مجھ سے نفرت ہے کہ مجھے ان سے
محبت ہے۔ میں نے گلفام کا تپنچہ ان کے دوست مانی صاحب
کے کمرہ سے نکال لیا۔ اور ویسا ہی ایک اور بازار سے خریدا
جس میں اسی ناپ کی گولی ٹھیک آتی تھی۔ ایک چلایا ہوا
خالی کارتوس اُن کے تپنچہ کی نلی میں رکھا اور جیسے ہی وہ
باہر گئیں۔ میں نے اسی کو سڑک پر پھینکدیا۔ خود دوڑ کر اسی
مصوّرہ میں آگیا۔ اور اپنی طلسمی کھڑکی سے اس ربڑ سے
بندھے ہوئے تپنچہ کو نکالا جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اور
داہنی کنپٹی کے پاس لیجا کر کلمہ کی انگلی اور انگوٹھہ کی مدد سے
لبلبی دبا دی۔ گھوڑا چل گیا۔ جب میں گر جاؤنگا تو ربڑ کا
فیتہ تپنچہ کو آپ ہی آپ اندر کھینچ لیگا۔ اور اسی کھچا کھانچی
میں سوئی اُبھر آئیگی۔ کھڑکی بند ہو جائیگی۔"

حکیم بطلیموس۔ بازغہ چلو اب چلیں کوتوال شہر تمام باتوں
کے ذمہ دار ہیں۔

کوتوال شہر۔ میں پہنچتے ہی گلفام جہان کی رہائی کا حکم صدر دفتر سے نکلوا دونگا۔

حکیم صاحب۔ بازغہ مجھے گھر پہنچا دو۔ میں تھک کر چور ہو گیا ہوں۔

چونتھا رنگ آسمانی

حکیم صاحب۔ یہ کون گا رہا ہے ؟

جرجی۔ گا کون رہا ہے ؟ کوئی بھی نہیں

میں۔ خیال تو یہی ہے کہ میں نے بھی سُنا ہے۔ اسی گوشہ سے آئی تھی۔ مدھم زیر و بم کے ساتھ کوئی درد خیز چیز

حکیم صاحب۔ پھر تو کوئی نہ کوئی ضرور تھا۔

تھوڑی دیر کے لئے ہمہ تن گوش بنے ہوئے آواز کا انتظار کرتے رہے۔ مگر جرجی کو یقین تھا کہ ہم لوگ خواب دیکھ رہے ہیں۔

جرجی۔ ممکن ہے کوئی شخص سڑک پر گاتا ہوا گزرا ہو یا کوئی بیفکری نوکرانی شاگرد پیشہ میں الاپی ہو۔

میں (چلّا کر) سُنئے۔ پھر آرہی ہے۔

حکیم بطلیموس صاحب سرو قد اُٹھ کھڑے ہوتے چہرہ سے نمایاں دلچسپی ظاہر تھی۔ موسیقی پہلے کی طرح پھر بند ہوگئی کہنے لگے۔ " میرے خیال میں ابکے اور قریب سے آواز آئی تھی۔

جرجی۔ کوئی شخص باغیچہ میں ہوگا۔ یا جیسا میں کہہ چکا ہوں کوئی خادمہ ہوگی۔

میں (یقین دلا کر) نوکرنیوں میں کوئی بھی نہ تھی۔ اور ایسی بھیانک رات میں باغیچہ میں کون ہونے لگا۔

حکیم صاحب۔ کچھ سی۔ نہایت عجیب موسیقی تھی۔ اب بالکل بند ہوگئی۔

مجھ پر اس کا اثر بہت گہرا پڑا۔ مانا کہ کوئی گزرنے والا ہی ہو اور ہوا کی کسی عجیب قوت نے اس کی آواز غیر معمولی رفتار کے ساتھ ہم تک پہنچا دی ہو۔ پھر بھی راگ اتنا دردانگیز تھا کہ میری رگوں میں کپکپی سی دوڑ گئی تھی۔

میں۔ اب گھر جاؤنگی۔

حکیم صاحب۔ کیسے ممکن ہے کہ اس طوفانی رات میں تمہیں گھر جانے . . . .

میں۔ سنئے ؟ (چیخ کر) سنئے ؟ یکایک ساری جان میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ گھڑی تو ہو گئی۔ مگر بید لرزاں کی طرح تھر تھرا رہی تھی۔

حکیم صاحب (میری کلائی پر ہاتھ رکھ کر) بازغہ طبیعت سنبھالو۔ اور اسی وقت موسیقی بند ہوگئی۔

میں۔ کیا آپ نے نہیں سُنا ؟

حکیم صاحب۔ سُنا کیوں نہیں ؟ کوئی شخص سڑک پر ہوگا۔

(باقی باقی)

تصویرِ یار

تیری ہستی مایۂ راحت ہے اے تصویرِ یار — تو رسا کی جان ہے تجھ پر رسا کا دل نثار

تختۂ کاغذ پہ تیرا روئے رنگیں بے نقاب — آب ساکن پر ہے گویا عکسِ قرصِ آفتاب

حُسنِ یوسف سے نہیں کچھ کم ترا حسن و جمال — عالمِ تصویر میں ہے آپ تو اپنی مثال

تیرا اندازِ تبسم کسقدر ہے دلفریب — چھین لیتا ہے دلِ مشتاق سے صبر و شکیب

دیکھ کر روئے زمیں پر تیرا حُسنِ لاجواب — پانی پانی ہو رہا ہے آسماں پر ماہتاب

ہیں عیاں تیرے رُخِ روشن سے تنویراتِ راز — یا کھلے ہیں حُسن کے گلزار میں گلہائے ناز

جلوہ افشاں ہے جبینِ ناز سے تنویرِ حسن — تو مرے دلبر کی ہے تصویر یا تصویرِ حُسن

تو سراپا ناز ہے بیشک سراپا ناز ہے
اِک طلسمِ جانفزا ہے جو ترا انداز ہے

سچ تو یہ ہے اے مری سرمایۂ آرامِ جاں — یار میں بھی وہ نہیں جو تجھ میں دیکھیں خُوبیاں

تو مری ہمدرد ہے، غمخوار ہے، ہمراز ہے — کنجِ تنہائی میں میری مونس و دمساز ہے

تیرے چُپ رہنے میں ہے اِک لذتِ گفت و شنید — تیری خاموشی سے وابستہ ہے دامانِ امید

گو مری باتوں کا تو دیتی نہیں ہے کچھ جواب — جانتا ہوں، تجھ پہ روشن ہے مرا سب اضطراب

کچھ گلہ شکوہ اگر کر لوں خفا ہوتی نہیں — سامنے آنکھوں کے رہتی ہے جُدا ہوتی نہیں

آرزوئے وصل سُن لیتی ہے شرماتی نہیں — بوسۂ رخسار بھی لے لوں تو گھبراتی نہیں

جب کمی ہوتی نہیں دردِ دلِ بیمار میں — تجھ کو سینے سے لگا لیتا ہوں ہجرِ یار میں

وصل تیرا ہے دلِ بیتاب کو وصلِ حبیب
تو ہے بیمارِ محبت کے لئے گویا طبیب

ہوں تصور میں مخاطب تجھ سے اے تصویرِ دوست
جس سے دل کا آئینہ ہے مظہرِ تنویرِ دوست

تو مرے دلبر کی جیتی جاگتی تصویر ہے
تو تصور کے قلم کی شوخیِ تحریر ہے

تجھ کو اس تصویرکش نے کر دیا ہے دلنشیں
رشک صد بہزاد ہے میرا یہ صورت آفریں

یہ تجھے جس رنگ میں بدلے بدل جاتی ہے تو
ہے سراپا نور ہر سانچے میں ڈھل جاتی ہے تو

کیوں نہ ہو تو مجھ کو پیاری کاغذی تصویر سے
پیکرِ آزاد اچھا قیدیِ زنجیر سے

تو خراماں وسعتِ دل میں بصد ناز و ادا
ہو گیا اُس کو لباس کاغذی زنجیرِ پا

اس کے مٹ جانے کا اندیشہ ترا مٹنا محال
حُسن اس کا عارضی ہے حُسن تیرا لازوال

اس کو رونق رنگ سے ہے تجھ کو رونق نور سے
کاغذِ رنگیں کو کیا نسبت چراغِ طور سے

کل شبِ غم دردِ فرقت سے جو میں بیتاب تھا
منتظر پیکِ اجل کا دیدۂ بے خواب تھا

رنجِ ہجراں کیا سہا جاتا دلِ رنجور سے
اشکِ خونیں بہ رہے تھے دیدۂ ناسور سے

ہو چکا تھا بند بامِ عرش پر بابِ قبول
دل شکن مایوسیوں سے تھیں دُعائیں خود ملول

بے اثر ثابت ہُوا جب نالۂ شبگیر بھی
چھٹ گیا دستِ دُعا سے دامنِ تاثیر بھی

ناگہاں اس لطف سے چلنے لگی بادِ مراد
تھم گیا طوفانِ حسرت ہو گیا دل شاد شاد

آگئی دل میں ضیا تیرے رُخِ پُر نور کی
دشتِ ایمن میں پڑیں کرنیں چراغِ طور کی

دیکھ کر تجھ کو ہُوا سرسبز باغِ آرزو
شعلۂ رُخ کر گیا روشن چراغِ آرزو

شاہدِ مقصود ہے تو پیکرِ امید ہے
تیرا نظارہ دلِ حسرت زدہ کو عید ہے

رسا

سردار روق

کیا آپ ہی نواب معف ہیں ؟

"ہاں"

مَیں روق منزل سے آیا ہوں۔ یوں تشریف لایئے۔

ابھی ابھی ایک زبردست سفری طیارہ آسمان سے اُتر چکا تھا۔ پروانہ راہداری کی جانچ، اسباب کا معائنہ، چنگی کا قصہ ختم ہو چکا تھا۔ اور اب تھکے ہوئے مسافر افسرانہ روک ٹوک سے آزاد ہو کر جُدا ہو رہے تھے۔

ایک لانبا آدمی دربانوں کی باقاعدہ وردی پہنے آہنی پشتہ سے بائیں ہاتھ کھڑا مسافروں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ یہ جملے اسی نے آگے بڑھ کے کہے تھے۔

فرد مخاطب ایک کوتاہ قامت انسان تھا۔ جسم پر ایک دبیز پوستین تھی۔ سیاہ قصابہ کنپٹیوں کے پاس سے ہوتا ہوا ٹھڈی تک آیا تھا۔ آنکھیں (جیسی بھی ہوں) بڑے نال کی دہانی عینک میں تھیں۔ جس کی دبنے والی سنہری کمانی اُٹھی ہوئی ناک پر بالکل چسپاں تھی۔ سوکھے ساکھے ہاتھ زرد دستانوں میں پوشیدہ تھے۔ غرض اُٹھی ہوئی ناک اور پتلے لبوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

ان کے عقب میں ایک چوڑا چکلا آدمی تھا جسکے دونوں ہاتھوں میں دو سفری بیگ تھے۔ اس کے بدن پر بھی پوستین تھی۔ مگر ہلکے داموں کی بھرے ہوئے گال نہایت صفائی سے مُنڈے ہوئے تھے۔ صرف اسباب لے کر چلنا خدمتگاری کی سند تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آتے ہوئے ہوائی جہاز میں نواب معف اور ان کے نوکر کے لئے دو خاص و عام نشستیں مخصوص تھیں۔ پست قد آدمی نے وردی پوش کو اشارہ کیا۔ اور "ہوا گھر" (وہ خاص جگہ جہاں ہوائی جہاز اُترتے اور روانہ ہوتے ہیں) سے ہوتا ہوا ایک عمدہ طاقتور ہوا گاڑی (کار) تک پُہنچ گیا جو منتظر کھڑی تھی۔

نواب موصوف اور خاص برادر اندر بیٹھے، دروازہ بند ہوا کار چل نکلی۔ ہوا گاڑی چکنی سڑک پر پھسلتی چلی ہی تھی کہ خادم نے پردے کھول دئیے اور اس طرح نوکر اور آقا اتفاقیہ دیکھ بھال کے شبہ سے بھی مطمئن ہو گئے۔

فرضی نواب کارلک ! حفاظت ہر حال میں اچھی ہے۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ جب یہاں کے تھانہ میں دو ایک میرے بھی روشناس تھے۔ مگر اب نہیں چاہتا کہ ان سے نگاہیں لڑ جائیں۔

جسے کارلک کہکر مخاطب کیا گیا تھا۔ وہ "ہر جانیوالی

بنچ پر مقابل میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے متکلم کی طرف نگاہیں اُٹھائیں اور ایک ہلکی سی جھرجھری لی۔ "کیو! یہ معاملہ خاص تمہارا ہے پھر کیسے دیتا ہوں کہ مجھے لندن آنا ہی پسند نہیں ہے۔"

کیو کا مختصر قہقہہ ہوا گاڑی کی پردہ پوش دنیا میں گونج گیا۔" پھر بھی تمہیں اقرار کرنا ہوگا کہ ابتک تمام باتیں نہایت صفائی سے ہوتی گئیں۔ خیال تو کرو ابھی پرسوں کی بات ہے کہ ہم پیرس میں بُرے پھنسے تھے۔"

کارلک۔ مجھے اقرار ہے کہ تم پیرس میں بُرے پھنسے تھے اب فرانس والی پولیس بھی اس نشیلے سفیدے (کوکین) کی ناجائز لین دین کے معاملہ میں ہوشیار ہو چلی ہے۔ نصیب اچھے تھے کہ تلاشی کے وقت گھر میں جھاڑو پھری ہوئی تھی۔

کیو۔ یہی تو میں بھی بتانا چاہتا تھا۔ تم باہر تھے کیا جانو کیا ہوگیا۔

مخاطب آگے جھک پڑا۔

"سچ تو یہ ہے کہ گھر میں نشیلے سفیدے کا ایک بڑا ڈبہ موجود تھا۔ تم جانتے ہو میں اس تجارت میں بہ نفسِ نفیس شریک نہیں ہوں۔ صرف دلالی کرتا ہوں۔ مگر اس وقت حسنِ اتفاق سے دو ہزار کی مالیت کا سودا پاس تھا۔"

کارلک۔ پھر کیا ہوا۔

(جواب)" تلاشی کے پانچ منٹ پہلے ایک ہوا گاڑی دروازہ پہ آکھڑی ہوئی۔ اندر سے وردی پوش دربان اُترا۔ اور پُرزہ لیئے ہوئے میرے پاس آیا۔ کاغذ کی چٹ پر صرف "سردار روق" لکھا ہوا تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ یاد نہیں آیا۔ بعد میں خیال گزرا کہ میں اس نام کے کسی شخص سے روس میں ایکبار مل چکا ہوں نوکر نے بتایا کہ مالک گاڑی میں موجود نہیں ہیں۔ مگر مجھے یہ ہدایت ہوئی ہے۔ کہ آپ سے بنڈل لے کر حفاظت سے پہنچا دوں۔

میں پہلے اس ہمدردانہ پہیلی کو نہ سمجھ سکا۔ نوکر منتظر ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی میں نے جواب دیا۔ آواز نے کہا کہ میں سردار روق ہوں۔ ابھی ابھی دو منٹ ہوتے پولیس والے خانہ تلاشی کے لئے چل چکے ہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ دوا کے بنڈل کو نوکر کے حوالے کر دیجئے۔

کارلک۔ ممکن ہے دھوکا ہو۔ اصل مقصد یہ ہو کہ تم سے ڈبہ لے لیا جاتے۔

کیو۔ بالکل ٹھیک۔ مگر خود سردار نے کہا۔ یا مجھ پر اعتبار کرو یا یوں ہی رہنے دو۔ جیسا جی چاہے۔

میں نے سردار پر بھروسہ کیا۔ بڑی خیریت ہوگئی بال بال بچ گئے۔ ابھی ہوا گاڑی کو گئے ہوئے میں دقیقہ بھی نہ گزرے تھے کہ حضرات جاسوس بلائے بے درماں کی طرح مجھ غریب پر نازل ہوگئے۔ (مسکراہٹ نے پہلے سوکھے ہونٹ کا بایاں کونا ایک ذرا سا اُٹھا دیا) شام کو ڈبہ واپس مل گیا جسے میں نے اونے پونے چکا لیا۔ دوسری صبح کو سردار کا عجیب

دعوت نامہ پہنچا کہ ہم لوگ مہمان بنکر فرانس سے لندن آجائیں

کارلک۔ آخر کیوں ؟

کیو۔ پتہ نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہم سے تم سے جوبھی رسم بڑہانے اُس کا مقصد آڑاہی ترچھا ہوگا (شانے ہل گئے) سردار نے ہمیں دال دلیا کے لئے ہی سمجھ کے بُلایا ہوگا۔ کہ ہم مجرموں کی برادری میں سرغنہ اور نیکنام ہیں۔

کارلک۔ بھائی کچھ بھی ہو سردار آدمی بہت بانکا ترچھا ہے۔ دیکھو تو ہمارے لمبے چوڑے آسمانی سفر میں پروانہ راہداری وغیرہ کا انتظام چٹکی بجلاتے کرلیا ہے۔

کیو۔ کہو کیسی رہی۔ ابتک تو ہم لوگ نلوہ نکل آئے۔ روکنا کیا معنی کسی نے پُوچھا تک نہیں۔

کارلک۔ مگر یار کوئی پھندا نہ ہو ؟

کیو۔ خود سردار صاحب نے ہمیں دعوت کے لئے مجبور کردیا میں کوئی گھنٹہ بھر ان کے ساتھ رہا ہونگا۔ نہایت بھلے آدمی ہیں۔ ہیں تو فرنگی النسل مگر چہرے پر ہندوستانی رعب داب برستا ہے۔ انوکھی شان البیلی آن بان کا انسان ہے میں لوگوں کو ایسا پرکھتا ہوں جیسے صرّاف اچھے کھوٹے سکّوں کو دیکھتا ہے۔ مگر صاف کہوں سردار ایسا با اثر آدمی نہ دیکھا نہ سُنا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ محض باتوں کے ہیں یا کاروباری آدمی بھی ہیں۔ انتظامات تو یہی کہتے ہیں کہ ہیں نہایت چلتے پُرزے

جس وقت یہ مسافر اپنی منزل پر پہنچے شام ہو چکی تھی۔ ہوا گاڑی سبک روی سے ڈھلوان پشتے پر ہوا سے باتیں کرتی ہوئی چڑھتی اُتری۔ اور درختوں کی جھُرمٹ میں غائب ہوگئی جس کے بعد ایک اُونچے پھاٹک میں زناٹے سے گزری۔ دو رویہ گھنے صندلوں کی درمیانی گذرگاہ پر دوڑتی ہوئی ایک وسیع زمردیں سبزہ زار پر جانکلی جس کے وسط میں ایک قلعہ نما سربلند محل استادہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ کئی صدی ادھر کی عمارت ہے۔ پُرانی طرز کی کھڑکیاں کثرت سے تھیں جہانتک کیو اور کارلک دیکھ سکے روق منزل سنسان تھا۔ اور حد نظر تک کسی طرف نہ کوئی مکان تھا نہ جھونپڑا۔

ایک وردی پوش نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اور دونوں مہمان دہلیز سے ہوتے ہُوتے دھندلے ہال میں آبراجے جہاں سے دوسرا سیاہ پوش خادم سلام کرکے ساتھ ہولیا۔

دونوں اجنبی جوابی ہال سے ہوتے ہُوئے ایک لمبی چوڑی سیڑھی پر پُہنچے۔ جو اتنی وسیع تھی کہ اس پر ایک ساتھ چار آدمی بلا تکلف سینہ بسینہ چڑھ سکتے تھے۔

پہلے محلے پر پُہنچکر اجنبیوں نے دیکھا کہ خمدار غلام گردش سارے مکان میں دوڑی ہُوتی ہے۔ جس میں جا بجا جھروکوں سے روشنی پڑ رہی تھی۔ آخری سرے پر رنگین شیشوں کی ایک جڑاؤ کھڑکی تھی۔ جس سے سیاہ روغنی فرش پر گونا گوں شعاعیں پڑتی تھیں۔ غلام گردش کو طے کرکے ایک دوسرا زینہ ملا۔ جس پر چڑھنے کے بعد ایک تنگ سا راستہ اور تھا انتہائی سرے

پر پہنچکر خادم نے دروازہ کھولا۔ اندر سجی سجائی خوابگاہ موجود تھی۔ اس کی بغل میں ایک دوسرا کمرہ کھولا گیا۔ کیو پہلے میں اور کارلک دوسرے میں ہورہے۔

"معزز حضرات! سردار صاحب نے سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ ٹھیک نو بجے آپ لوگوں سے ملینگے۔ خاصہ سات بجے چن دیا جائیگا۔"

کیو نے کچھ ضروری سوالات کے بعد خادم کو رخصت کردیا۔ اور خود کارلک کے کمرے میں آیا۔ جو نہانے کے بعد محض کرتا پاجامہ میں بیٹھا ہوا لطف غسل اٹھا رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ پرانا محل نئی طرز آرائش کے ساتھ جدید ساز و سامان سے سجایا گیا تھا۔ حمام خانہ کا پورا سامان نہایت اعلیٰ تھا گرم و سرد پانی کے پیتل والے نل، سنگ مرمر کے بیداغ تسلے ہاتھ منہ دھونے کے پھول والے آفتابے بیش قیمت تھے۔ اور سلیقہ سے چنے ہوئے تھے۔ مختصر یہ کہ عیش و آرام کی ساری چیزیں مہیا تھیں۔ کیو کا طائر صفت جسم بیچ کمرے میں آکر رک گیا۔ کارلک نے خموشی سے سر ہلایا اور پوچھنے لگا "تم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ تمہارے مہربان سردار صاحب کروڑپتی ہیں۔ یہاں آکر طبیعت جھک ہوگئی۔

سات سے کچھ پہلے اطلاعی گھنٹی بجی۔ جس کے ساتھ ہی ایک وردی پوش خادم حاضر ہوا۔

حضرات خاصہ تیار ہے۔

دونوں پکے بدمعاش سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے نچلی منزل کے ایک شیشہ دار کمرے میں پہنچے۔ دار الطعام میں صرف دو کے لئے میز بچھی ہوئی تھی تشتریاں کثرت سے تھیں خوش ذائقہ کھانا بڑی عمدگی سے چنا ہوا تھا۔ داہنے ہاتھ انگوری شراب کی سربمہر بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔ مگر ان میں سے کسی نے ہاتھ تک نہ لگایا۔ پیٹ بھر کھانے کے بعد دو سگار چن کر جلاتے اور پھر خادم کی رہبری میں اپنے کمروں تک واپس آتے۔ وردی پوش نے رخصت ہوتے وقت کیو کے ہاتھ میں ایک بند لفافہ دیا۔ سوکھے ساکھے لفنگے نے مہر توڑی لفافہ چاک کیا۔ کاغذ پر ٹائپ کی تحریر تھی۔ دوسرے شہدے نے کیو کے شانوں پر جھک کر ذیل کی عبارت پڑھ لی۔

سردار صاحب کیو اور کارلک صاحب کی خدمت میں تسلیم کے بعد افسوس کے ساتھ ظاہر فرماتے ہیں۔ کہ نصف شب تک اپنے معزز مہمانوں کو نہ دیکھ سکینگے۔ ایک خاص کام میں مصروف ہیں بعض وجوہ ہیں جنہیں وہ خود زبانی بتائینگے۔ مگر ان کی خواہش ہے کہ اس وقت تک آپ حضرات اپنے اپنے کمرے میں آرام فرمائیں۔

کارلک (جھرجھری لیکر) گویا ہم تم یہاں نظر بند ہیں۔ یہ سب پھندے ہیں پھندے' یہاں کی زمین ہمارے پاؤں کے نیچے تھرائی ہے نکلی جاتی ہے۔

کیو کے پچکے ہوئے لانبے گال شیطانی مسکراہٹ کیساتھ

سمٹ کر کمرک بن گئے۔

"کارلک ابھی تک تو کوئی بات خطرے کی نہیں ہے۔
اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو آدھے راستے ہی میں چھیم دہاڑ نہ مچا دیتا"

دونوں کمرہ ۱۲ میں چلے آئے۔ کیو ایک کھڑکی پاس
جا کھڑا ہوا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ مگر صفائی و سناٹا چھایا ہوا تھا۔
سبزہ زار کے منظر پر نگاہیں لوٹی جاتی تھیں۔ کیو چپ چاپ کھڑا
کھڑا سگار سے دھوئیں کے بادل اُڑا رہا تھا۔ کارلک نے اپنے ساتھی
کے جسم میں خفیف سی حرکت دیکھی۔ جا کر پاس کھڑا ہو گیا۔ اور نگاہ
کی سدھان میں نظر دوڑانے لگا۔ (خود بخود) "ایک مسلح چوکیدار۔
واہ بھائی واہ"

کیو۔ دو آدمی تھے۔ ایک بائیں طرف چلا گیا۔ وہ کیا ہے۔

دوسرا چوکیدار سبزہ زار کے اس سرے پر گزرگاہ کی سیڑھیوں
کے پاس دکھائی دیا۔ بغل میں بندوق دبی ہوئی تھی۔ پگڈنڈی
کے قریب پہنچکر رُکا۔ ہاتھ اُٹھایا اور برقی روشنی کی ایک ہلکی سی لکیر
ہتھیلی سے نکلی۔ یہ ایک قسم کا اطلاعی نشان تھا کیونکہ دوسرے
سپاہی نے بھی فوراً جواب دیا۔ اور سبزہ زار کے اس سرے
سے روشنی کی دوسری لکیر اس سرے تک دوڑ گئی۔

کارلک۔ بندوقیں اور برقی فلیتے سردار صاحب اپنے
مہمانوں کی بہت آؤ بھگت کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر کھڑکی سے
دو قدم پیچھے ہٹا۔ بٹن دبایا روشنی ہو گئی۔ (ڈنڈ ملتے ہوئے)
مجھے یہ سب پسند نہیں۔ مکان کیا اچھی خاصی چھاؤنی ہے۔

کیو ایک آرام کرسی کے پاس پہنچا۔ اور اپنے بے گوشت
شانے پر اک ذرا سا بوجھ دیکر لیٹ گیا۔

جسیم کارلک کوزہ پشت طائر صفت جسم کو خموشی سے دیکھتا
رہا۔ یکایک دوسرے کے چہرہ پر ایک فیصلہ خیز رنگ دوڑا
اور کیو یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

آؤ ذرا دیکھیں تو سہی سبزہ زار تک پہنچ پاتے ہیں یا کیا؟

کارلک پیچھے پیچھے باہر نکلا۔ کیو چپکے سے ایک منٹ کے
لئے اپنے کمرے میں ہو لیا۔ اور پھر غلام گردش میں آ کر ملگیا۔
پروفیسر کا ایک ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا۔ اور کارلک کوٹ
کی داہنی جیب میں بے ضرورت ابھار دیکھ کر کھسیاہٹ
سے مسکرا دیا۔

راستہ میں اندھیرا گھپ تھا۔ مگر وہ جانتے تھے۔ کہ
سیڑھیاں اس سرے پر ہیں۔ دونوں شہدے دری بچھی
ہوئی زمین پر شانہ بہ شانہ بڑھتے چلے گئے۔ ابھی دس ہی
بارہ قدم چلے ہونگے کہ ان کے سامنے نالی دیوار پر زیتون کے
محاذ میں ایک ہلکی سی کلک ہوئی۔ اور روشن الفاظ ظاہر ہو گئے۔
"ٹھیر جاؤ" یہ الفاظ پرتو فگن روشنی کے ایک مختصر بیضوی گمند
میں دکھائی دئے۔ صاف ظاہر تھا کہ منزل زیرین کے کسی
خمدار زاویہ سے برقی قمقمے کے ذریعہ روشنی پھینکی گئی ہے جس
کا عکس شیشہ پر پڑ کر دیوار پر کھینچ آیا تھا۔ اطلاعی نخسہ برکی
اچانک شان ظہور نے کارلک کو پا بہ زنجیر کر دیا۔" توبہ۔ توبہ"

کیو ہمت کر کے دو ایک قدم اور بڑھا تھا کہ نشان بدل گیا"۔ "فوراً واپس جاؤ"

مگر کیو کب مانتا ہے۔ ان نشانوں سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کرتا ہوا ہلکے ہلکے قدموں سے بڑھتا ہی گیا۔ زینوں سے ایک کمان کا فاصلہ رہ گیا ہو گا۔ ہس ہس کی سی آواز شروع ہوئی۔ اور چشم زدن میں سیاہ ماشی کرنیں دونوں جانب کی شیشہ دار کھڑکیوں سے نکلنے لگیں۔ یہی لانبی پتلی شعاعیں دست و گریباں ہو کر راستہ میں زنجیر پیچاں بنی جا رہی تھیں۔ جو آنکھوں ہی آنکھوں میں کمر تک اونچی ہو گئیں۔ اور ہر بار چڑ چڑاہٹ کے ساتھ ان کے لطیف بہاؤ میں سبز طوفانی شعلوں کا اہتزازی جذر و مد بڑھتا ہی جاتا تھا۔

"کیو! ہوشیار باش" کارلک نے یہ کہتے ہی کہتے اپنا کنٹرتی ہاتھ بڑھا کر ساتھی کو گھیر لیا۔ اتنی ہی دیر میں دھانی شعلوں نے سارا راستہ پورے طور پر روشن کر دیا تھا۔ اور اب دونوں نے آنکھیں کھول کر دیکھ لیا۔ کہ روشنی کے اُن بلورین ہلالوں سے برآمد ہو رہی ہے۔ جو غلام گردش کے داہنے بائیں شیشوں میں نصب ہیں۔ متجسس درخشاں کرنوں کی مدد سے معلوم ہوا کہ ایک ہی ساخت و وضع کے ہلال راستہ میں اس سرے سے اُس سرے تک برابر کے فاصلہ سے دوڑائے گئے ہیں۔

کارلک۔ کیو! خدا کے لئے دیکھو! اس — اس - اسمیں حرکت ہو چلی ہے۔

رنگین روشنی کی بے آواز زنجیر اب ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دھانی کرنیں ایک ہلال سے دوسرے اور تیسرے ہلال میں جست کرتی چلی جا رہی تھیں۔

زوردار برقیہ قوت نے یہ ہنگامہ خیز قیامت مچا رکھی تھی۔ اس عجیب انتظام سے صرف پر پیچ راہوں کی حفاظت مد نظر تھی۔ جو انسانی مدد سے کہیں زیادہ موثر تھی۔

اب ترقی معکوس کی کیفیت شروع ہوئی۔ رجعت قہقری کے طفیل دونوں کے دونوں مجبور ہو کر قدم بہ قدم پیچھے ہٹتے ہٹتے خوابگاہ تک پھر واپس آ گئے۔ لطف یہ کہ روشنی کا طوفانی سیلاب راہ روکے ہوئے ان کے تعاقب میں سرگرم تھا۔

کیو کی بھرائی ہوئی آواز بے مزہ ہو گئی۔ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے کارلک کی آستین تھام کر کھڑکا دیا۔ اور کچھ بڑبڑا کر دونوں اٹھائی گیرے جھٹ پٹ کیو کے کمرہ میں ہو رہے۔ چوکھٹ سے گزرے ہی تھے کہ خوفناک کرنیں غائب ہو گئیں۔ اور کارلک دروازہ کا سہارا لئے ہوئے تھوڑی دیر تک گرانباری سے ہانپتا رہا۔

"اب تو سمجھ لو، ہم یہاں قیدی ہیں۔ مجھ میں تاب نہیں کہ اس مردود قوت سے چھیڑ چھاڑ کروں۔ جو یہاں برسر حفاظت ہے۔ موج خیز روانی ضرور اتنی زوردار ہو گی کہ انسان نے کرنوں میں قدم رکھا۔ اور خاتمہ ہے۔ تم تو اس طرح اُڑتے پھرو گے جیسے پت جھاڑ کے موسم میں سوکھی ہوئی پتیاں ہوا کے

کے تھپیڑوں سے افتاں وخیزاں بھاگتی پھرتی ہیں"۔

کیو ۔ بھائی یہ سب مکر سہی ۔ مگر مجبوری ہے کیا کیا جائے بجلی پر گولی کام نہیں دیتی۔

"تینچہ نکالکر کوئی مرد ہو تو سامنے آئے۔

گھنٹی ٹن ٹن بجنے لگی ۔ آواز کیو کی مسہری کے سرہانے سے آرہی تھی ۔ دونوں اسی طرف متوجہ ہو گئے ۔ خفیف سی گھرگھراہٹ کے بعد یہ الفاظ سُنائی دئے۔

"سردار صاحب کے مہمان اپنے کمروں میں آرام فرمائیں نکلنا خطرناک ہے"

کیو نہایت پھرتی سے اُچھلا مسہری پر چڑھ کر ایک سوئی دبادی ۔ شیشہ کا ایک چوکھٹا دوسری طرف کھسک گیا ۔ ایک چھوٹی سی کھڑکی ظاہر ہوئی ۔ جس میں نہایت عمدگی سے ربڑ کا دہانہ نصب تھا۔

کیو ۔ یہ ٹیلیفون کا سلسلہ ہے ۔ یہیں سے آواز آئی تھی۔

اب دونوں ادھر اُدھر دیکھنے لگے ۔ ان کے لئے یہ تو کوئی بات ہی نہ تھی ۔ کہ کھڑکی کا شیشہ توڑتے اور جھم سے باہر کود جاتے ۔ مگر معلوم ہوا کہ یہ بھی ناممکن ہے ۔ شیشہ کے اس طرف دوہری دیواروں میں فولادی چادریں اس طرح پیوست تھیں کہ ادھر کھڑکی ٹوٹی اور وہ چادر سامنے آگئی۔

کمرے میں ایک گہری خاموشی چھا گئی ۔ کارلک کی آنکھ کچھ یوں ہی سی جھپکی تھی کہ کیو نے جھُک کر چپکے سے کہا۔

"اُٹھو کچھ ہوا جارہا ہے" کارلک گھبرا کر اُٹھا ۔ کیو نے سارے برقی قمقمے بجھادئے تھے ۔ صرف آتشدان کے پاس ایک رنگین گیند جل رہا تھا ۔ دونوں لفنگے کھڑکی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے ۔ سبزہ زار میں دوہری روشنیاں ظاہر ہوئیں ۔ موٹر کی فوں فاں سُنائی دی جو چشم زدن میں اس طرف جاکر کہیں غائب ہو گئی ۔ دیکھتے ہی دیکھتے دوسری اور تیسری بھی آئی اور دھندلے راستہ سے ہوتی ہوئی عمارت کے زاویہ بیسار تک پُہنچکر غائب ہو گئی۔

کیو ۔ چار ہو چکیں ۔ ایک تمہارے آنے سے پہلے جاچکی ہے ۱۱ بجے کچھ منٹ آئے ہیں۔

دس منٹ کے بعد دو بڑی ہوا گاڑیاں اور آئیں جن کے پردے چھٹے ہوئے تھے ۔ ان کے اوجھل ہوتے ہی داہنے ہاتھ ایک شعلہ خیز روشنی ظاہر ہوئی اور فوراً ہی چھتنار درختوں کے جھرمٹ میں دوسری نمایاں ہوئی ۔ جس کے بعد تیسری روشنی بائیں طرف دکھائی دی ۔ جو کئی بار اونچی نیچی ہو کر غائب ہو گئی۔

کیو ۔ مسلح چوکیدار معلوم ہوتے ہیں ۔ جو ہوا گاڑیوں کے لئے تعینات تھے ۔ اور اب آپس میں برقی روشنی کے ذریعہ گفتگو کر رہے ہیں ۔ یہ جملے ابھی ختم بھی نہ ہوتے تھے کہ کارلک کے لبوں سے ایک تعجب خیز قسم نکل گئی۔

لفنگہ پروفیسر بلی کی طرح مڑ پڑا ۔ کیا دیکھتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے کمرہ کے بیچ میں اپنے ہاتھ جیب میں ڈالے ہوئے

چہرہ پر بشاشت کا رنگ لئے ہوئے ایک شریف آدمی شام کے ریشمی لباس میں کھڑا ہے۔

ہنسمکھ آدمی مسکرایا اور مسکراتے وقت سفید دانتوں کی بجلیاں کوندگئیں۔ لب ملے اور ایک مطمئن و آسان لہجے میں سنائی دیا۔ "میں آپ حضرات کو دیر تک منتظر رکھنے کی معافی چاہتا ہوں۔"

کیو (ساری جان سے کانپ کر) یہی یہی "سردار روق یہی ہیں۔"

سردار روق نے مسکراتے ہوئے دھیمی آواز سے کہا۔

"ہاں" اور میں تمہارے وطن کی خفیہ پولیس کا افسر اعلیٰ بھی ہوں۔"

طالب الہ آبادی

جوانی میں جنگل کی سیر

لکھ گئے اپنی کتابوں میں یہ دانایانِ ہند
آدمی پنجاہ سالہ ہو تو بستی چھوڑ دے

جنگلوں میں جا کے فطرت سے کرے کسبِ سکوں
نوجوانوں کے لئے دنیا پرستی چھوڑ دے

میں یہ کہتا ہوں کہ جنگل ہیں جوانوں کے لئے
جنگلوں میں ہیں جوانی کی بہاریں جوش پر

کیا ضعیف العمر کیف اندوز ہو سکتے ہیں جب
لے کے جائینگے اُمنگوں کا جنازہ دوش پر

محوِ حیرت ہے نظر جنگل میں کیا کیا دیکھئے
بستیوں میں حسن کی ایسی فراوانی کہاں

ہائے یہ خوش رنگ پھولوں کی سرور افزائیاں
گل بدامانی کہاں یہ عیش سامانی کہاں

دل کی دھڑکن آہ کی سوزش نظر کی وحشتیں
ہیں انہیں چیزوں کی طالب کنج کی خاموشیاں

چاند کی کرنوں میں پوشیدہ ہے اُلفت کا پیام
ہوتی ہیں کلیوں سے اکثر عشق کی سرگوشیاں

خشک ہے صحرا بزرگانِ معمر کے لئے
بے مزہ، بے کیف ہے پیری میں سامانِ شباب

جستجوئے حسن ہے افسر تو چل جنگل میں چل
رنگ لائیگا وہاں جوشِ فراوانِ شباب

افسر

بن دیوی

کوشلیا جنگل میں پیدا ہوئی وہیں بڑھی، باپ کی صحبت
پائی۔ ماں سے پیدائش کے چوتھے سال ہی جدا ہو گئی۔ منوہر
کوشلیا کا باپ مدت سے بندھیاچل پربت پر اپنی سنسان
کٹی میں رہتا۔ پھل پھلاری کھا کر بسر کرتا۔ دن رات کا اکثر
حصہ عبادت ریاضت اور ویدوں کے پڑھنے میں صرف ہوتا
کبھی کبھی وہ بھجن گاتا۔ پریم میں ڈوبے ہوئے بھجنوں کی آواز
سننے والوں کو محو کر دیتی۔ ڈالیاں تک جھومنے لگتیں۔ اور
چڑیاں چہچہے کرنا بھول جاتیں۔

کوشلیا جیسے جیسے بڑھتی گئی باپ کے بھجنوں کو یاد
کرتی گئی۔ اس نے وید بھی پڑھے۔ اس کا علم محدود تھا۔ باپ
نے جو کچھ سکھایا وہ جانتی تھی اور جو اس سے سنا اس سے
واقف تھی۔ بستی سے دور بندھیاچل پربت پر کوئی لائبریری
نہ تھی۔ مدرسہ نہ تھا۔ نہ عالموں کا ہجوم تھا نہ طالب علموں کا
مجمع لیکن پھر بھی اس کا علم پکا تھا۔ وہ جو کہتی تھی اس پر یقین
کرتی تھی۔ جو پڑھتی تھی اس پر عمل بھی کرتی تھی تعلیم نے اس
کے دل میں بجائے شکوک کے یقین پیدا کر دیا تھا کسب علم
سے عام طور پر زندگی کا لطف، راحت و سکون سب تشریف
لے جاتا ہے۔ اور ایک قسم کی بے چینی سی طبیعت میں پیدا ہو جاتی
ہے۔ لیکن ان باپ بیٹیوں کے علم نے جس کو بہت لوگ
ضعیف الاعتقادی سے موسوم کریں گے ان کی حالت میں
عجیب لطف و انبساط پیدا کر دیا تھا۔ وہ اپنی موجودہ زندگی
کو بہترین زندگی سمجھتے۔ دولت کے نام سے کانوں پر ہاتھ
دھرتے۔ اور دنیا سے کوئی غرض نہ رکھتے تھے۔

(۲)

کوشلیا جنگل کے خودرو پودوں کے ساتھ بڑھتی غنچوں
کی طرح مسکراتی اور پھولوں کی طرح شگفتہ رہتی چہچہاتی
ہوئی چڑیاں اس کے ساتھ مل کر نغمہ سرائی کرتیں۔ پہاڑوں
کی بل کھاتی ہوئی ندیاں اس کی پریشان زلفوں کی نقل
اتارتیں۔ اور پتھروں کے ٹکڑے اس کے نرم و نازک پیروں
کو بوسے دیتے رہتے۔ شفاف آسمان، غیر محدود فضا اس کے
دل میں صفائی اور روح میں لطافت پیدا کرتے۔ اس کی نگاہ
میں عفت و عصمت کی قدر بڑھتی جاتی۔ اور اس طرح وہ
روز بروز فطرت کے رازوں سے واقف ہوتی جاتی تھی جنگل
اور سبزہ زار اس کا مکان تھا چھوٹی سی صاف کٹی اس کا گہوارہ
اور فطرت اس کی ہمدرد دایہ تھی۔

لیکن اب اس کی آزادی میں یک گونہ فرق آچلا تھا

پہاڑی کے دوسرے سرے پر ایک نوجوان شکاری نے جھونپڑی بنا کر سکونت اختیار کی تھی۔ وہ نہایت جمیل اور مردانہ حسن کا مجسم نمونہ تھا۔ وہ اکثر سادھو کے پاس آتا۔ اسکی باتوں کو غور سے سنتا۔ اور ہر طرح اس کی خدمت کرنے کو تیار رہتا۔ کوشلیا اس سے نہایت آزادانہ طور پر ملنے لگی۔ اور اُسے کسی قسم کی جھجک باقی نہ رہی۔ وہ اس کی جھونپڑی میں آتی جاتی اور گھنٹوں اُس سے بات چیت کرتی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ایک کو دوسرے سے ایک محبت سی ہوگئی نسوانی غیرت اور رعب حسن نے دونوں کی زبانوں پر مہر لگادی تھی اور اظہار محبت کسی کے بس میں نہ تھا۔

(۳)

اس طرح کئی مہینے گذر گئے۔ خاموش محبت کے مزے دونوں کو آتے تھے۔ ایک دوسرے کی ملاقات سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ لیکن ایک دن جب کوشلیا حسب معمول شکاری کی جھونپڑی میں آئی۔ تو شکاری کا رنگ فق تھا۔ اُس نے ... انداز سے کوشلیا سے برتاؤ کیا۔ جیسا ہمیشہ کرتا تھا جب وہ چلنے لگی۔ تو اُس نے کوشلیا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کچھ اس انداز سے اس کی طرف دیکھا کہ کوشلیا کو ہاتھ چھڑانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اُس نے تعجب آمیز حقارت سے شکاری کی طرف دیکھا اور شکاری کی نظریں نیچی ہوگئیں۔

دونوں تھوڑی دیر تک اسی حالت میں رہے پھر اُس نے کوشلیا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور بولا "جاؤ۔ کوشلیا جاؤ خدا حافظ اب شاید تم سے ملنے کا پھر کبھی اتفاق نہ ہوگا۔ کوشلیا نے تعجب سے اس کا سبب دریافت کیا۔ اُس نے مختصر الفاظ میں اپنی تمام کہانی اُسے بتادی۔ اور یہ بھی کہہ دیا۔ کہ میں اپنے دیس کا راجہ ہوں۔ بہت سے دُنیاوی معاملات میرے متعلق ہیں۔ اور میں ان کی وجہ سے اپنی تنہائی کی زندگی کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوں۔ لیکن جدا ہونے سے پہلے تم سے کہدینا چاہتا ہوں۔ کہ میں تم سے ــــ محبت کرتا ہوں۔ اور کبھی سوائے تمہارے اور کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔"

یہ اُس کے آخری الفاظ تھے۔ ابھی اس نے پورے طور پر بات بھی نہ ختم کی تھی کہ اُس پر رقت کا غلبہ ہوا اور اُس نے اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کوشلیا کا بھی دل بھر آیا اور وہ وہاں سے چلی آئی۔ دوسرے دن نوجوان شکاری کا کہیں پتہ نہ تھا۔

(۴)

کوشلیا اکثر شکاری کی جھونپڑی میں بیٹھ کر غم غلط کرتی شکاری کی یاد اکثر اُس کو پریشان کرتی۔ اس کی چال ڈھال گفتگو وغیرہ سب کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رہتا۔ وہ کبھی کبھی پریشان ہو کر اپنے دل سے سوال کرتی کہ اس سے پیشتر تو میری یہ حالت نہ تھی۔ آخر اب کیا ہوگیا ہے ؟"

اِس حالت میں دو ماہ گزر گئے۔ ایک دن صبح کے وقت وہ

حسب معمول شکاری کی جھونپڑی کی طرف چلی جب قریب پہنچی تو اُسے شک ہوا۔ کہ اس میں کوئی شخص موجود ہے۔ محض یہ دیکھنے کے لئے کہ کس شخص نے شکاری کی جھونپڑی پر قبضہ کیا ہے۔ اس نے قدم آگے بڑھایا وہ ابھی جھونپڑی سے کچھ فاصلے پر ہی تھی کہ شکاری دوڑ کر اس کے قریب آگیا۔ دونوں کے چہروں پر اصلی مسرت اور حقیقی خوشی کی سُرخی دوڑ گئی۔ کوشلیا نے پُوچھا۔ "کہو تم کیسے ہو؟ تم تو ہمیشہ کے لئے جُدا ہو کر گئے تھے۔ اب کیسے آئے؟" شکاری نے جواب دیا "ہاں میں گیا تھا لیکن وہاں رہ نہیں سکا۔ میں نے دیکھا کہ میں راج پاٹ کا کام انجام نہیں دے سکتا۔ اس لئے اپنے چھوٹے بھائی کو سب کام سپرد کر کے میں نے دُنیا ترک کر دی ہے۔ اب تمہارے باپ کی خدمت کرونگا۔ اور اپنے دِل کی دیوی کے مندر میں محبت کے پھول چڑھایا کرونگا۔" کوشلیا نے کہا۔ "خیر اگر تم نے دُنیا کھو کر عقبےٰ حاصل کرلی تو کوئی نقصان نہیں۔" شکاری بولا۔ "ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ عقبےٰ کی فکر یا بن کی دیوی ان میں سے کون مجھے یہاں کھینچ لایا ہے؟"

عالی لکھنوی

یادِ وطن

آہ! یہ دشت بلاخیز، یہ ویران منظر — عالم ہُو ہے ہر اک سمت مرے پیش نظر
ایک میدان ہے سنسان۔ نہ سایہ، نہ شجر — خوف کھاتا ہے جسے دیکھ کے قلب مضطر

کچھ بگولے ہیں کہ جو خاک بسر ہیں وہ بھی
دشت برباد ہیں برباد مگر ہیں وہ بھی

ہر طرف خاک اُڑاتی ہُوئی پھرتی ہے ہوا — اپنی بربادیٔ تقدیر پہ ہے نالہ سرا
دشت غربت ہے یہ اللہ! کہ محشر ہے بپا — مُرغِ بسمل، ہے یہاں خاک کا ذرّہ ذرّہ

گرد آلود ہے کیسی یہ فضائے غربت
جس کے نظارہ سے ہوتی ہے نظر کو وحشت

ڈھیر ہیں خاک کے ہر سمت یہاں اور وہاں — عبرت انگیز ہیں بربادیٔ دِل کے ساماں
منزلوں تک نظر آتا نہیں بستی کا نشاں — ہائے تقدیر مجھے کھینچ کے لائی ہے کہاں

بخت برگشتہ کرشمے یہ دکھاتا ہے مجھے

ہر طرف یاس کا عالم نظر آتا ہے مجھے

آہ! وہ صبح وطن اور وہ اس کا جلوا آہ! وہ شامِ وطن اور وہ تاروں کی ضیا

بوئے گل میرے لئے لاتی تھی جس وقت صبا کیف عشرت سے میں بیہوش سا ہو جاتا تھا

یاد ہے یاد ہے اب تک مجھے آرامِ وطن

دل تڑپ جاتا ہے سُنتا ہوں میں جب نامِ وطن

آہ! وہ جلسۂ احباب، وہ سامانِ طرب رنج و غم سے دلِ غمگیں کو نہ تھا کچھ مطلب

اب وہی میں ہوں مگر گردشِ قسمت کے سبب جلوۂ صبحِ وطن ہے، نہ وہ شام اور نہ شب

ہاں بس اک میں ہوں یہاں یا دلِ دیوانہ ہے

عشرتِ دوش کا لب پر مرے افسانہ ہے

ہائے کوئی بھی یہاں پر مرا غمخوار نہیں عالمِ یاس میں جو دل کو مرے دے تسکیں

آسماں برسرِ بیداد ہے، دشمن ہے زمیں رُوح اس قالبِ خاکی سے نکل جائے کہیں

اک مصیبت سی مصیبت ہے پناہم بخدا

کتنی تاریک ہے میرے لئے غربت کی فضا

ایک مُدّت سے ہوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا کاش یہ تارے ہی بن جائیں مرے راہ نما

رحم فرمائے مرے حال پہ جنگل کی ہوا دشتِ غربت سے نکلنے کا بتا دے رستا

اور تو کوئی بن آتی نہیں تدبیر مجھے

لیچلے سوئے وطن گردشِ تقدیر مجھے

کاش پوری ہو کہیں حسرتِ دیدارِ وطن دِل کو گرمائے مرے گرمیِ بازارِ وطن

پھُول ہے میرے لئے رازؔ ہر اک خارِ وطن سچ تو یہ ہے میں ازل سے ہوں پرستارِ وطن

مایۂ زیست ہے، سرمایۂ عشرت ہے مرا

ساری دُنیا سے مجھے اپنا وطن ہے پیارا

رازؔ چاندپوری

کلامِ گرامی

(از ملک الشعراء حضرت مولانا غلام قادر گرامی مدظلہ)

در کنشت و کعبہ مارا اتّفاق افتادہ بود
اتفاقِ این و آں داغِ نفاق افتادہ بود

دوش در میخانہ از وارفتگیہایم مپرس
مست بودم شیشۂ عقلم بطاق افتادہ بود

طاق را از جفت نشناسیم ما سودائیاں
ابروانش را جفت برخواندیم طاق افتادہ بود

یار آمد بر سرِ بالینِ من لیکن چہ سود
درمیانِ جسم و جانِ من فراق افتادہ بود

طفلِ اشکم گر ز چشم افتاد ہیچش برمسنج
ناخلف بود ست پنداری کہ عاق افتادہ بود

کو شبِ مہتاب و آں آویزشِ ناز و نیاز
ساعدش در گردنم دستم بساق افتادہ بود

دی گرامی در قمارِ عشق خود را باختن بُرد
مدعی در گیر و دارِ جفت و طاق افتادہ بود

چاندنی رات

چاندنی رات میں ستارے ہیں	گویا مدھم سے کچھ شرارے ہیں
دامنِ چرخ پاک بادل سے	کالے اندوہناک بادل سے
اِک خموشی فضا پہ چھائی ہے	چاند نے چاندنی بچھائی ہے
سایہ افگن سکوت چار طرف	پیڑ ہیں یا ہیں بھوت چار طرف
تختۂ گل پہ خوب ہے جوبن	اِک طلسماتِ نور ہے گلشن
لالہ اپنا ہُنر دکھاتا ہے	داغ دیتا ہے داغ کھاتا ہے
غنچہ آمادۂ تبسّم ہے	اِک مئے حُسن سے بھرا خم ہے
گدگدی کر رہی ہے بادِ نسیم	اُڑتی جاتی ہے تنگ آ کے شمیم
گامزن ہے نسیم چار طرف	ہے پریشاں شمیم چار طرف
پتّیاں تالیاں بجاتی ہیں	کلیاں خوش ہو کے مُسکراتی ہیں
پھُول ہنستے ہیں کھلکھلاتے ہیں	زیرِ لب غنچے مُسکراتے ہیں
ساتھ ہی ساتھ روتے جاتے ہیں	منہ کو شبنم سے دھوتے جاتے ہیں
حال کے عیش پر نظر بھی ہے	اور انجام کی خبر بھی ہے
حسنِ فطرت شباب پر ہے یہاں	مست بلبل گلاب پر ہے یہاں
چشم نظارہ وا کرے کوئی	دِل کو حسن آشنا کرے کوئی

سردار محمد اختر

گورا

مصنفہ رابندر ناتھ ٹیگور .... مترجمہ عبدالستار خاں

باب (۱۸) اٹھارہواں

وہ راستہ بھر انندامائی کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ اُس نے کبھی انندامائی کے مشورہ کو غیر دفعی سمجھ کر نظرانداز نہ کیا تھا۔ رات بھر اس کی طبیعت پر ایک بوجھ سا رہا۔

دوسرے دن سویرے اس کا قلب اس خیال سے پرسکون تھا۔ کہ اُس نے گورا کی دوستی قائم رکھنے کے لئے پوری قیمت ادا کی تھی۔ ششی مکھی سے شادی کرنے کے لئے اپنی رضامندی کا اظہار کر کے اُس نے زندگی بھر کے لئے ایک رشتہ مستحکم میں اپنے کو منسلک کر لیا تھا جس کی وجہ سے دوسری بندشوں کے ڈھیلا کرنے کا اُسے حق حاصل ہو گیا تھا۔ اس شادی کا تعلق ایسا تعلق تھا جس سے گورا کا یہ شبہ کہ وہ برھمو سماجی خاندان میں محض ترغیب و تحریص میں آکر قدیم ہندو مذہب سے منحرف ہو جائیگا اور شادی کر لیگا۔ دُور ہونے کی کافی ضمانت تھا۔ چنانچہ وہ اب پریش بابو کے یہاں بلا کھٹکے آنے جانے لگا۔ اس کے لئے ان لوگوں سے گھل مل جانا جن سے ان کو محبت ہوتی کچھ مشکل نہ تھا۔ گورا کا دغدغہ ٹلتے ہی وہ پریش کے یہاں ایسا بے تکلف ہو گیا کہ گویا وہ اُسی خاندان کا ایک فرد ہے۔

پہلے پہلے للیتا کو جبتک یہ شبہ رہا کہ سوچترا کا دلی رجحان اس کی طرف ہے۔ وہ غیر مانوس اور برہم سی رہی لیکن جونہی اس پر یہ صاف طور پر منکشف ہو گیا کہ سوچترا کا میلان بی نئے کی طرف نہیں تو وہ بغیر کسی کاوش کے اس فیصلہ پر قائم ہو گئی۔ کہ بی نئے بابو نہایت اچھے آدمی ہیں۔

ہرن بھی اپنی معاندانہ روش پر قائم نہ رہ سکا۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس پر زور دیتا ہے۔ کہ بی نئے میں خوش اخلاقی کا کچھ نہ کچھ مذاق ضرور ہے۔ لیکن گورا اس سے بالکل مبرا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ ہرن سے کبھی مباحثہ نہ کرتا تھا۔ اور یہ عین سوچترا کے منشاء کے مطابق تھا کہ بی نئے اور ہرن کا مباحثہ نہ ہو۔ چنانچہ بی نئے چاء کی میز پر کبھی خلل سکون کا باعث نہ ہوا۔

لیکن جب ہرن نہ ہوتا تو سوچترا بی نئے کو جرأت دلاتی کہ وہ معاشرتی معاملات پر اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ اُس کی متجسسانہ خواہش کہ بی نئے اور گورا

جیسے ذی علم حضرات اپنے ملک کی قدیم توہم پرستی کے کیوں اتنے موید ہیں۔ اس کا باعث تھی۔ اگر اس کی ملاقات ان دونوں سے نہ ہوتی تو وہ یقیناً اس خیال اور خواہش کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی اور اسے قابلِ غور نہ سمجھتی۔ غرضیکہ جب کبھی اُسے موقعہ ملتا وہ گفتگو کا رُخ ہمیشہ گورا کی طرزِ زندگی کی طرف پھیر کر اپنے اعتراضات اور سوالوں کے ذریعہ اس مسئلہ کو واضح ترین کر کے سمجھنے کی کوشش کرتی تھی۔ پریش بابو کا خیال تھا کہ ہر مذہب اور ہر فرقہ کے خیالات سے واقف ہونا سوچترا کے لئے رواداری کا ایک عمدہ سبق ہے۔ اس لئے وہ اس قسم کے مباحثہ کو کبھی نہیں روکتے تھے۔ ان کو اس کا مطلق خوف نہ تھا کہ اس کے اعتقادات میں کسی قسم کا فرق پڑیگا۔

ایک دن سوچترا نے پوچھا۔ "اچھا یہ تو فرمایئے کہ گورموہن بابو فی الحقیقت ذات پات کے مسئلہ میں یقین رکھتے ہیں یا ان کے جوش حب الوطنی کی یہ ایک مبالغہ آمیز نمائش ہے؟"

بی نئے۔ "کیا کسی بالاخانے کے لئے آپ سیڑھیوں کا ہونا ضروری نہیں سمجھتیں؟ ان سیڑھیوں میں ایک سیڑھی ہمیشہ دوسری سے بلند ہوا کرتی ہے۔"

سوچترا۔ "مجھ کو اس کا اعتراف محض اس وجہ سے ہے کہ بالاخانے پر چڑھنے کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ لیکن سطح زمین پر اس کے فرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

بی نئے۔ "ہاں آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ ہماری جماعت کی مثال بھی تو زینے ہی کی ہے۔ سیڑھی کا جو مقصد ہے وہ یہاں بھی ہے۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے انسان حقیقی سے اپنی زندگی کے مقصد اعلےٰ تک پہنچ سکتا ہے۔ البتہ دُنیا یا جماعت ہی کو ہم اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے تو ہم کو اس کی ضرورت نہ ہوتی کہ ہم ان امتیازات اور تفریق کو قائم رکھیں۔ اس وقت تو یورپین قوموں کی طرح معاشری وسعت ہی ہمارا مطمح نظر ہوتا۔"

سوچترا۔ "معاف کیجئے آپ نے جو کچھ کہا ہے میں بخوبی سمجھ نہ سکی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جس غرض سے ذات پات کی بُنیاد پڑی۔ وہ کس حد تک پوری ہُوئی اور اس میں کتنی کامیابی ہُوئی۔"

بی نئے۔ "اس دُنیا میں اس کی کامیابی کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ ہندوستان نے تمدنی مسئلہ کا ایک اہم حل تخصیص ذات کی شکل میں کیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں آجتک وہ دُنیا میں قائم ہے۔ یُورپ اس کو ابتک تشفی بخش شکل میں حل نہ کر سکا۔ وہاں جو شور و شغب مچا ہُوا ہے وہ آپ دیکھتی ہی ہیں۔ بنی نوع انسان کو اپنی آخری کامیابی حاصل کرنے کے لئے اُسے ہندوستان کے بتاتے ہوئے حل کی طرف رجوع کرنا پڑیگا۔"

سوچترا۔ "اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں یہ پوچھتی ہوں کہ آپ گورموہن بابو کی رائے کا اظہار کر رہے ہیں یا آپ کو

بھی اس میں یقین ہے۔"

بی نتے۔ "سچ تو یہ ہے کہ مجھ میں تیقن کی وہ قوت نہیں جو گورا میں ہے۔ جب میں اپنی جماعت کی خرابیاں یا تخصیص ذات کی برائیاں دیکھتا ہوں۔ تو وہ اپنے شکوک بغیر ظاہر کئے نہیں رہ سکتا۔ لیکن گورموہن مجھے یہی کہتے ہیں کہ شک کسی بڑی چیز کو تفصیل میں دیکھنے کا نام ہے۔۔۔۔ سوکھی ہوئی شاخوں اور خزاں رسیدہ پتوں کو درخت کی فطرت سمجھنا تعجیل ذہنی کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ یہی کہتے ہیں۔ میں زوال رسیدہ ٹہنیوں کی توصیف میں اپنا وقت ضائع کرنے کے لئے نہیں کہتا میں تو یہ کہتا ہوں کہ اس درخت کو دیکھئے جس کی وہ ٹہنی ہے اور اس کے اصل مقصد کے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔"

سوچترا۔ "سوکھی شاخوں کو چھوڑئے۔ لیکن درخت کا پھل لیجئے۔ اس تخصیص ذات سے کیا نتیجے برآمد ہوتے ہیں۔"

بی نتے۔ "آپ جسے تخصیص ذات کا نتیجہ کہتے ہیں۔ وہ تخصیص ذات کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ ہمارے حالات کے مجموعہ کا نتیجہ ہے۔ جب آپ ہلتے ہوتے دانت سے کسی چیز کو کاٹتے ہیں تو اس سے درد پیدا ہوتا ہے۔ وہ دانت کا قصور نہیں بلکہ ہلنے کا باعث ہے۔ مختلف وجوہات سے ہماری جماعت میں مختلف قسم کی کمزوریاں اور خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ہم نے اس خیال کو جسے ہندوستان نے پیش کیا تھا کامیاب بنانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ہم نے اُسے توڑ مروڑ کر رکھ دیا۔

یہی وجہ ہے کہ گورا ہمیں یہی تلقین کیا کرتا ہے کہ تندرست رہو اور طاقتور بنو۔"

سوچترا۔ "ہاں! تو آپ بھی برہمن کو افضل سمجھتے ہیں؟ تو کیا برہمن کے پیر کی خاک سے انسان پاک ہو جاتا ہے۔ اور آپکو اس کا یقین ہے؟"

بی نتے۔ "دُنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا ہم احترام کرتے ہیں۔ اور وہ ہماری ہی بنائی ہوئی ہیں۔ اگر ہم حقیقی معنوں میں برہمن پیدا کرسکیں تو وہ سوسائٹی کے لئے کیا کم مفید ہو سکتے ہیں؟ ہم کو خداترس آدمی کی ضرورت ہے۔ ایسے شخص کی ضرورت ہے جو عام انسانوں سے بالاتر ہو ہم کو ایسا آدمی مل سکتا ہے اگر ہم ہی کو تمنا نہ ہو۔ اور اگر ہم کو اس کی خواہش ہو۔ اگر ہم کو ان کی تلاش محض احمقوں کی طرح ہے تو ہمیں محض انہی ناپاک الوجود لوگوں پر جو پشت زمین پر بار گراں کی طرح ہیں اور جن میں ہر طرح کی برائیاں موجود ہیں۔ اکتفا کرنا چاہیئے۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی معاش کا ذریعہ ہم نے یہ قرار دے رکھا ہے کہ ان کے قدموں کی خاک ہماری پیشانیوں پر مل جائے اور مل جاتی ہے۔"

سوچترا۔ "آپ نے جس قسم کے برہمنوں کی تعریف کی ہے وہ کہیں ہیں بھی؟ یا کبھی ان کا وجود تھا بھی؟"

بی نتے۔ "ہیں اور ضرور ہیں۔ وہ ہندوستان کے بطون میں اسی طرح پنہاں ہیں جس طرح گٹھلی میں درخت۔ دوسرے

مُلکوں کو ولنگٹن جیسے جنرلوں، نیوٹن جیسے سائنسدانوں اور
راتھ سِلا جیسے دولتمندوں کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے مُلک
کو صرف برہمن کی ضرورت ہے۔ برہمن وہ ہے جو یہ جانتا بھی
نہیں کہ خوف وہراس کیا چیز ہے۔ جس کو حرص وطمع سے نفرت
ہے جس کے سامنے مصیبت، مصیبت نہیں جسے کسی نقصان
کا خوف نہیں ـــــ جو فنا فی اللہ ہو چکا ہے۔ ہندوستان کو
ایسے برہمن کی ضرورت ہے جو ثابت قدم ہو۔ جس کی طبیعت
پرسکون اور دل روادار ہو۔ ہندوستان کو ایسا برہمن ملتے
ہی وہ آزاد ہو جائیگا۔ ہمارے سر بادشاہوں کے آگے نہیں
جھکتے بلکہ ظالموں کے سامنے خم ہوتے ہیں۔ ہمارا خوف ہماری
گردنیں جھکا دیتا ہے۔ ہم اپنے آز وطمع کے جال میں پھنسے
ہوئے ہیں۔ ہم اپنی حماقتوں کے غلام ہیں۔ کاش ہمیں وہ حقیقی
برہمن اپنے طرزِ عمل سے ہمارے خوف وہراس۔ ہماری طمع و
لالچ اور ہماری ناعاقبت اندیشی اور بیوقوفی سے بچالے۔ ہم
نہیں چاہتے کہ وہ ہمارے لئے لڑے۔ ہماری یہ خواہش نہیں
ہے کہ وہ ہمارے لئے کوئی تجارت کرے اور نہ یہ تمنا ہے کہ
وہ ہمارے لئے کسی قسم کے دنیاوی فواید حاصل کرے۔"

یہانتک تو پریش بابو خاموش سُنتے رہے لیکن اب اُنہوں
نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے کہا۔ "میں یہ نہیں کہہ سکتا۔
کہ ہندوستان کو جانتا ہوں۔ میں فی الحقیقت یہ بھی نہیں جانتا
کہ ہندوستان کو کس چیز کی ضرورت ہے۔ اور اُسے وہ چیز کبھی
میسر ہوئی بھی یا نہیں لیکن یہ تو فرمایئے کہ گزرا ہوا زمانہ واپس
بھی ہو سکتا ہے؟ ہماری کوششیں انہی چیزوں کے حاصل
کرنے میں صرف ہونی چاہئیں۔ جن کا میسر ہونا موجودہ زمانہ
میں ممکنات سے ہے۔ ہمیں گزشتہ زمانہ کی طرف ہاتھ اُٹھا کر
لاحاصل اپیل کرنے سے کیا مِل سکتا ہے؟"

بی نتے۔ "آپ ہی کی طرح میرا بھی خیال ہے اور میں نے
کئی مرتبہ اعتراض بھی کیا ہے لیکن گورا نے یہی جواب دیا۔
کیا ہم عہدِ عتیق کو عتیق کہہ کر اس کی اہمیت زائل کر سکتے ہیں؟
عہدِ عتیق کا اور ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ حق ہمیشہ حق ہے
کبھی زائل نہیں ہو سکتا۔"

سوچترا۔ "آپ جس طرح بیان فرماتے ہیں عوام اس طرح
نہیں کہتے۔ پھر ہم کس طرح یقین کر لیں کہ آپ سارے مُلک
کی ترجمانی کر رہے ہیں؟"

بی نتے۔ "مہربانی فرما کر ایسا خیال نہ کیجئے۔ کہ گورا ان معمولی
لوگوں میں ہے جو اپنے کو ہندو کہہ کر فخر کرتے ہیں۔ وہ ہندو مذہب
کی باطنی خوبیوں پر نظر رکھتے ہوئے سچّے ہندو کی زندگی کو
عیش وعشرت کا گہوارہ نہیں سمجھتے۔ جو چھوتے ہی مرجھا جاتے
اور ہاتھ لگاتے ہی جس کا خاتمہ ہو جاتے۔"

سوچترا (مسکرا کر) "مجھ کو تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر قسم کی
چھوت چھات سے بچتے ہیں۔"

بی نتے۔ "اُن کی اس احتیاط میں بھی عجیب بات ہے اگر

آپ ان سے پوچھیں تو فوراً یہی کہینگے کہ ہاں مجھ کو اس کے جزئیات پر بھی یقین ہے۔ چھوت چھات سے ذات جا سکتی ہے۔ غیر معقول غذا سے پاکی زائل ہو سکتی ہے۔ یہ سب حرف بحرف صحیح ہے۔ میں یہ جانتا ہوں کہ یہ سب ان کی ہٹ دھرمی ہے جتنی اُن کی باتیں پوچ معلوم ہونگی اتنا ہی وہ اس پر اصرار کرینگے۔ ان کا اصرار ہے کہ ہر چیز اور ہر مسئلہ پر بلا امتیاز سختی سے پابندی کی جائے۔ اگر ہم چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہ کرینگے تو عوام اہم مسائل سے پہلو تہی کرنے لگینگے۔ اور مخالف اسے اپنی فتح خیال کرنے لگینگے۔ چنانچہ وہ کبھی کسی قسم کی پہلو تہی روا نہیں رکھتے۔"

پریش بابو۔ "برھمو سماج میں بھی بہت سے ایسے ہیں جو بلا امتیاز قدیم ہندو دھرم سے ہر قسم کا تعلق قطع کرنا پسند کرتے تاکہ کوئی یہ نہ سمجھ سکے۔ کہ وہ کبھی ہندوؤں کے بُرے رسم و رواج سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ ان لوگونکو فطری زندگی بسر کرنے میں بڑی دقت پڑتی ہے۔ کیونکہ یا تو وہ مبالغہ کرتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں۔ کہ 'حق' کوئی ایسی کمزور شئے ہے۔ جسکی حفاظت قوت یا فریب سے کی جا سکتی ہے۔ متعصب اور ہٹ دھرم وہی ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ "حق یا صداقت کا دارومدار مجھ پر ہی ہے۔ اور میرا دارومدار حق یا صداقت پر نہیں"۔ میں تو ہمیشہ خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ میں ایک عاجز بندہ صداقت یا حقانیت' کا پر خلوص عبادت گزار ہوں خواہ وہ برھمو سماجیوں کا مندر ہو یا ہندوؤں کا شوالہ ——— کوئی بھی ظاہرا سبب میری عبادت میں دخل انداز نہ ہو۔"

اتنا کہنے بعد پریش بابو خاموش ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس کا قلب سکون کی انتہائی گہرائیوں میں غوطہ زن ہے۔ اُن کی ان باتوں سے گفتگو کا رنگ ہی پلٹ گیا ——— الفاظ کی وجہ نہ تھی بلکہ پریش بابو کی پُر سکون زندگی اور طمانیت قلب کا اثر تھا۔ سوچترا اور للیتا کے چہرے جوش مسرت سے سُرخ ہو گئے۔ بی نئے بھی کچھ کہنا نہ چاہتا تھا۔ خاموش ہو گیا۔ اب اُسے معلوم ہونے لگا۔ کہ اس معاملہ میں گورا کتنی زیادتی پر ہے اقوال اور افعال کی سادگی جو صادق میں ہونی چاہئے۔ اس کا گورا کی شخصیت میں کہیں نام و نشان بھی نہیں۔ پریش بابو کی گفتگو سے یہ بات آپ ہی آپ اس کے دل میں کھٹکنے لگی۔

رات کو جب سوچترا اپنے بستر پر لیٹی تو للیتا آکر اس کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ سوچترا سمجھ گئی کہ للیتا کے دل میں کوئی نہ کوئی بات کھٹک رہی ہے۔ اور وہ اس کے ادھیڑ بن میں مبتلا ہے۔ چنانچہ اُس نے خود ہی یہ کہہ کر سلسلہ جنبانی شروع کی۔ "میں بی نئے بابو کو بہت پسند کرتی ہوں۔"

للیتا۔ "جی ہاں اس لئے کہ وہ ہمیشہ گورموہن بابو کی تعریف کیا کرتے ہیں۔"

سوچترا اشارہ تو سمجھ گئی لیکن بالکل انجان بنکر نہایت سادگی سے کہا۔ "جی ہاں! میں گورموہن بابو کے خیالات

بی نتّے کے مُنہ سے سُننا بہت پسند کرتی ہوں۔ ان کا بیان کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ گویا گورموہن ہی بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔"

للیتا۔ مجھ کو بالکل دلچسپی نہیں ہوتی۔ بلکہ غصّہ آ جاتا ہے۔"

سوچترا (حیرت سے) "آخر کیوں؟"

للیتا۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ رات دن جب دیکھو گورا گورا کی رٹن ہے۔ ہم نے مانا کہ ان کے دوست کی زبردست شخصیت ہے لیکن آخر وہ بھی تو انسان ہیں"

سوچترا نے ہنسکر کہا۔ یہ تو سچ ہے لیکن تم کو کیوں اتنی اُلجھن ہوتی ہے؟"

للیتا" بی نتّے بابو پہ گورا کا اتنا اثر پڑ گیا ہے کہ اب انہیں کوئی موقع نہیں۔ کہ اپنی شخصیت کا اظہار کر سکیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی جھینگر نے مکھی نگل لی ہو۔ ان میں کوئی ایسا نہیں جس کو سراہا جائے۔"

للیتا کی تیزی سے سوچترا کو خاص لطف آ رہا تھا۔ اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ للیتا کہنے لگی۔ "ابا جان آپ چاہیں ہنسیں یا مذاق اڑائیں۔ لیکن میں یہ کہے دیتی ہوں کہ اگر کوئی مجھ کو اس طرح اپنے زیر اثر رکھنا چاہے تو میں ایک دن بھی اس طرح رہنا پسند نہ کرونگی۔ آپ اپنی ہی مثال لے لیجئے۔ لوگ جو چاہیں کہیں۔ آپ مجھ کو کبھی ایک قدم پیچھے نہیں رکھنا چاہتیں۔ اور آپ کی ایسی عادت بھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ کو آپ سے اتنی محبت ہے۔ بات تو یہ ہے کہ آپ نے یہ سبق ابّا جان سے لیا ہے۔ اُن کا خاصہ ہے کہ وہ ہر شخص کو موقع دیتے ہیں۔"

اس خاندان میں انہی دونوں لڑکیوں کو پریش بابو سے بے انتہا محبت تھی۔ ان کا نام آتے ہی وہ پھولے نہ سماتی تھیں۔

سوچترا۔ ابّا جان کی برابری بھلا کون کر سکتا ہے۔ تم چاہے جو کہو۔ بی نتّے بابو کا اندازِ گفتگو غضب کا ہے۔"

للیتا" حیرت تو اس لئے ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ خیال ان کا نہیں ہوتا۔ اگر وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تو ان کی باتوں میں سادگی ہوتی۔ اور یہ نہ معلوم ہوتا کہ وہ بنا بنا کر بول رہے ہیں۔ میں سادگی ہی زیادہ پسند کرتی ہوں"

سوچترا" بولا۔ تم اتنی خفا کیوں ہوتی ہو۔ گورموہن بابو کے خیالات ہی اُن کے خیالات ہو گئے ہیں"

للیتا" اگر ایسی بات ہے تو اور بھی غضب ہے۔ کیا خُدا نے ہمیں اسی لئے عقل دی ہے۔ کہ ہم دوسروں کے خیالات بیان کرتے پھریں۔ اور مُنہ اس لئے دیا ہے کہ دوسروں کی باتوں کی نقل کریں۔ مجھ کو تو ایسی نقالی پسند نہیں ہے۔"

سوچترا" آخر تم یہ کیوں نہیں سمجھ سکتیں کہ بی نتّے بابو کو گورموہن بابو سے اتنی محبت ہے۔ کہ اُن کا خیال بھی اپنے دوست ہی کے خیال کے مطابق ہو گیا ہے۔"

للیتا" جی نہیں۔ معاملہ یہ نہیں ہے۔ بی نتّے بابو کی عادت

پڑ گئی ہے کہ گورا بابو جو کچھ کہتے ہیں۔ وہ اس پر بلا غور و تامل کے عمل کرنے لگتے ہیں۔ یہ محبت نہیں ہے غلامی ہے۔ وہ خود یہ سمجھ کر کہ مجھ میں اور میرے دوست میں اختلاف رائے نہیں ہے۔ مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ جب محبت ہوتی ہے تو بغیر متحد الخیال ہوئے بھی محبت قائم رہ سکتی ہے۔ یہ نوجوان جھکو مسخر ہو جاتا ہے۔ وہ صاف صاف یہ کیوں نہیں تسلیم کر لیتے کہ وہ محض محبت کی وجہ سے گور موہن بابو کی رائے کو تسلیم کر لیا کرتے ہیں؟ کیا آپا جان جو میں کہتی ہوں درست نہیں ہے؟"

سوچترا نے اس پر کبھی اس نکتہ نگاہ سے غور نہ کیا تھا۔ اُس کو تو گورا کے متعلق ایک خاص قسم کا متجسسانہ تفحص تھا۔ اور اس نے بی نئے کے سمجھنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی للیتا تو بغیر ٹھیک جواب دئے اُس نے کہا " مان لو کہ تمہارا خیال صحیح ہے۔ تو پھر کیا؟"

للیتا" میں تو اس گرہ کو کھول کر بی نئے بابو کو اسکے دوست سے آزاد کرانا پسند کرتی ہوں"

سوچترا" پھر آپ کیوں نہیں کرتیں"

للیتا" میری اکیلی کوشش سے تو کچھ نہ ہوگا۔ اگر تم بھی کوشش کرو تو ضرور کامیابی ہو جائیگی"

سوچترا یہ خوب جانتی تھی کہ اس کا اثر بی نئے پر بہت ہے۔ مگر اس نے بات کو مذاق میں ٹالنا چاہا۔ للیتا کہنے لگی " میں ان کے لئے یہی چاہتی ہوں کہ وہ آپ کے زیر اثر ہو کر گور موہن بابو سے آزادی حاصل کریں۔ اُن کے بجائے اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو برہمو سماجیوں کی لڑکیوں کی حالت پر ایک ڈراما لکھ ڈالتا لیکن ان کا دل ان باتوں سے آزاد ہے وہ آپا جان کی کتنی عزت کرتے ہیں۔ ہم کو یہ کوشش کرنا چاہئے کہ بی نئے کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں مدد دیں۔ مجھ سے یہ تو برداشت نہیں ہو سکتا کہ وہ محض گور موہن بابو کے خیالات کی تبلیغ کے لئے زندہ رہیں"

اتنے میں ستیش " باجی باجی" چلاتا ہوا آیا۔ اور کہنے لگا۔ کہ مجھ کو بی نئے بابو آج سرکس دکھانے لے گئے تھے۔ حالانکہ رات بہت ہو چکی تھی۔ تو بھی وہ اپنی خوشی کو بغیر ظاہر کئے نہ رہ سکا جب وہ بتا چکا کہ اس نے کیا کیا دیکھا تھا تو کہا۔" میں بی نئے کو یہاں لے آیا تھا۔ کہ آج رات کو یہیں رہیں لیکن وہ پھاٹک کے اندر آکر لوٹ گئے۔ انہوں نے کل آنے کا وعدہ کیا ہے۔ میں نے اُن سے کہا ہے۔ کہ کل سب کو تماشہ دکھانے لے چلنا"

للیتا۔ انہوں نے کیا جواب دیا"

ستیش۔ انہوں نے کہا کہ لڑکیاں شیر کو دیکھ کر ڈر جائینگی میں تو ذرا بھی نہ ڈرا" یہ کہہ کر وہ اپنا سینہ فخریہ تان کر بیٹھ گیا

للیتا۔ خوب میں آپ کے دوست بی نئے بابو کی ہمت جانتی ہوں۔ آپا جان انہیں ہم لوگوں کو سرکس دکھانے ساتھ لے جانا پڑے گا"

ستیش۔ کل تیسرے پہر ایک کھیل ہوگا۔

للیتا۔ "یہ اور بھی اچھا ہُوا کل ہم ضرور چلینگے۔"

دوسرے دن بی نتے کے آتے ہی للیتا نے کہا "آپ بہت اچھے وقت آتے چلئے چلیں۔"

بی نتے (حیرت سے) "کہاں؟"

للیتا۔ "سرکس دیکھنے اور کہاں؟"

ہیں سرکس دیکھنے؟ دن کو ہزاروں آدمیوں کے سامنے شامیانے میں عورتوں کو لیکر سرکس میں جانا۔ بی نتے بہت متحیر ہُوا۔

"مَیں سمجھتی ہوں کہ شاید گورموہن بابو ناراض ہوں گے کیوں بی نتے بابو یہی نا"

للیتا کے اس سوال سے بی نتے کے کان کھڑے ہوگئے للیتا نے کہا یہ تو فرمایئے "عورتوں کو سرکس میں لے جانے کے متعلق گورموہن بابو کی کیا رائے ہے۔"

بی نتے۔ "اُن کی رائے تو یہ ہے کہ عورتوں کو لے جانا چاہیئے۔"

للیتا۔ "اچھا تو آپ اُن کی رائے واضح طور پر سمجھائیے مَیں آپا جان کو بھی بُلائے لاتی ہوں وہ بھی سُن لیں۔"

بی نتے سمجھ گیا اور ہنسنے لگا۔ للیتا نے کہا۔ "بی نتے بابو آپ کیوں ہنستے ہیں۔ کل آپ نے ستیش سے نہیں کہا تھا کہ لڑکیاں شیر کو دیکھ کر ڈر جائینگی۔ اچھا یہ تو فرمایئے۔ کہ آپ بھی کسی سے ڈرتے ہیں یا نہیں؟"

اس کے بعد بی نتے چپ چاپ لڑکیوں کے ساتھ ہولیا۔ اور راستہ بھر وہ دل میں سوچتا رہا کہ اس سے اور گورا سے کس قسم کا تعلق ہے۔ للیتا اور پریش بابو کی دوسری لڑکیاں اس تعلق کو کس نگاہ سے دیکھتی ہیں۔

دوسرے دن جب بی نتے سے ملاقات ہوئی تو للیتا نے دریافت کیا۔ "کیا آپ نے گورموہن بابو سے ہم لوگوں کو سرکس لے جانے کا ذکر کیا تھا۔"

اس سوال سے بی نتے کے دل پر چوٹ لگی اور اُس نے جواب دیا "نہیں مَیں نے ابتک اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔"

(باقی پھر)

مجبورِ نظّارہ

جب تلک جیتے رہے نیرنگیاں دیکھا کئے
گردشِ ایّام دورِ آسماں دیکھا کئے

بیخودی میں خوب سیرِ لامکاں دیکھا کئے
بے نشاں ہوکر نشانِ بے نشاں دیکھا کئے

آشیاں باندھا مگر آسودگی کا ذکر کیا
کس طرح گرتی ہیں اس پر بجلیاں دیکھا کئے

ہم اسیرانِ قفس کی ہائے رے مجبوریاں
سامنے آنکھوں کے جلتا آشیاں دیکھا کئے

اختر

طوفانی کشتی

دریا چڑھاؤ پر ہے
اور بوجھ ناؤ پر ہے
پہنائے آب سارا ہے کوچ کا اشارا
ہوش آزما نظارا
موجوں کے منہ میں کف ہے اِک جوش ہر طرف ہے
مرگ آفریں ہے دھارا اور دُور ہے کنارا
کوئی نہیں سہارا

تیغ آزما ہیں لہریں
تیغیں ہیں یا ہیں لہریں
توبہ ہوا کی تیزی موجِ فنا کی تیزی
ہے کس بلا کی تیزی
تدبیرِ ناخُدا کیا چپّو کا آسرا کیا
گرداب پڑ رہے ہیں کشتی سے لڑ رہے ہیں
تختے اُکھڑ رہے ہیں

نغموں کا جوش خاموش
سب ناؤ نوش خاموش

ہے یہ برات کس کی نوشاہ اور براتی
لوٹے ہیں لیکے ڈولی
مایوس ہیں نگاہیں رقصاں لبوں پر آہیں
ڈولی میں حور پیکر کیا کانپتی ہے تھرتھر
لیکن ہے مہر لب پر

دُولہا کے سر پہ سہرا
لیکن اُداس چہرا
عشرت کی آرزو تھی اُلفت کی جستجو تھی
امید رُو برو تھی
یہ انقلاب کیا ہے آغوشِ مرگ وا ہے
افسوس اے الٰہی! کیا آگئی تباہی!!
قسمت کی کم نگاہی!!!

دِل سرد ہو رہے ہیں
رُخ زرد ہو رہے ہیں
اس محشرِ بلا میں اس تیغۂ فنا میں
اس سیلِ باد پا میں
سب اہل یاس گُم ہیں ہوش و حواس گُم ہیں
کچھ محو ہیں دُعا میں کچھ نالہ و بکا میں
کچھ شکوۂ خُدا میں

بیٹھی ہے ایک بیوہ
ہے صبر جس کا شیوہ
دِل ہاتھ سے دبائے بچّہ گلے لگائے
تیرِ امید کھائے
یہ باپ کی نشانی سرمایۂ جوانی
اِک دِن جوان ہوگا امّاں کا مان ہوگا
حق مہربان ہوگا

اِک نوجواں بد اختر
بھاگا ہے گھر سے لڑکر
چھوڑے تھے باپ ماں بھی بیوی بھی اور مکاں بھی
اب چھوڑتا ہے جاں بھی
اے کاش میں نہ آتا! اے کاش لوٹ جاتا!!
اے طبع خود سر افسوس! اے "طپش" تجھ پر افسوس!!
افسوس یکسر افسوس!!!

یہ دیو زاد موجیں
یہ بد نہاد موجیں
آیا پھر ایک ریلا کشتی بنی ہے تنکا
بس ہو چلا صفایا
تدبیر رو رہی ہے تقدیر سو رہی ہے

ملاح تیر نکلے دریا میں پیر نکلے
افسوس۔ غیر نکلے

طوفانِ غم بپا ہے
فریاد کی صدا ہے
ہے کون جو سنبھالے کشتی تیرے حوالے
یا رب تو ہی بچالے
اے نوحؑ کے کھویّا لگ جائے پار نیّا
بندوں کا تو ندا ہے اور تو ہی نا خدا ہے
تیرا ہی آسرا ہے

ابوالاثر حفیظ جالندھری

خلوت میں جلوت

کہا مَیں نے کہ اے دل تیرے ہاتھوں مرغِ بسمل ہوں
کہا دل نے کہ احسنؔ مَیں بھی اِک جزوِ عنادل ہوں

ملا ہے مجھ کو وہ آرام گردابِ حوادث میں
کہ اب تک ناخدا! نا آشنائے خاکِ ساحل ہوں

زمانے سے الگ رہتا ہوں مست اپنے خیالوں میں
بھری محفل میں خلوت ہوں مگر خلوت میں محفل ہوں

غبارِ قیس دشتِ نجد کے رہرو سے کہتا ہے
سمجھ کر! سوچکر!! مَیں آج تک ناکامِ منزل ہوں

میری گمراہیوں میں شان ہے اک رہنمائی کی
رہِ منزل دکھاتا ہوں اگر ناکامِ منزل ہوں

گنہگار اِک طرف زاہد بھی آخر تجھ پہ مرتا ہے
عروسِ مرگ تیرے حسنِ روز افزوں کا قائل ہوں

میری قسمت میں احسنؔ لکھ دیا کیا لکھنے والے نے
مٹا جاتا ہوں اس دُنیا سے گویا نقشِ باطل ہوں

سیّد اصغر علی احسنؔ

تبصرہ بہ اشاعات جدیدہ

کلام شاد - سیّد علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی، جو اساتذہ عصر میں ایک امتیازی درجہ رکھتے ہیں - اور جن کا کلام وقتاً فوقتاً ہزار داستان کے صفحات پر جلوہ آرا ہوا کیا ہے۔ کسی خاص تعارف کے محتاج نہیں - اُردو میں آپ متقدمین کی یادگار ہیں۔

حال ہی میں آپ کا جو مجموعہ کلام (حصہ اوّل) شائع ہوا ہے وہ ہماری نظر سے گزرا - شروع میں مصنّف کی عکسی تصویر اور سیّد سلیمان ندوی ایڈیٹر معارف کا لکھا ہوا مختصر مقدمہ ہے۔ مولنا مقدمہ میں درست تحریر فرماتے ہیں :-

"شصت سالہ عہدِ سخنوری میں اس سخنور نے کیا کیا خونِ جگر نہ پیا ہوگا - کہ شعرِ سخن کے یہ لعل و عقیق اس نے اُگلے اور کیا کیا آنسو نہ بہاتے ہونگے - جب اس فضل و کمال کے دُر و گوہر ہاتھ آسکے - اسوقت تک جو سرمایۂ سخن منتشر اوراق کی صورت میں ہے - اس کا اندازہ ایک لاکھ سے کم نہیں اور اس میں قصاید - مثنویاں - غزلیات - قطعے - رباعیات اور افراد سب کچھ ہیں - ایسے وسیع سرمایہ کو پیش نظر رکھ کر یہ پونے دو سو صفحے کا دیوان غزلیات دیکھ کر افسوس آتا ہے کہ جواہر کے بیشمار انبار میں سے صرف یہ چند دانے قدردانان شاد کے دامن شوق میں آسکے"

بلا ریب جناب شاد کے قدیمانہ رنگِ تغزل میں اُستادانہ اور اجتہادانہ شان ہے - آپ کا کلام حُسن و عشق کے بازاری جذبات سے بالکل پاک ہے - زبان شُستہ اور عام فہم جس کو سہل الممتنع کہہ سکتے ہیں - اگرچہ کہیں متروک الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں - مثلاً ؎

پڑا کے لحد میں ہاں دلا چین کر اب تو حشر تلک

اب کے جفا کی سختیاں تونے بہت اُٹھائیاں

دلا اور اُٹھائیاں - اب متروک ہو چکے ہیں اور شعرائے اُردو ان سے پرہیز کرتے ہیں - اسی طرح اور الفاظ بھی ہیں - مگر ان کی تعداد بہت کم ہے - اور ان سے شاعر کے کمال میں کوئی زیادہ نقص نہیں پیدا ہوتا۔

اُردو دواوین میں یہ کتاب ایک عمدہ اضافہ ہے تشنگانِ سخن اس بادۂ کہن سے اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں - حجم ۱۶۰ صفحات تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ قسم دوم کا کاغذ خاصا، لکھائی چھپائی نفیس قیمت قسم اوّل تین روپے قسم دوم دو روپے آٹھ آنے (علاوہ محصول) انجمن ترقیِ اُردو پٹنہ سے طلب فرمائیے۔

آئینہ جذبات - ہمارے ملک میں تقلید کا شوق

حد سے زیادہ ہے۔ جو چیز مقبول خاص و عام ہو جاتی ہے۔ یار لوگ اسی کی نقل اتارنے لگتے ہیں۔ جناب اقبال کا شکوہ شائع ہوا تو ہزاروں شعراء نے حشرات الارض کی طرح شکر شکوے لکھنے اور شائع کرنے شروع کر دئے تھے یہ اہل کمال کا منہ چڑھانا نہیں تو اور کیا ہے۔

پچھلے دنوں جناب جوش ملیح آبادی کی کتاب روح ادب شائع ہوئی تھی۔ جو از بس پسند کی گئی تھی۔ اب اس کتاب کو سامنے رکھ کر ہمارے ایک پنجابی نوجوان سی سردار پورن سنگھ صاحب محتاج نے ایک چھوٹی سی کتاب "آئینہ جذبات" کے نام سے شائع کی ہے۔ اس کتاب کی تقطیع بہت چھوٹی ہے یعنی ۱۸×۲۲/۱۶ ہے اور حجم ۱۰۶ صفحات۔

ہم اس کتاب پر تبصرہ نہ کرتے اگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے نومشق شعراء شہرت کی ہوس میں جادۂ ترقی سے بھٹک رہے ہیں۔ اور منزلِ مقصود سے بُعد اختیار کر رہے ہیں۔

تصنیف و تالیف کی شاہراہ بہت دشوار گزار ہے۔ اور اس میں بڑے بڑے شہسوار پھونک پھونک کر قدم رکھنے پر مجبور ہیں۔ اس لئے چاہیئے کہ ہر مبتدی شہرت کا خیال کرنے سے پہلے پورے غور و فکر سے اپنے خیالات پر قابو حاصل کرنا سیکھے۔ کانا اور لے دوڑی کا مصداق نہ بنے۔

آئینہ جذبات کے پہلے صفحہ پر مصنف کے ساتھ ان کے اُستاد حضرت عزیز لکھنوی کا نام بھی ہے جسے دیکھ کر امید ہوتی ہے کہ کتاب مطالعہ کے قابل ہوگی۔

دوسرا صفحہ خالی۔ تیسرے صفحے پر دو شعر کا ایک قطعہ چوتھا خالی پانچویں پر ایک رباعی۔ چھٹا خالی۔ ساتویں پر ایک لفظ "مقدمہ" دسواں صفحہ بھی کورا گیا۔ بارھویں سے مصنف کے مختصر خاندانی حالات شروع ہو کر تئیسویں صفحے پر ختم ہوتے ہیں جن سے مصنف کی شاعری اور کتاب کی خصوصیات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ اور ہمارے خیال میں اتنے صفحے فضول ضائع کئے گئے ہیں۔ چوبیسواں صفحہ پھر خالی۔ ۲۵ سے ۲۶ تک کتاب پر جناب عزیز لکھنوی کی رائے ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔ کہ شاعری قدرت کا ایک گرانبہا تحفہ ہے۔ جو ہر شخص کے مقدر میں نہیں۔

اور مصنف کے متعلق فرماتے ہیں۔ کہ اگر مشق سخن جاری رہی تو بہت ترقی کریں گے۔ اور آپ کا کلام سبق آموز ہوگا۔

جناب عزیز کی تحریر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ آپ نے اس مجموعہ کو بہت اصرار کے بعد زیورِ اصلاح سے مزین فرمایا ہے۔ آخر میں آپ امید کرتے ہیں کہ ارباب نظر اس مختصر مجموعے کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

تیسواں صفحہ کورا ہے اور ۳۱ سے ۳۶ تک نثر کی چند سطریں ہیں جن میں ٹیگور کی کورانہ تقلید کی گئی ہے۔ جسے اردو کی تخریب کہا جا سکتا ہے۔ چھتیسواں اور سینتیسواں صفحہ دونوں خالی۔ ۳۸ سے ۵۵ تک اسی قسم کی نثر پریشان اس

میں بھی کئی صفحات نہ جانے کونسا اثر ڈالنے کے لئے خالی
چھوڑ دیتے گئے ہیں۔ ۵۶ صفحہ پھر خالی۔ ستاون سے
انسٹھ تک غزلیات ہیں۔ جن کی تعداد تیرہ سے زیادہ نہیں
غزلیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ابھی بالکل
بتدی ہے۔ اور خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے پر اچھی
طرح قادر نہیں۔

حضرت جوش کا انداز اڑانے کی کوشش تو کی گئی
مگر صرف کوہسار۔ آبشار۔ صبح شام۔ ساز۔ مضراب
کے الفاظ ہی سے مناظرِ فطرت کا نقشہ نہیں کھنچ سکتا
صفحہ ۷۰ بھی خالی ہے۔ ۷۱ پر صرف یہ لکھا ہے۔
"اس حصے میں وہ پھول ہیں جو چاندنی راتوں کے سناٹے
میں چنے گئے ہیں"

۷۲ پھر خالی ۷۳ سے ۸۹ تک کھلے نثر جن میں
بو باس بہت کم ہے۔

اسی حصہ میں حکمت کے عنوان سے چند سطور ہیں
پہلی حکمت ہی سے تمام حکمتوں کا پتہ چلتا ہے۔

"میری خوشی اسی میں ہے کہ ہر مہینے نئے چاند کو
دوبارہ لب بام دیکھ کر بیہوش ہو جاتا ہوں۔ اور
جب ہوش میں آتا ہوں تو وہ عالم ہوتا ہے کہ
پہروں بات نہیں کر سکتا۔ خدا ہی جانتا ہے
یہ کیا حکمت ہے"

. . . .

بیشک اس حکمت کو خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا
اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شاعر ہر مضمون میں کسی نہ کسی بات
پر بیہوش ہو جاتا ہے تو ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ آخر اس
کمزوری کو طشت از بام کرنے میں ہمارے نوجوان کی کیا
حکمت ہے۔ ۹۰ سے ۱۰۵ تک جواہر ریزے۔ دو دو پھول
موتی' ان عنوانات کے تحت اشعار ہیں۔ جن میں جناب جوش
کے خزانۂ شاعری تک پہنچنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔
معدودے چند شعر اچھے کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن جناب عزیز
کی اصلاح کا خیال کرتے ہوئے ان کی قدر بھی گھٹ
جاتی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ جناب محتاج نے اس تصنیف
سے ادبی دنیا پر کوئی احسان نہیں کیا۔ ان کو چاہئے تھا کہ ابھی
کچھ عرصہ مشق کرتے تاکہ کلام میں پختگی اور زبان پر قدرت
حاصل ہو جاتی۔ کمال کے بغیر شہرت کا خیال خیال خام ہے

درجِ ادب کے بعد اس کا نقش ثانی اس سے
بہتر ہونا چاہئے تھا نہ کہ بدتر۔ ہمیں تعجب ہے
کہ حضرت عزیز ایسے استاد نے جناب محتاج کو یہ مشورہ کیوں نہ
دیا کہ وہ ابھی شائع کرنے کا شوق نہ فرمائیں لکھائی چھپائی اچھی نہیں
کاغذ بہت ہلکا۔

قیمت کتاب پر درج نہیں۔ دفتر آئینہ جذبات۔

گجرات سے طلب کیجئے۔

صابون سازی ۔ اس نام کی ایک کتاب ریویو کے لئے آئی ہے۔ جے ڈی نرولہ صاحب پرنسپل ہاویلڈ کالج آف بزنس نے اسے انگریزی میں لکھا تھا۔ جس کا پروفیسر رتن سنگھ صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔ اور صابون سازی کے عام فہم طریق اُردو زبان میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کاغذ، لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ قیمت درج نہیں۔ اے۔ ایس رتن اینڈ کو راولپنڈی سے طلب کیجئے۔

موریشس اور اسلام ۔ یہ کتاب جزیرہ موریشس کے مسلمانوں کی ایک مختصر تاریخ ہے۔ جسے مولانا قاری حکیم عبداللہ رشید صاحب نواب رشید مکی امام پورٹ لوئس موریشس نے اُردو زبان میں ترتیب دیا ہے۔

کتاب بہت خوشنما ہے ٹائیٹل پر جزیرہ موریشس کا نقشہ اور کتاب کے اندر جا بجا مصنف پورٹ لوئس جامع مسجد لوئس اور ایک پارک کی عکسی تصویریں ہیں۔ اس کتاب سے مسلمانان موریشس کی علمی اور اقتصادی حالت اور ان کی تعلیمی و تبلیغی ضروریات پر روشنی پڑتی ہے۔

ہم نے اس کتاب کو صوری اور معنوی خوبیوں سے لبریز پایا ہے۔ مولانا موصوف مسلمانانِ موریشس کو دنیائے اسلام سے متعارف کرانے اور ان کے حالات کی طرف توجہ دلانے کے لئے قابلِ مبارکباد ہیں۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگی۔ اور اہل الرائے مسلمان حضرات حالات موریشس کو غور سے ملاحظہ فرمائینگے۔ کتاب اعلیحضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کے نام نامی سے منسوب کی گئی ہے۔ ہم اس انتساب پر صاد کرتے ہیں۔ قیمت صرف دس آنے (۱۰؍) ملنے کا پتہ۔ ابناء مولوی محمد ابن غلام رسول سورتی کتب فروش بھنڈی بازار پوسٹ ۹ بمبئی

انتخاب میر فخر متقدمین سید محمد تقی میر کے نام نامی سے کون واقف نہیں۔ زبانِ اُردو پر اس شاعر بے بدل نے وہ احسان کیا ہے جس کو فراموش کرنا ناممکن ہے۔

ضرورت تھی کہ اس خدائے سخن کا کلام منتخب موجودہ دور کے مذاق کے مطابق شائع کیا جائے۔ بحمداللہ کہ اس کمی کو مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ نے پورا کر دیا ہے۔ اور انتخابِ میر کے نام سے ایک خوبصورت مجلد کتاب محبانِ اُردو کے سامنے پیش کر دی ہے۔ کتاب کے شروع میں میر مرحوم کے مختصر حالاتِ زندگی جمع کئے گئے ہیں۔

انتخاب خوب ہے۔ اور خوش مذاقی سے کیا گیا ہے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ خرید لینا چاہیئے۔

کاغذ اعلےٰ سفید۔ کتابت طباعت باصرہ افروز۔

قیمت صرف عمر

جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ سے طلب کریں